جدید اردو غزل میں سماجی اور سیاسی مسائل

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

شعبہ اردو گیان اُپاسک کالج، پربھنی
سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ، یونیورسٹی ناندیڑ

از

پٹھان ناظمہ ضمیر احمد خان

زیر نگرانی

ڈاکٹر سلیم محی الدین
صدر شعبہ اردو شیواجی کالج، پربھنی
گیان اپاسک کالج، پربھنی

پیش لفظ

غزل ایسی صنف سخن ہے جس نے ہمیشہ زمانے کا ساتھ دیا زمانے کے نشیب وفراز کی ترجمانی کی حالات کی انقلابی تبدیلی کے زیراثر اپنے آپ میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔اسی کیفیت نے غزل کوجدیدمیلانات سے آشنا کیا۔غزل انقلاب کا موزوں ترین نام ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ محبوبیت اورمقبولیت کے تاج سے سرفراز ہوئی۔غزل اردوشاعری کی سب سے مقبول ترین صنف سخن ہے جونہ صرف اردو بلکہ پوری ہندوستانی شاعری کی آبرو ہے۔اردو میں جب سے تنقید کا باقاعدہ آغاز ہوااس وقت سے لے کراب تک غزل طرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بنتی رہی لیکن اس کی مقبولیت کم ہونے کے بجائے برابر بڑھتی رہی اور یہ ثابت ہوگیا کہ غزل میں زمانے کے ساتھ ساتھ بدلنے ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہرطرح کے مضمون کوادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔اوراب تو یہ بات روزروشن کی طرح عیاں ہیکہ اس صنف سخن کوکبھی زوال نہ ہوگا۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہےاس کا مطلب عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔اورآج غزل میں ہرطرح کے مضمون کو پیش کرنے کی گنجائش موجود ہے۔یوں تو غزل پرکئی مقالے لکھے جاچکے ہیں اور بہت سارے تحقیقی کام بھی ہوچکے ہیں۔لیکن جدیداردوغزل میں سماجی اور سیاسی مسائل پرتحقیقی کام نہیں ہوسکا۔اسی احساس کے مدنظرغزل کے موضوعات میں بطورخاص سیاسی وسماجی مسائل پرتحقیقی مقالہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہےاس مقالے کومیں نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں اردوغزل کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔غزل کی ابتداءقصیدے کی تشبیب سے ہوئی۔قدیم عربی شاعری میں قصیدے کے شروع میں اشعار معشوق کی یاد میں موسم بہار کی آمد وغیرہ پر لکھے جاتے تھے۔ان اشعار کوتشبیب کہتے ہیں۔آہستہ آہستہ تشبیب کے مضامین پرمبنی اشعار قصیدے کے علاوہ آزادانہ بھی کہے جانے لگےاوراس طرح غزل وجود میں آئی۔

فارسی میں دھیرے دھیرے غزل نے کافی مقبولیت حاصل کرلی اورجدید حالات سے متاثر ہوتے ہوئے اپنا مزاج بھی قدیم اندازسخن سے پرے شروع کردیا۔فلسفہ عرفانیات کوغزل میں شامل کیا گیا۔سماجی اور سیاسی پس منظر کی جھلک بھی غزلوں میں نظرآنے لگی۔اسی دور کا مشہور شاعرعراقی گذراہےاس نےغزل کودربار سے نکال کرعوام تک پہنچایااورزندگی کی بھرپورترجمانی غزل میں کی۔

ایران کے زیر اثر غزل کی صنف ہندوستان میں بھی جڑ پکڑ چکی تھی اور ایسی ترقی کی کہ فارسی اور اردو دونوں میں اس نے وہ مقام اور مرتبہ حاصل کرلیا جو کسی اور صنف کو نہ ہوا۔

غزل کی مقبولیت اپنی جگہ پر مسلم ہے اردو شاعری کی ابتداء ہی غزل سے ہوئی اور اردو میں تنقید کے ابتدائی نقوش بھی غزل سے ہی متعلق نظر آتے ہیں۔ جس سے یہ صنف آگ کی طرح لوگوں میں پھیلتی رہی اس پر لغزیشیں کرنے والے افراد کی کثرت ؛بھی سامنے آئی۔ غزل کی اہمیت و مقبولیت کو قبول نہ کرنے والے افراد نے غزل کی مخالفت شروع کردی چونکہ یہ مخالفت غلط بنیادوں پر قائم تھی اسی لیے غزل کی صنف پر اس کا زرا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ اس کی مخالفت نے غزل کو کچھ اور بھی استوار کیا اس میں کچھ اور زندگی پیدا کی۔

دوسرے باب میں غزل کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ وہ غزل جو کسی انقلابی انداز سے بدلتے ہوئے ماحول کی صحیح ترجمانی میں اپنے آپ کو بدل دے جدید غزل کہلاتی ہے۔ یہ انداز غزل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب احساس، جذبات، حالات کے زیر اثر سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی زندگی اور ادب کا کارواں نئی راہوں پر گامزن ہوجاتا ہے۔ یہ صورت حال اردو غزل میں ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد پیدا ہوئی اس واقعے نے ہماری سماجی سیاسی، معاشی تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر بڑے گہرے نقوش مرتب کئے۔ غزل کو جدت سے ہم کنار کرنے ان حالات کا بڑا دخل ہے جو انگریزوں کے زیر اثر پید ہوئے۔

انیسویں صدی کے وسط میں مغلیہ سلطنت کی شیرازہ بکھرتا نظر آرہا ہے۔ مغلوں کی حکومت صرف قلعوں تک رہ چکی تھی۔ قلعہ کے باہر انگریزوں کا رعب تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی بطور خاص مسلمان افراتفری کا شکار ہورہے تھے۔ غدر مسلمانوں کی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کی ناکام کوشش تھی۔ غدر کے بعد بھی کافی عرصہ تک مسلمان دور بدحالی اور پریشان روزگاری میں مبتلا رہے ۔ جبر واستحصال کا کچھ ایسا حال تھا کہ کسی قوم کو سکون کی سانس لینے یا انگریزوں کے خلاف سر اٹھانے کا خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انگریزون کی شکایتوں کا ازالہ کرنے ''سرسید تحریک'' کی پیدائش ہوئی ۔ سرسید اور ان کے رفقا نے جو ادبی اور سماجی خدمات انجام دیں وہ ایسی غیر فانی ہیکہ ادب کی تاریخ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ جسمیں حالؔی شبلی، نذیر احمد، وقار الملک وغیرہ نے ادب میں جس سرخروی سے کام کیا وہ قابل فراموش نہیں۔ سرسید کے طرز ادب کی نئی تعمیر ہوئی شعر و نظم دونوں پر فکر و فن، معنی

ومفہوم، اصلاحات و روایات پر ایسا اثر مرتب کیا کہ دنیائے ادب ہمشہ آپکی خدمت کی مرہون منت رہیگی۔

حالی کے بعد قدیم جدید غزل کے تصورات میں بڑا فرق آچکا تھا۔عہد غزل اپنے سماجی و سیاسی پس منظر کی پیداوار رہی ہے لیکن حالی سے قبل وہ صورت ہمارے سامنے نہیں آئی۔غزل کے بڑھتے سماجی تصور نے عشق میں جذباتیت کو کم کیا۔

بیسویں صدی میں غزل نے ایک بار پھر اپنا رنگ بدلنا شروع کیا۔حالی نے شعر میں مقصدیت کو دور اول بتایا اور یہ مقصدیت اخلاق کے تابع ہونی ضروری تھی۔افادی غزل کے بعد اسی کا انتہا پسندانہ اور سیاسی روپ ترقی پسند غزل بن کے ابھرا۔ترقی پسند غزلوں میں ذاتی احساسات و جذبات کی کمی ہے۔موزوں اور طرز بیان میں یکسانیت کی وجہ سے ترقی پسند غزل جلد ہی رسمی ہوگئی۔شعراء نے غزل کے موضوعات اور تصورات کو بے پناہ وسعت دی مگر ساتھ ہی ساتھ انہوں نے زباں و بیاں کے مروجہ سانچے کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی یہی اس تحریک کی خامی رہی۔

باب سوم میں جدید اردو غزل میں سماجی و سیاسی مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا۔دور حاضر میں مکر و فریب ریاکاری، مصلحت پسندی خودغرضی نے سچائی خلوص بےغرضی اور دیانت داری کا گلا گھونٹ دیا ہے۔غیبت اور خوشامد کرنے والوں کی کثرت ہے۔ایک زمانہ تھا کہ لوگ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنے کے بجائے اس کی کمیوں کو بیان کرتے تھے تاکہ اس کی اصلاح ہو سکے۔آج انسان کے دل میں کچھ ہوتا ہو اور زبان پر کچھ۔لوگ سامنے تعریف اور خوشامد کرتے ہیں غیر موجودگی میں برائیاں بیان کرتے ہیں۔اس بات کو سلیم محی الدین نے اس خوبی سے بیان کیا ہے۔

مجھ کو اپنا ہی لگتا تھا وہ بھی
جب میرے قد سے اونچا نہیں تھا

ترقی و تبدیلی کے نام پر ہم اس دنیا میں پہنچ گئے جہاں بے باکانہ جرائم بےحجابانہ سیاست کے غلام ہیں۔بے رحم فرقہ واریت مذہبی تقدس کی بیڑیوں میں دفتروں میں بدعنوانی اور رشوت ستانی علم و انصاف کے اداروں پر بے اعتمادی، جھوٹ، دھوکہ، مکر و فریب اور پورے سماج میں لاقانونیت اور ان سب پر حاوی تشدد۔تشدد اور تشدد۔اس بارودی ماحول میں انسانیت روپوش۔انسانی قدریں پارہ پارہ۔شرافت اخلاق وفاداری قصہ پارینہ۔اصول آدرش داستانوی خیالات اور بھی بہت کچھ

جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپ صرف واقف نہیں بلکہ براہ راست جھیل رہے ہیں۔بھوگ رہے ہیں۔رئیس منظر نے کیا خوب کہا ہے۔

کون نکلے گھر سے باہر کون دیکھے کیا ہوا
میرا ہم سایہ ہے خود میری طرح سہا ہوا

سماجی مسائل میں خیر پر شر،حق پر باطل کا قبضہ،دھوکہ فریب آج کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔سچائی،سادگی،ایمانداری،حقیقت پسندی سب دم توڑ رہے ہیں۔اس پر اختصادی بد حالی۔اخلاقی پامالی۔مستقبل کی فکرمندی۔قتل وغارت گری۔علاحیدگی پسندی اور دیگر سماجی اتھل پتھل مثلاً صنعت ریل پیل،نئی طبقاتی کشمکش یا طبقوں کی نئی تقسیم ان سب نے مل کر نئے سماج کی جو تصویر ابھاری ہے وہ بڑی عجیب وغریب ہے جس میں بس یہ تو صاف ہیکہ صحت مند صالح قدروں کا زوال ہو چکا ہے۔انسانیت مر رہی ہے۔انسانی قدروں کی پامالی اس دور کا مقدر بن چکی ہے باقی سب دھندلا دھندلا ہے اس واضح اور غیر واضح سماج کی ملی جلی تصویریوں کا عکس آپ کو اردو غزل میں صاف جھلکتا دکھائی دے گا۔

اب تو اس شہر میں جینے کا مزہ ہی نہ رہا
اب تو قاتل بھی کرائے کے ہیں اور سازش ہی نہیں نظام الدین

لہو لہان سا منظر دکھائی دیتا ہے
یہ عصر نو مجھے محشر دکھائی دیتا ہے اختر مدھوپوری

پہلے یوں لگتا تھا جل رہی ہے جیسے میری روح
اب تو عادت بن گئی جلتے ہوئے گھر دیکھنا مہتاب پرتاب گڑھی

اس طرح جدید شعراء نے فرقہ وارانہ فسادات۔دہشت انگیزی کے واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی مسائل اور مختلف ذہنی کیفیات ایک ایسا تجربہ جس نے اس دور کے شاعروں کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے اور ان کا ردعمل بڑی شدت اور بے ساختگی سے شعری اظہار کے سانچوں میں ڈھل گیا ہے۔و

جدید غزلوں میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں عصری زندگی میں پیوست ظلم وستم ، ناانصافی ، ریاکاری ، جھوٹ اور افراتفری کے خلاف ردعمل کا اظہار ہو جن میں پروٹیسٹ کی زیریں لہریں محسوس کی جاسکتی ہیں ۔ساتھ ہی عصری زندگی پریشانیوں ، الجھنوں ، بےبسی اور بے یقینی اور اس قسم کے ماحول میں عام آدمیوں کی بےبسی اور بےنوائی کا اظہار بھی جدید غزل میں اکثر بڑی شدت سے ہوا ہے۔اوران مسائل کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔

کیا لوگ ہیں چراغ بجھانے پر ہیں بضد
اور یہ بھی چاہتے ہیں یہاں روشنی رہے اقبال اشہر

باب چہارم میں جدید غزل کے نمائندہ شاعروں کا سماجی وسیاسی مطالعہ پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔غزل کی نشاۃ ثانیہ اوراس کی رگوں میں فکراور خیال کا خون دوڑانے والے شعراء کے کلام میں سیاسی وسماجی شعور کی جو جھلکیاں موجود ہیں انہیں کا مطالعہ کی گیا ہے ۔غزل میں صرف حسن و جمال ، نازوادا ، رنگ رلیاں ،جنس وجسم اور خارجی پہلو تک محدود نہیں ۔اس میں گہرے تجربے احساس یا حیات و کائنات کے شعور کی کارفرمائی ہے۔تمام جدید شعراء نے زندگی کے رنگارنگ تجربات ،تنوع داخلیت کوسموکر غزل کے دائرے میں پوری کائنات کوسمیٹ لیا ہے۔

آج جدید غزل میں زندگی اپنے مسائل اوراپنے رنگ رنگی کے ساتھ موجود ہے جدید غزل کے شعراء کا سماجی اور سیاسی مطالعہ کے لیے ناظر کاظمی ،شکیب جلالی ،خلیل الرحمٰن ،شاذ تمکنت ،مظفر حنفی ،شہریار ،محمد علوی ، ندافاضلی ،حسن نعیم ،مخمورسعید ،شہاب جعفری ،عرفان صدیقی ، پروی شاکر ،احمد فراز وغیرہ کے کلام پر مختصراً تبصرہ کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں جدید اردوغزل کے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔جدید دور میں کرب والم ، دردوستم ،تنہائی ، وویرانی ، لاچاری وبےبسی ،حبس وگھٹن کے باوجود نئی غزل میں بےچینی و نے کیفی کی لہر تو ہے لیکن احتجاج کی گونج نہیں احتجاج تو درکنار مزاحمت بھی نہیں ۔اور حد یہ کہ غزل کے اسلوب میں وہ روایتی شکوہ شکایت بھی نہیں جس سے اردوغزل بھری پڑی ہے۔معشوق کے جوروستم کی شکایت شیخ وناصح کی شکایت ،آسمان کی چشم شکایت ،فریب تقدیر کی شکایت ،نئی غزل سے رواتی شکایت کا چلن کیا روٹھا مزاحمت کا لہجہ روٹھ گیا۔جب کہ ایسے حالات میں نئی غزل کا مزاحمتی لہجہ اس کا

ایک اہم لہجہ ہونا چاہیئے۔

اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ملک میں بیسویں صدی کے کئی گمبھیر مسائل یا توختم ہو چکے تھے یا روپ بدل چکے تھے۔صارفیت نے پوری دنیا کوسمیٹ بھی دیااورایک بازار بنادیا جس کے نتیجے میں سیاسی سماجی اور ثقافتی قدریں انحطاط پذیز ہوئیں۔نئے مسائل سر ابھارنے لگے اسی کے ساتھ انتشارذات کی کرب ناکیاں،احساس تنہائی،بے گانگی بے چہرگی،لاچاری،اجنبیت،خوف،اکتاہٹ ،مایوسی ،اضطراب وغیرہ میں شدت آتی گئی لیکن اس احساسات کا مریضانہ اظہارختم ہوا۔اظہار میں ابہام اور علامت پسندی کا غلبہ کم سے کم ہوتا گیا۔نئے حالات میں نئے موضوعات بھی سامنے آئے اوراظہار میں بھی رچا ہوا کھلا پن آیا۔حالات کے جبر کا رونا رونے اور سسکنے اورمحروم ومجہول بننے سے اجتناب کرتے ہوئے فعالیت اورضاربیت کی طرف قدم بڑھایا۔منحرف لہجہ،غصہ،احتجاج،زیرناک طنز،بغاوت اورسفاکیت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ترفع ذہنی کےطور پر رومانیت اور ماضی کی بازیافت اس میں شامل ہے۔

مقالے کا آخری حصہ اختتامیہ ہےجس میں مذکورہ پانچ ابواب کامختصراً جائزہ لیا گیااورغزل کی ترقی کےامکانات وضع کیے گئے ہیں۔

اس مقالے کی تیاری میں میرے والدین کی نیک تمنائیں اور دعائیں میرے لیے راستہ ہموارکرتی چلی گئی۔میرے والدمرحوم کی دلی خواہش تھی کہ خاندان میں کوئی ڈاکٹر بنے انہی کی دعاؤں کا ثمر ہے کہ میں یہ مقالہ مکمل کرسکی ہوں ۔اللہ انہیں جنت الفردوس میں بلند درجات عطا کرے۔(امین)

میرے خاوندذ کا پٹھان مجھے ہمیشہ تحریک دلاتے رہے ہروقت میرے ساتھ رہے کتابیں جمع کرنے سے لیکر مواد کے مرتب کرنے میں آپ کا تعاون رہا۔میں آپ کی کاوشوں کی ہمیشہ ممنون ومشکور رہوں گی۔میرے بہنوئی ڈاکٹرعبدالرحمٰن خان ندوی صاحب کی میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے مواد کی ترتیب اورآرائش لفظ پر ہمیشہ میری مدد فرمائی اور ہرلمحہ مقالے کی تیاری میں تعاون کیا۔

محمد فاروق قادری صاحب معتمد فیضان ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائیٹی کی بھی میں ممنون و مشکور ہوں کہ ان کی رہنمائی ہمیشہ حاصل ہوئی۔میری بہنیں انوری خانم اورقمر خانم نے بھی مجھے قدم قدم پرحوصلہ بخشا۔

میرے گائیڈ سلیم محی الدین صاحب کا میں دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آ پکی رفیق اور شفیق ہدایات ذرین مشوروں اور گاہے بگاہے کتابیں پہنچانے کا اہم کا کیا۔ ہمت بندھائی اور کام کرنے کی ترغیب دلائی ورنہ شاید یہ کام میرے لیے ناممکن سا تھا۔ آپ کی رہنمائی کے لیے۔

میں پیادہ پا مسافر تو چراغ راہ منزل
میرا کام بھول جانا تیری شان راہ نمائی

صادق سروری صاحب ،عتبان قادری ،سلمان مجاہد،توصیف احمد،رئیس قادری۔ میری سہلیاں صفیہ، سلمٰی، ہاجرہ، کوثر، نگار، راعنا، رضوانہ وغیرہ کی میں ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے ذرین مشوروں سے مجھے نوازا۔ جے کے پرنٹرس شاہد کلیم خان کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ ان کی مدد کے بغیر یہ مقالہ مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ساتھ ہی فاران اسٹاف اور فیضان ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائیٹی کے تمام عہدداران دیگر عزیز و اقارب کا میں شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے ہر قدم پر میری مدد فرمائی۔ اللہ سے دعا گو ہوں کہ ان تمام کو اجر عظیم سے نوازے۔ امین

پٹھان ناظمہ ضمیر احمد خان
ریسرچ اسکالر

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

باب اول

اردو غزل کا پس منظر اور موضوعات کی تبدیلی

غزل ایک ایسی صنف ہے جس نے ہمیشہ زمانہ کا ساتھ دیا۔زمانہ کے نشیب وفراز کی ترجمانی کی،حالات کی انقلابی تبدیلی کے زیراثر اپنے آپ میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔اسی کیفیت نے غزل کوجدیدمیلانات سے آشنا کیا ہے۔غزل انقلاب کا موزوں ترین نام ہے۔یہی وجہ ہیکہ وہ محبوبیت اورمقبولیت کے تاج سے سرفراز ہوئی۔اورآج تک معاشرہ کے ہرفرد کے لئے ذہنی وروحانی سکون کی فراہمی کا ذریعہ بنی۔غزل کی مقبولیت ہی کا اثر ہیکہ اسکی تاریخ کے ہر دور میں غزل کے شاعروں کی اتنی کثرت رہی ہے۔ان گنت شاعر پیدا ہوتے رہے سب کے سب اعلیٰ درجہ کے نہ صحیح لیکن ہردور میں غزل سے ایک عام دلچسپی کوضرورظاہر کرتی ہےاس سےاس بات کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ غزل ہماری قومی ذہانت وفطانت کے ترجمان ہونے کی وجہ سے ہرفرد کے دل میں اس نے جگہ بنا لی تھی۔ہماری تہذیبی اورمعاشرتی خصوصیات کی عکاس ہونے کے سبب وہ ایک سرخوشی بن کرلوگوں پر چھا گئی غرض یہ کہ ہماری زندگی میں غزل کے اثرات بڑے گہرے اور ہمہ گیرنظر آتے ہیں اس نے ہماری زندگی کوسنوارا بھی ہےاس کونکھارنے کی کوشش بھی کی ہےاوراسی کے نتیجہ میں زندگی نے خود غزل کوسنوارااورنکھارا ہے۔صنف غزل کی عظمت اوررفعت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔اسی لئے یوسف حسین خان لکھتے ہیں۔

''میرا خیال ہیکہ ہمارے ادب میں غزل ہی ایسی صنف ہے جو اتنی سکت رکھتی ہیکہ اس آنے والے انقلاب کوجھیل جائے اوراس کے اثرات سے اپنے رنگ وادب میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے پھراپنا مقام حاصل کرلے۔تحت الشعوراورلاشعورکی نئی نفسیات کے تقاضوں کوغزل اچھی طرح پورا کرسکتی ہے۔شروع سے یہی نفسی محرک اس کی تخلیق کے ذمہ دار رہے ہیں اورآئندہ بھی رہینگے''۔

(1) (اردوغزل۔یوسف حسین خان۔صفحہ 323)

غزل ہماری تہذیبی ومعاشرتی روایات سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔وہ ہماری قومی ونسلی ذہانت وفطانت کی مظہر ہے۔اس لیئے ہم میں سے ہرفرد پرغزل کا گہرااثر پڑا۔انفرادی واجتماعی طور پر ہر

زمانہ میں لوگ اس میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ ہر دور میں اس کو مقبولیت حاصل رہی ہر انقلاب ہر تبدیلی کے باوجود غزل سے دلچسپی کسی زمانے میں کم نہیں ہوئی۔اس کی مقبولیت کا چراغ انقلاب و تغیرات کی آندھیوں میں بھی روشن رہا۔اس کا سبب صرف یہ کہ لوگ اس سے اپنے غموں کو غلط ہی نہیں کرتے رہے بلکہ انہوں نے اس کے ذریعہ سے اپنے لئے ذہنی و جذباتی آسودگی کا سامان بھی فراہم کیا۔کبھی کبھی ان حالات میں اس نے شمع راہ بن کر صحیح منزل کی طرف راہنمائی بھی کی یہ سب اس لئے کہ غزل نے کبھی اپنے آپ کو زندگی سے الگ نہیں کیا۔زندگی کا شائد ہی کوئی پہلو رہا ہے جس پر غزل سرائی نہ ہوئی ہو۔اس پر لطف یہ کہ بات غزل کے انداز میں پیش ہوئی ہو۔نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں دوسری اصناف کے مقابلے میں ہمیشہ غزل مقبول رہی ہے۔ناول داستان مثنوی میں تجربات ہوتے گئے روایات بنتی گئی لیکن غزل کا اثر کم نہیں ہوا۔

☆ غزل کا تخلیقی سفر

غزل کی ابتداء قصیدے کی تشبیب سے ہوئی ہے۔قدیم عربی شاعری میں قصیدے کے شروع میں اشعار معشوق کی یاد میں یا موسم بہار کی آمد وغیرہ پر لکھے جاتے تھے ان اشعار کو ''تشبیب '' کہتے ہیں۔آہستہ آہستہ تشبیب کے مضامین پر مبنی اشعار قصیدے کے علاوہ آزادانہ بھی کہے جانے لگے۔اور اسطرح غزل وجود میں آئی۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ غزل اور تشبیب دونوں مکمل طور پر ایک جیسے ہیں تشبیب میں ایک مضمون مکمل بیان کیا جاتا ہے ہے تو غزل کے تمام اشعار الگ الگ مضمون پر مشتمل ہوتے ہیں۔تشبیب کا ذکر'' حدائق السحر دقائق الشعر'' میں رشید واطواط کی کتاب میں ملتا ہے۔جس کا اردو میں ترجمہ حسب ذیل ہے۔

> **''معشوق کا حال اور اس کے عشق میں اپنا حال بیان کرنا تشبیب اور اسی کو تشبیب اور غزل بھی کہتے ہیں۔لیکن لوگوں میں مشہور و مستعمل یہ ہے کہ جس نظم کی ابتداء میں پریشان حالی کا ذکر کریں اور پھر ممدوح کے سوا جو چاہیں بیان کریں اس کو تشبیب کہتے ہیں''۔**

(2)(بحوالہ۔اردو غزل کے پچاس سال۔عبدالاحد خان خلیل صفحہ 2627)

رشید وطواط کی مندرجہ بالا تعریف سے چاہے وہ تشبیب کی ہو یا "غزل" کی ہوا تنا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس صنف سخن میں ''معشوق کا حال اور خود اپنا عشق میں حال'' تو شامل ہے لیکن مدح یا ممدوح سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔قصیدے میں جب تمہید کے بعد مدح ممدوح شروع ہو جاتی ہے تو شاعر ''گریز'' کی آڑ لے کر منظر ہی دوسرا پیش کرنا شروع کر دیتا ہے اور تشبیب ،غزل سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔اس بیان سے ظاہر ہیکہ قدیم ایرانی شعراء کے نزدیک غزل کے لئے مضامین محدود نہ تھے وہ غزل میں مدح ممدوح کے سواء سب کچھ جائز سمجھتے تھے۔

غزل کی یہ صورت اس وقت تک تھی جب تک غزل نے مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل نہین کی تھی۔اور وہ کچھ قصیدے کے ساتھ شامل تھی اور کچھ اس سے الگ۔بہت حد تک شعراء نے غزل اور تشبیب میں تشبیب اور نسیب میں فرق کرنا شروع کر دیا تھا۔لیکن یہ معمولی فرق ابھی عام نہ ہوا تھا۔اور اسی فرق کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے شمس قیس الرازی نے ہر خاص و عام کی توجہ کرائی اور تشبیب اور نسیب کے فرق کو واضح کیا۔اس کے نزدیک تشبیب اور نسیب مترادف اصطلاحات تھیں۔اس فرق کا عبدالاحد خان خلیل نے اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''کچھ نقادان فن کا یہ عقیدہ تھا کہ قصائد کی تمہید میں حسن وعشق کی آپ بیتی بیان کرنے کا نام تشبیب تھا اور مدح ممدوحِ کی شمولیت میں حسن وعشق کی جگ بیتی بیان کرنے کا نام نسیب۔ایک ذاتی محبت اور اصلی صورتحال کا تذکرہ تھا۔اور دوسرا فرضی اور روایتی محبت کی آفاقی خصوصیات کا تھا''۔

(بحوالہ۔اردو غزل کے پچاس سال۔عبدالاحد خان خلیل صفحہ (3)

32) **گویا ''نسیب'' ممدوح کو پیاری اور دلچسپ باتیں سنا کر اپنے مدعاء کیلئے تیار کرنے کا دوسرا نام تھا۔اس قسم کی غزل میں ایسی جاذبیت اور دلکشی ہوتی تھی کہ قصیدہ خواں کو اس سے بہتر دوسرا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ممدوح کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔**

نسب اور غزل کی مختلف خصوصیات کو اجاگر کرنے کیلئے شمس قیس الرازی اپنی کتاب ''العجم فی معا بیر اشعار العجم'' میں غزل کی تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''غزل دراصل لغت حدیث زناں وصنعت عشق بازی باایشاں وتہالک درویش ایشاں است ومفازلت عشق بازہ وملاعبت است باز ناں''۔

شمس قیس الرازی کی غزل کی یہ تعریف جسمیں ''غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا'' کہا گیا ہے بہت مشہور ہوئی۔ وہیں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا خیال بھی کافی اہم ہے انہوں نے غزل کی تعریف ''سخن از زنان گفتن'' کا ترجمہ عورتوں سے باتیں کرنا کے بجائے عورتوں کی باتیں کرنا بہتر سمجھا۔اورنسیب وغزل کے متعلق اپنی رائے دی وہ لکھتے ہیں۔

''لفظ غزل کے معنی عورتوں کا ذکر کرنا۔ان کے عشق کا دم بھرنا اوران کی محبت میں مرنا بعض اہل معنی نسیب اور غزل میں فرق کرتے ہیں۔اور زیادہ تر باکمال شعراء جمال معشوق کا ذکراوراحوال عشق ومحبت باہمی کے بیان کوغزل کہتے ہیں۔اوران غزلوں کوجن میں کوئی اور حال بیان کیا جائے یا جوکسی مدح کومقدمہ ہونسیب کہتے ہیں۔اس بیان سے رشید واطواط کی تائید ہوتی ہےاوراتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے بعض بڑے شاعر مضامین کے اعتبار سےغزل اورنسیب میں فرق کرتے تھے مگر وہ بھی نسیب کوغزل ہی کی ایک قسم سمجھتے تھے''۔ (4)(ہماری شاعری۔مسعود حسن رضوی ادیب۔طبع دہم 1967۔صفحہ 129)

شمش قیس الرازی کے بیان سے بہت ساری باتیں سامنے آئیں لیکن غزل کی یہ تشریح مکمل اور ہمہ گیر نہیں ہے اسمیں بہت کچھ اضافے کی ضرورت ہے یہ ٹھیک ہیکہ انسانی زندگی میں عشق و محبت کے جذبات بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان کی حثیت بنیادی ہے ان جذبات کے محرکات میں لطف کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔اس لئے غزل کو عام طور پر عشق ومحبت اوراس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مختلف ذہنی کیفیات اور جذباتی واردات کا ترجمان اور عکاس سمجھ لیا گیا ہے۔غزل صرف عشق ومحبت ہی تک محدود نہیں ہے اس میں موضوعات کے علاوہ بہت کچھ ہے اس میں ان موضوعات کے ساتھ ساتھ زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احساس اوراس کی ترجمانی بھی موجود ہے۔عربی ادب میں غزل نے کوئی ممتاز یا منفرد صورت حاصل نہیں کی۔تشبیب کی صورت میں عورتوں کے حسن و جمال اور شعراء کے وارداتِ عشقیہ کے بیان کا ذریعہ بنی رہی۔ڈاکٹر یوسف حسن اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

''اگر چہ اسلام سے قبل جاہلی دور میں تشبیب کی شکل میں تغزل ابتدائی حالت میں ملتا ہے لیکن اموی عہد میں غزل اپنی نکھری ہوئی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔شعر کی یہ صنف عشق و محبت کے جذبات کیلئے مخصوص ہوگئی۔پہلی صدی ہجری میں عمران بن ربیعہ غزل کی صنف کو

کامیابی کے ساتھ برتا اور پھر اس کے بعد دوسروں نے اس کام کی تکمیل کی‘‘۔

(5)(اردوغزل۔مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین ،مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۔1952 صفحہ 340)

نسیب وتشبیب کا سلسلہ عربی شعراء کے درمیان کافی دنوں تک مقبول رہا۔شعراء پہلے کسی عورت سے عشق ومحبت کا اظہار کرتےپھر گریز کر کے مدح شروع کرتے ۔اس طرح شاعر اپنی آپ بیتی سنا کر ممدوح کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا اور پھر مناسب توجہ کے ساتھ تشبیب ختم کر کے مدح شروع کر دیتا اور پھر ممدوح سے کافی دادا فعام واکرام حاصل کر لیتا۔عرب میں غزل نے کوئی مستقل شکل اختیار نہیں کی لیکن غزل کے موضوعات قصیدے ہی میں پیش کئے جاتے رہے اور مختلف شعرانے اس میں غزل کی کیفیت پیدا کر دی۔ایک مستقل صنف کی شکل تو اس نے ایران میں اختیار کی۔عربی سے جب یہ صنف سخن فارسی میں آئی تو ابتداء تشبیب ونسیب کی صورت میں ہی رہی لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک منفرد اور مستقل صنف سخن بن گئی ’’رودکی‘‘ غنائی صلاحیتوں اور شاعرانہ عظمتوں کا نتیجہ تھا کہ اس کا انداز تغزل قابل رشک سمجھا گیا اس کے بعد غزل کے ارتقاء ونشونما کا سلسلہ شروع ہو جو صدیوں تک جاری رہا اس ارتقاء ونشونما میں فارسی کے بڑے بڑے شاعر شریک ہوئے۔

فارسی میں دھیرے دھیرے غزل نے کافی مقبولت حاصل کر لی اور جدید حالات سے متاثر ہوتے ہوئے اپنا انداز بھی قدیم انداز سخن سے پرے شروع کر دیا۔فلسفہ وعرفانیات کو تغزل میں شامل کیا گیا۔اور سماجی وسیاسی پس منظر کی جھلک بھی غزلوں میں نظر آنے لگی۔اس دور کا مشہور شاعر عراقی گزرا ہے۔اس نے غزل کو دربار سے نکال کر عوام تک پہنچایا اور زندگی کی بھر پور ترجمانی غزل میں کی۔اس نے عشق وعرفان کا امتزاج فارسی میں سادگی ترنم کے ساتھ کیا کہ غزل کی دنیا میں انقلاب آ گیا۔غزل ایک نئی فضاء اور وسیع تر دنیا میں پہنچ کر خاص وعام میں مقبول ومعروف ہوئی۔

اس کے بعد سعدی نے غزل کے دامن کو اتنا وسیع کر دیا کہ ساری فضاء سیاسی وسماجی بدحالی کو بھول کر ’’نغمہ ہائے محبت ونعرہ ہائے عشق‘‘ سے گونج اٹھی۔ پہلے غزل عشق مجازی کی طرف جھکی نظر آتی تھی لیکن سعدی نے اپنی غزل میں عشق حقیقی اور اندرونی حالات کا تذکرہ اپنی غزلوں میں کیا وہ باتیں بیان کی جو دل والوں پر گزرتی ہیں۔جن اصولوں پر سعدی نے غزل کی بنیاد رکھی اس کے بعد اکثر غزل گوشعراء نے وہی اصول اختیار کئے۔غزل کے جو اصول سعدی نے بنائے اس کے بغیر غزل کی ترقی ووسعت ممکن نہ تھی۔اس طرح غزل ترقی کرتے کرتے ایران،ترکستان،اور ہندوستان میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

غزل کی ترقی کو حبیب الرحمٰن شیرانی نے رسالہ اردو کے معلیٰ میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

''سعدی سے پہلے غزل قصیدے سے دبی ہوئی تھی شیخ نے زورطبع سے اس کو اتنا بلند کر دیا کہ اس نے قصیدے کو دبا لیا''۔

اور نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء قصیدہ ومثنوی کو چھوڑ کر غزل ہی کہنے لگے۔غزل حقیقت میں جذبات کی ترجمانی شاعری کی جان اور ضمیر کی زبان بن کے ابھری اور ہر طرف صرف غزل ہی غزل نظر آنے لگی۔

سعدی کے بعد فارسی غزل کا اہم نام امیر خسرو ہے۔جن کا تعلق اردو غزل کی ابتداء کے سلسلے میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔خسرو کی غزل سے رغبت کی وجہ سے مضامین کی وسعت آسمان تک پہنچ گئی۔ان کی غزل محبت اور زندگی کی سچی ترجمانی بنکر ہمارے ادب میں آئی اور ہر درددل کا علاج بن کر ہر خاص وعام کے دل میں سما گئی۔

☆غزل کی خصوصیات

ایران کے زیر اثر غزل کی صنف نے ہندوستان میں بھی جڑ پکڑی اور ایسی ترقی کی کہ فارسی اور اردو دونوں میں اس نے وہ مرتبہ حاصل کیا جو کسی اور صنف کو نصیب نہ ہوا ہندوستان میں غزل جس طرح ساری فضاء پر چھا گئی اور سارے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا اس کی مثال کسی اور ملک میں نہیں مل سکتی۔ ہندوستان کا کلچر غزل کا، یہاں کی تہذیب غزل، کی یہاں مذاق غزل کا، یہاں کی معاشرت غزل کی رہی ہے اس تہذیب مذاق اور معاشرت کو پیدا کرنے میں خارجی ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہوا ہے،غزل ہمارے مخصوص ماحول کی پیداوار ہے اور ہمارا مخصوص ماحول غزل کی پیدا وار ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی

''ہندوستانی فضاء، تاریخی تہذیبی اور ادبی حالات وروایات تہلکات وتجربات نیز مختلف اقوام، ادب، شخصیتوں، حریفوں، خلیفوں سے سابقہ کی بدولت ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "اردو غزل نے پہلے کبھی فارسی غزل سے جو قرض لیا اب وہ اس کو کئی گنا بڑھا کر ادا کر سکتی ہے''۔ (6)(مقالہ جدید غزل۔شائع کردہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔صفحہ 7،8)

غزل جس ماحول کی پیداوار ہے وہ مخصوص تہذیبی اور معاشرتی حالات کا نتیجہ ہے۔ یہ تہذیبی اور معاشرتی حالات مخصوص جغرافیائی حالات اور مخصوص تاریخی واقعات کے ہاتھوں پیدا ہوئے

ہیں، یہاں کی آب و ہوا افراد کو بڑی حد تک جذباتی بناتی ہے۔شدت احساس کی بدولت مشرق کے افرادزندگی کے ہر پہلو کو داخلی انداز میں دیکھتے ہیں۔خارجیت کا شعور کم ہوتا ہے،اس شعور کے اظہار میں ہمیشہ داخلیت شامل ہوجاتی ہے۔اس کے اظہار میں خودفرد کی جذباتی کیفیت کا اثر زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔غزل بھی داخلی کیفیت کے بغیر ''غزل'' نہیں ہوسکتی ہے۔احساس کی شدت کا ہونا اس کے لئے لازمی ہے۔اس شدت احساس کے بغیر داخلیت کا وجود نہیں ہوسکتا بغیر ''غزل'' نہیں ہوسکتی ہے۔احساس کی شدت کا ہونا اس کے لئے لازمی ہے۔اس شدت احساس کے بغیر داخلیت کا وجود نہیں ہوسکتا داخلیت تفصیل ووضاحت کی مانع ہوتی ہے اسی لئے اختصار اور اجمال غزل کا لازمی جزو ہے آہنگ کا دھیما پن آہستگی اور ترقی بھی غزل کی اہم خصوصیت ہے۔

ہماری تہذیب و معاشرت میں غزل کے ارتقائی تسلسل کا بنیادی سبب یہی صورتحال رہا ہے۔غزل کو دوسرے ملکوں میں مروّج اصناف سے مقابلہ کرتے ہوئے سید امداد لکھتے ہیں۔

''یہ صنف شاعری تمام تر داخلی پہلو رکھتی ہے اس لئے اس کا احاطہ بہت محدود ہوتا ہے، چونکہ اس صنف کا تقاضہ یہ ہیکہ امور داخلی کے سوا امور خارجی قلم بند نہ ہوں اور ہوں بھی تو داخلی پہلو کی آمیزش سے خالی نہ ہوں۔اس لئے یہ صنف شاعری دشوار رنگ رکھتی ہے۔ذراسی لغزش سے غزلیت کا رنگ جاتا رہتا ہے،کلام قصیدہ نما ہو جاتا ہے، یا مبتلائے پست خیالی ہوکر احاطہ شاعری سے نکل جاتا ہے۔غزل گو کی شان یہ ہیکہ وہ اعلیٰ قسم کا دماغ رکھتا ہو اور خلقت کی رو سے آزاد طبیعت، پاک طینت، شوخ مزاج، نازک خیال، گداختہ دل اور برشتہ جگر ہو''۔ (7)(کاشف الحقائق۔امام اثر۔صفحہ 259۔370)

غزل کی مقبولت اپنی جگہ مسلم ہے۔اردو شاعری کی ابتداء ہی غزل سے ہوئی ہے اور اردو میں تنقید کے ابتدائی نقوش بھی غزل سے ہی متعلق نظر آتے ہیں۔جسطرح یہ صنف آگ کی طرح لوگوں میں پھیلتی رہی اس پر لغزشیں کرنے والے افراد کی کثرت بھی سامنے آئی۔غزل کی اہمیت ومقبولیت کو قبول نہ کرنے والے افراد نے غزل کی مخالفت شروع کردی۔چونکہ یہ مخالفت غلط بنیادوں پر قائم تھی،اسی لئے غزل کی صنف پر اس کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ اس کی مخالفت نے غزل کو کچھ اور بھی استوار کیا، اس میں کچھ اور بھی زندگی پیدا کی، ارتقاء کی راہوں پر اسے کچھ اور بھی آگے بڑھایا۔

قدیم تذکرہ نگاروں نے زبان و بیان صنائع و بدائع کے استعمال اور روزمرہ محاورے اور لطفِ ادا پر زور دیا۔ میرؔ کے نکات الشعراء سے لیکر آزاد کے ''آب حیات'' تک غزل کی تنقید سوانحی اور خارجی لوازمات کے جائزے پر مبنی رہی۔ حالیؔ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے نیچرل شاعری کو معیار بنا کر غزل کو نیا روپ دینے کی تلقین کی۔ وہ قدماء کے شعری عظمت کے قائل ہیں مگر زمانے کے نئے تقاضوں کے پیش نظر غزل کی اصلاح پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ غزل کی مقبولیت کے قائل ہیں لکھتے ہیں۔

''قوم کے پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں بچے جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارہ رکھتے ہیں۔ وہ شادی بیاہ کی محفلوں میں وجد وسماع کی مجلسوں میں لہو ولعب کی صحبتوں میں تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اس کے اشعار ہر موقع اور محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں''۔

(8) مقدمہ شعر شاعری صفحہ 179)

حالیؔ نے جو غزل پر کلام کیا ہے وہ معروضی سے زیادہ اخلاقی پہلو اور افادی پہلو لئے ہوئے ہے۔ وہ غزل میں رسم پرستی اور مخرب اخلاق موضوعات کے خلاف تھے۔ نہ کہ غزل کے خلاف ان کی غزل پر مخالفت نہ تھی بلکہ اندھی تقلید اور عشقیہ موضوعات ایہام گوئی، مخرب اخلاق مضامین جو صرف انسانی جذبات کو برانگیختہ کر یا ایسی ہر صنف شاعری کے خلاف تھے، وہ شاعری میں سادگی کے متلاشی تھے۔ حالیؔ عشقیہ مضامین میں وسعت تنوع اور جدت کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔

''ہماری رائے ہیکہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادکئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام غزل پر انواع واقسام اور تمام جسمانی اوار روحانی تعلقات پر حاوی ہوں''۔ (9)(مقدمہ شعروشاعری۔صفحہ۔182)

بے حیائی اور فحاشی ان کے نزدیک اعلیٰ شاعری کی ضمانت نہیں اور غزل میں امرد پرستی کے مضمون پر ان کا ردعمل بالکل واضح ہے۔ جب انہوں نے غزل میں عشق و عاشقی ہوس جوئی امرد پرستی اور شاہد بازی کا میلان غالب دیکھا تو اس رجحان کے خلاف آواز اٹھانا اپنا اولین فرض سمجھا۔ ساتھ ہی وہ غزل کے دامن کو مختلف النوع مضامین سے مالا مال کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ عشقیہ اور خمریاتی

مضامین کے علاوہ انسانی زندگی اور فطرت سے ایسے موضوعات شاعری کے لئے منتخب کئے جا سکتے ہیں جن سے اردو کا دامن بھر سکے۔

''مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشاء خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت یا صبر یا رضاء یا قناعت یا توکل یا رغبت یا نفرت یا رحم یا انصاف یا غصہ یا تعجب یا امید یا ناامیدی یا شوق یا انتظار یا حب وطن یا قومی ہمدردی یا رجوع الی اللہ یا حمایت دین و مذہب یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا اور کوئی جذبہ جذباتِ انسانی میں ہے اس کو غزل میں بیان کر سکتے ہیں''۔

(10)(مقدمہ شعروشاعری۔صفحہ۔198)

حالی نے جہاں سادگی اور موضوعات کے وسعت کی بات کی وہیں پر دیگر ناقدین نے غزل کی اہمیت کو سمجھنے کی طرف اپنا رجحان ظاہر نہیں کیا۔انہوں نے حقائق پر دھیان نہ دیتے ہوئے چھوٹی سے خامی کو مکمل خامی بتانا شروع کیا۔غزل کے چند شاعروں کی وجہ سے ساری صنف کو گردن زدنی قرار دیا۔ان مخالفین کی نمائندگی جوش کرتے ہیں بعض مغربی ناقدین مغربی معیاروں اور اصولوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور جب غزل کی خالص مشرقی صنف سخن ان معیاروں پر پوری نہیں اترتی تو اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں س۔کلیم الدین احمد جن کے نزدیک "غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے" اور اس وجہ سےجس کی کوئی فنی اور جمالیاتی اہمیت نہیں۔اس میں تو وہی تمام خصوصیات موجود ہیں جو وحشی آرٹ میں ہوتیں ہیں۔غزل مجموعی طور پر مختلف خیالات واحساسات کی ترجمانی کرتی ہے لیکن اس کے مختلف اشعار میں کوئی ترکیب نہیں ہوتی اور نہ شعر مفرد کے مختصر پیمانے میں کسی پیچیدہ تخیلی جذباتی تجربے کو برتنے کی گنجائش ہے۔اپنے دعوے کے ثبوت میں کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

''وحشی اپنے وقتی جذبہ کے وجود اس کے احساس اور اس کی تسکین کو کافی تصور کرتا ہے اسے ماضی و مستقبل کی اس وقت تک فکر نہیں رہتی، وہ نہیں سوچتا کہ یہ وقتی جذبہ اس کی انفرادی زندگی کی تکمیل میں ممد یا مخل ہوگا۔وہ نہ غور فکر کرتا ہے اور نہ غور وفکر اس کی بس کی بات ہوتی ہے، وہ محض ایک اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر اس سے فوری نجات چاہتا ہے اور یہ نجات وہ صورت شعر میں حاصل کرتا ہے''۔

(11) (نگار۔جنوری،فروری 1942،شمارہ۔2، 1۔جلد 41۔بزم نگار۔کلیم الدین احمد۔صفحہ 3)

کلیم الدین احمد نے مغربی شاعری کے نمونوں کو مدنظر رکھ کر تنقید کی۔اور بہت حدتک غزل کے مزاج ہندوستانی معاشرت اوراس تہذیبی فضاء سے بے نیاز ہوکراپنی آراء کا اظہار کیا ہے جس میں غزل نے ترقی کی منزلیں طے کیں تھی۔بہر حال اردوغزل کے متعلق ہر فرد کے لئے کلیم الدین احمد کی تنقیدوں کا مطالعہ معروضی مطالعہ اشد ضروری ہے اسلئے کہ ان کے یہاں عام معترضین کی طرح سطحی یا چھچھورے انداز کی تنقید نہیں ہے،وہ اپنے طور پر ہر دلیل کے لئے ثبوت پیش کرتے ہیں ہمیں اس سے اتفاق ہو یا نہ ہولیکن ہم اسے غزل کی تنقید میں نئے زاویئے کا اضافہ سمجھتے ہیں۔کلیم الدین نے اردوغزل کے خلاف عدم تسلسل اور پراگندگی کا فرد جرم عائد کیا ہے،غزل میں ربط،اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے انہیں اسباب کی بناء پر انہوں نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ''غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے'' وہ کہتے ہیں.

''غزل کے ہر شعر میں کسی مخصوص جذبہ یا خیال کا اظہار مدنظر ہوتا ہے،سارے احساسات وتصورات مرتب ومرکب ہوکرایک نقش کامل کی شکل میں جلوہ گر نہیں ہوتے۔فنی نقص کی وجہ سے ہر احساس یا خیال اوراس کا وجوداس کا اظہار کافی سمجھا جاتا ہے یہی اس صنف کے نیم وحشی ہونے کی دلیل ہے''۔ (12بزم نگار۔۔۔۔ایضاً۔۔۔صفحہ 3)

غزل سے متعلق کلیم الدین کا یہ خیال قائم کر لینا کہ وہ کسی احساس کی وقتی شدت یا جذبہ کی لمحاتی برانگیختگی کے نتیجہ میں تخلیق ہوتی ہے صحیح نہیں۔آگے وہ کہتے ہیں کہ غزل کی تخلیق میں فنکار کے پاس صورت ہیئت اور جمالیاتی پہلو کا کوئی تصور نہیں ہوتا،غزل کے منتشر خیال اشعار کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر لینا کہ ان میں کوئی ذہنی وجذباتی ربط نہیں ہوتا۔اس میں مختلف عناصر ترکیب پا کر مکمل صورت اور ہیئت کی تخلیق نہیں کرتے۔غزل کی ہیئت اور اس کے جمالیاتی اقدار کے سطحی مطالعے پر مبنی ہے۔لیکن اس میں صنف غزل کا کوئی قصور نہیں ہے قصور تو غزل کے ان فنکاروں کا ہے جنہوں نے کبھی کبھی اس خیال کو پس پشت ڈال دیا صنف غزل نے اس پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔

کلیم الدین احمد نے بیان غزل کی منتشر خیالی کوغزل کی خامی بتایا۔دراصل وہی خامی کوغزل کی اصل خوبی کہا جاتا ہے غزل کے تمام اشعار ہم ردیف اور ہم قافیہ ہونے کے باوجود معنی کے اعتبار سے بالکل آزاد ہوتے ہیں،شاعر کو جو کچھ بھی کہنا ہوتا ہے دو مصرعوں میں کہنا ہوتا ہے۔غزل کے اشعار میں کوئی مضمون یا خیال مسلسل ادا نہیں کیا جاتا۔غزل کی اسی خوبی کو اختر انصاری اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''اصطلاح شعراء میں غزل متفق الوزن اور متفق القوافی اشعار کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جس میں کسی مسلسل مفہوم کا پایا جانا ضروری نہیں ہر شعر آزاد قائم الذات خود مکتفی کے اعتبار سے اپنی جگہ پر مکمل اور ایک مستقل جداگانہ حیثیت کا حامل ہوتا ہے"۔

(13) (غزل کی سرگذشت اختر انصاری۔صفحہ 195)

اس بیان سے ظاہر ہیکہ غزل کا ایک شعر اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لئے دوسرے شعر کا محتاج نہیں ہوتا۔کبھی کبھی کوئی مضمون یا خیال دو مصرعوں میں نہ سما سکے تو شاعر اسے دو یا دو سے زائد اشعار میں ادا کر سکتا ہے۔غزل کے ان مسلسل اشعار کو قطعہ بند اشعار کہتے ہیں مگر یہ غزل کی اصل خوبی نہ ہوتے ہوئے غزل کے فن کی ذیلی خاصیت ہے۔

غزل صحیح معنوں میں جذبات کا ایک مرقعہ ہے اس کا ہر شعر انسانی جذبات کی ایک بے مثال تصویر ہے غزل کے اشعار کو کسی مخصوص اصول یا قاعدے کے ذریعے پرکھا نہیں جا سکتا، کیوں کہ انسانی فطرت منطقی اصولوں کی پیروی سے آزاد ہوتی ہے۔کبھی انسان کچھ محسوس کرتا ہے تو کبھی اس کے بالکل برعکس کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔اسی لئے کہا جاتا ہے کی انسانی طبیعت منطقی اصولوں کی پابند نہیں کبھی ہمارے خیالات بلندی کی طرف جاتے ہیں تو کبھی انتہائی پستی کی طرف۔اس قسم کی متضاد کیفیتیں ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، جو شاعر نہیں وہ ان کیفیتوں کو دل میں دبائے رکھتے ہیں لیکن شاعر اس کیفیت کو شعر میں قید کر دیتا ہے، اسی لئے شاعر کے کلام میں تضاد دکھائی دیتا ہے، بظاہر یہ تضاد منطقی دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل فطری ہے، اور اسکی وجہ عقل و جذبات کی کشمکش ہے کبھی عقل جذبات پر غالب آجاتی ہے اور کبھی جذبات عقل پر یہی وجہ ہیکہ شاعر کے خیالات کو فلسفہ کی عقلی دلیلوں سے پرکھنا بے سود ہے۔لہٰذا یہ اعتراض کہ شاعر پر ایک وقت میں الگ الگ کیفیتیں کس طرح طاری ہوتی ہیں غلط ٹھرتا ہے۔یوں بھی غزل کے تمام اشعار ایک ہی وقت یا ایک ہی نشست میں کہے نہیں جاتے۔اسی لئے شعر ایک دوسرے سے مربوط نہیں ہو پاتے۔مثلاً غالب کے دو الگ الگ اشعار موضوع ہے عشق لیکن جذبات الگ الگ ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

غزل کی بے ربطی پر مختلف نقاد رقم طراز ہیں۔لیکن ہر ایک کی رائے مختلف ہے کوئی بے ربطی کو خلل تو کوئی خوبی بیان کرتا ہے۔اسی سلسلے میں فراق گورکھپوری اپنے مقالہ میں کہتے ہیں غزل کا ہر شعر اپنے میں ایک تنہا ہوتا ہے۔جس طرح کسی کہانی یا کسی نظم کا ایک کلائمکس ہوتا ہے،غزل کا ہر شعر ایک کلائمکس کی حیثیت رکھتا ہے۔کیوں کہ دو مصرعوں میں شاعر کو چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا مضمون ادا کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کی توضیح وتشریح۔

کچھ ناقدین ایک طرف یہ رائے رکھتے ہیں کہ غزل منتشر خیالی کا پلندہ ہے اور کچھ مثبت رائے رکھتے ہیں کہ غزل کی بے ربطی ہی میں غزل کی خوبی پوشیدہ ہے۔یوسف حسین خان اپنے مقالے اردو غزل میں ریزہ کاری سے متعلق بیان دیا ہے وہ یہاں کافی اہم معلوم ہوتا ہے۔

> **''غزل کی ریزہ کاری اگر چہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ جدید زمانے کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہیکہ آئندہ غزل میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کیا جائیگا اور منفرد شعروں کے پس منظر میں وحدت احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائینگی''۔** (14 اردو غزل یوسف حسین خان۔1952 صفحہ 22)

غزل کا فن کم سے کم الفاظ میں زیادہ مطالب ادا کرنے کا فن ہے، نہ صرف یہ کہ غزل کے اشعار میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ تفصیل سے غزل کا مزاج مجروح ہوتا ہے اس لیئے کہا جا سکتا ہے کہ غزل کی تنگ دامانی میں ہی اس کا حسن پوشیدہ ہے لیکن ناقدین نے جب سے غزل کی ریزہ خیالی اور اس کے اشعار کی بے ربطی کو نشانہ بنایا غزل میں شعوری طور پر تسلسل خیال رکھا جانے لگا۔اور غزل کے سرمائے میں ایسی غزلوں کی تلاش شروع ہوئی جن میں خیال کا تسلسل پایا جاتا ہو۔تا کہ معترضین کو اعتراض کا موقع نہ مل سکے،اور غزل جیسی ہر دلعزیز اور لطیف صنف شاعری سے لوگ بدظن نہ ہو جائے۔مگر یہ حقیقت ہیکہ اس کی تلاش کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور غزل اپنے اصل مزاج کی طرف بڑھتی گئی۔اور آج غزل کی باتیں شاذ و نادر سننے میں آتی ہیں عملاً جو غزلیں ہمارے سامنے پیش کی جارہی ہیں وہ غیر مسلسل غزل ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔

غزل میں تسلسل بیان اور مجموعی تاثر کی بات دراصل نقادوں کو اس وقت اٹھانی پڑی جب وہ کسی غزل پر تنقید کرنے بیٹھے اور انہیں یہ دشواری پیش آئی کہ وہ اس غزل کو اچھے یا برے خانے میں نہ ڈال سکے۔کسی نظم کے بارے میں یہ کہنا آسان ہیکہ شاعر نے اس میں فلاں بات کہی ہے یا اس نکتے

پر زور دیا ہے اس کے منفی رویے پر دلالت کرتی ہیشعر کی بنیاد پر رائے دینی ہوگی غزل کی تنقید کا یہ بنیادی
اصول ہے۔جمیل جالبی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ کہتے ہیں۔
اصول ہے۔جمیل جالبی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ کہتے ہیں:۔

''غزل میں عام طور پر ایک شعر دوسرے شعر سے کیفیت واحساس کے لحاظ سے الگ ہوتا ہے لیکن ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔غزل کے اچھے شعر میں فکر واظہار کی ایسی جامعیت ہوتی ہیکہ وہ جلد زبان پر چڑھ کر ہماری روزمرہ کی بات چیت کا حصہ بن جاتا ہے اس لئے کسی شاعر کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مکمل غزل پر توجہ دینا ضروری نہیں ہوتا بلکہ الگ الگ شعروں کا خیال رکھا جاتا ہے''۔

(15)(تاریخ ادب: جلد دوم، حصہ اول) جمیل جالبی، ہندوستانی ایڈیشن صفحہ 572)

ریزہ خیالی کو یہاں فن مانا گیا ہے، اس میں اختصار کا پہلو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔غزل کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہیکہ وہ خاص بات کو عام میں تبدیل کر دیتی ہے، یعنی غزل آپ بیتی کو جگ بیتی کی نوعیت میں تبدیل کر دیتی ہے، اور ہر غزل کو سننے والا شخص اپنی استعداد کے مطابق شاعر کی روداد کو اپنی روداد سمجھ کر اس سے لطف حاصل کرتا ہے۔غزل کے دو مصرعوں میں کسی خاص واقعہ کی تفصیل بیان کیئے بغیر واقعے کی شدت کو قاری تک پہنچانا غزل کی خاصیت ہے۔مطلب یہ ہیکہ غزل میں داخلیت کو اہم مقام حاصل ہے۔داخلیت سے مراد یہ ہیکہ پورا واقعہ قاری تک نہ پہچایا جائے بلکہ اس کا تاثر پہچایا جائے اس عمل میں ایک طرف تو واقعہ کو شخصی بنایا جاتا ہے تاکہ وہ اس کی شخصیت سے ہم آہنگ ہو سکے دوسری طرف اس کے اظہار کے وقت وہ عمومی یا اجتماعی شکل اختیار کر لیتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں غزل کے مزاج میں داخلیت اصل عنصر ہے۔

غزل میں جس دروں بینی کا ذکر کیا جاتا ہے۔اس سے غزل کی داخلیت والی خصوصیت ان معنوں میں مختلف ہے کہ دروں بینی کو شاعر کی فطرت سمجھا جاتا ہے یعنی غزل کا شاعر اپنی شخصیت پر مرکوز ہوتا ہے وہ تنہائی پسند ہوتا ہے اور خارجی عوامل سے ربط وضبط نہیں رکھتا جبکہ جس داخلیت کا ذکر ابھی ہوا وہ ایک طریقہ کار ہے نہ کہ شاعر کی فطرت یا موضوع کی نوعیت غزل میں اس طریقہ کار کی بڑی اہمیت ہے۔داخلیت کے غلط تصور کی وجہ سے غزل میں خارجیت اور داخلیت کی بحث چلتی رہی۔ڈاکٹر آثر کی رائے اس ضمن میں کافی اہمیت رکھتی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

''یہ صنف شاعری تمام تر داخلی پہلو رکھتی ہے اس لیئے اس کا احاطہ بہت محدود ہوتا ہے، چونکہ اس صنف ہی کا تقاضہ ہیکہ امور داخلی کے سوا امور خارجی قلمبند نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو داخلی پہلو کی آمیزش سے خالی نہ ہوں اس لئے یہ صنف شاعری دشوار رنگ رکھتی ہے ذرا سی لغزش سے غزلیت کا رنگ جاتا رہتا ہے، کلام قصیدہ نما ہو جاتا ہے، یا مبتلائے پست خیالی ہو کر احاطہ شاعری سے نکل جاتا ہے۔غزل گو کی شان یہ ہیکہ وہ اعلیٰ قسم کا دماغ رکھتا ہو اور خلقت کی رو سے آزاد طبیعت، پاک طینت، شوخ مزاج، نازک خیال، گداختہ اور برشتہ جگر ہو''۔ (16) (کاشف الحقائق۔مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی۔صفحہ 359۔نئی دہلی 1982)

اختصار اور اجمال صنف غزل کی لازمی خصوصیت ہے۔تفصیل وتوضیح کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ تجربہ غزل میں اختصار واجمال کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔اور ایسا کرنے میں اس کو اشاروں اور کنایوں علامتوں اور تمثیلوں سے کام لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔چنانچہ وہ ان سب سے کام لیتا ہے۔اور اس کے نتیجہ میں رمزیت اور ایمائیت کی خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔یہ رمزیت اور ایمائیت یوں تو ہر آرٹ کی خصوصیت ہوتی ہے لیکن غزل کی صنف اس کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔کیونکہ اس کے بغیر سارا جمالیاتی تاثر ختم ہو جاتا ہے۔اس رمزیت اور ایمائیت کو پیدا کرنے کے لئے غزل کے فنکار کو بڑی کاوشیں کرنی پڑتی ہیں شروع سے ہی شعرا اگر یہ کاوشیں نہ کرتے تو غزل کی روایت میں یہ گل وبلبل، شمع و پروانہ، یوسف وزلیخا، اور نہ جانے اس طرح کے کتنے اشاروں تمثیلوں اور تلمیحوں کا وجود نہ ہوتا غزل کو جمالیاتی اقدار سے ہم کنار کرنے میں ان سب کا بڑا ہاتھ ہے۔ان کا تاثر دو پہلو رکھتا ہے ایک تو یہ کہ غزل میں موضوع اور مواد میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے اور دوسرے اس کا اظہار زیادہ حسین اور دلکش ہو جاتا ہے۔رمزیت اور ایمائیت کی وجہ سے حسن ودلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور موضوع تمام وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

غزل کا شاعر دراصل سماج کا ایک فرد ہے۔جس طرح عوام اپنے ارگرد کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔اسی طرح غزل کا شاعر بھی ماحول سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔فرق صرف ایمائی طرز بیان کا ہے۔جو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ واقعات کی تفصیل، جگہ، وقت اور اشخاص کے ناموں کے ساتھ بیان کرے۔لہٰذا اختصار اور اجمال غزل کی خصوصیت ہے تو اس میں تفصیل کی

گنجائش نہیں رہتی، جہاں تک اپنے زمانے کے اجتماعی رجحانات عصری اقدار اور اخلاقی نظام کو پیش کرنے کا سوال ہے یہ خصوصیت ہر دور کی غزل میں ملتی ہے۔غزل کی یہ خوبی تسلیم کی گئی ہیکہ یہ زمان و مکاں کی سرحدوں کو پار کر کے ہر عہد میں اپنی معنویت برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسین۔

''یہ واقعات کے بجائے ان سے حاصل شدہ نتیجوں کو آپ بیتی کے لہجہ میں بیان کرتی ہے اور کچھ اس طرح بیان کرتی ہیکہ ایک واقعہ کے حاصل کردہ تاثر کو دوسرے کئی واقعات پر چسپاں کیا جاسکتا ہے''۔

(17)(اردو میں شعری رجحانات۔ڈاکٹر منیر الزماں۔صفحہ 12)

غزل کی خصوصیت میں اس کی زبان کی سادگی بھی شامل ہے۔حالؔی نے غزل کے لئے غریب اور اجنبی الفاظ کے مقابلے میں مانوس الفاظ کو فوقیت دی ہے۔ان کا خیال ہیکہ غیر مانوس الفاظ سے غزل کی لطافت میں حرف آتا ہے۔اور یہ خیال بالکل درست بھی ہے۔ورنہ کرخت شکل اور ذو معنی الفاظ سے شعر کے خیال کو سمجھنے میں تکلیف در پیش آتی ہے۔اور قاری غزل سیلطف اندوز ہوئے بغیر آگے کو چلتے بنتے ہیں۔سید عبداللہ غزل کے لیے الفاظ کی شیرنی،سلالت اور لطافت کے قائل ہیں۔وہیں عبدالسلام ندوی غزل کی زبان کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

''غزل کے الفاظ شیریں، لچکدار،قریب الفہم،نرم،غیر پیچیدہ اور واضح ہونے چاہیئے اور اس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، جو ظاہر المعنی،نرم اور صاف وشفاف ہو، جو غمگین کو خوش کردے اور باوقار شخص کے لئے متانت سکن ہو''۔

(18)(شعر الہند،حصہ دوم،مولانا عبدالسلام ندوی۔1954،صفحہ 289)

غزل میں الفاظ اپنے خاص مفاہیم میں استعمال ہوتے ہیں۔اس لئے اس کا طرز اظہار براہ راست نہ ہوکر بالواسطہ یا استعاراتی ہے۔غزلوں کے استعاراتی رجحان نے ایک استعاراتی نظام کی تشکیل دی ہے۔ یہ نظام اتنا وسیع اور مکمل ہے۔اور غزل اس پر اس قدر حاوی ہے کہ اس کے بغیر غزل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔غزل میں رمز و اشارہ علامت بیان،ایجاز واختصار اور داخلی انداز بیان اسی کا مرہون منت ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج''میں اردو غزل پر چند ایسے نکات پیش کیئے ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔ان

کے بقول غزل بنیادی طور پر ایک ''شرمیلی صنف سخن'' ہے، جس نے اپنے اظہار کے لئے تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کا انتخاب کیا ہے۔ غزل کے مزاج کی اس کیفیت کی روشنی میں وہ لکھتے ہیں۔

''غزل جذبہ سے منقطع ہوئے بغیر باہر کو لپکتی ہے اور اسمیں شعور کائنات کا عمل پہلی بار اجاگر ہوتا ہے۔ چنانچہ بیک وقت آزاد بھی اور پابہ گل بھی اس کی جڑیں زمین اور طبعی رجحان سے چمٹی ہوتیں ہیں لیکن یہ اپنی ذات کو پار کرنے کی سعی بھی کرتی ہے''۔

(19)(ڈاکٹر وزیر آغا۔ اردو شاعری کا مزاج۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس 1974۔ صفحہ 240)

صنف غزل کی مقبولیت کا راز اس کے موضوعات سے زیادہ اس کے جمالیاتی پہلوؤں میں ہے، یہ جمالیاتی پہلو صنف غزل میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک یہ موضوع کا اظہار و ارادت قلبیہ کی صورت نہ اختیار کر لے، اس کے بعد ہی جذبہ کا اظہار نغمگی اور موسیقی میں حل ہو کر تخلیق حسن کا باعث بنتا ہے۔ مجنوں کہتے ہیں، نغمگی اور غنائیت شاعری کی اصل روح ہے۔ لہٰذا غزل میں اس عنصر کی موجودگی ضروری ہے۔ غزل کے متعلق مجنوں نے ایک نظریہ پیش کیا ہے جس کی طرف ان سے پہلے بھی تبصرہ نگاروں نے اشارے کئے ہیں۔ ان کے نزدیک فنکاری کا اصل محرک وجود سے ناآسودگی اور ممکن الوجود کی تمنا ہے۔ اور انہوں نے اس کا نام تخیل رکھا ہے۔

''حال پر قناعت نہ کرنا اور ایک بہتر مستقبل کے حصول کی آرزو میں لگے رہنا اس کو تخیل کہتے ہیں۔ اور یہی شاعری کی جان ہے جو بالکل داخلی اور انفرادی اپج ہے اس کی سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور نکھری ہوئی صورت غزل ہے''۔

(20)(شعر اردو غزل، فراغ گورکھپوری، صفحہ 131)

غزل سے متعلق دیگر ناقدین کے ساتھ ساتھ یوسف حسین خان نے بھی غزل گوئی کو کبھی موسیقی اور کبھی سخن محبوب سے قریب مانا ہے، انہوں نے غالبؔ کے مشہور شعر کی تشریح بہترین طریقے سے پیش کی ہے۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تینوں اجزاء عبارت، اشارت اور ادا تغزل کے اصلی عناصر ہیں:۔

''غزل محبوب سے اور محبوب کی گفتگو ہے۔اس کی خوبی اسمیں ہیکہ کلام کا مقصد پورا ہو یعنی تاثیر،انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا تاثیر پیدا کرنا ہے،اول الذکر افادی پہلو رکھتا ہے جونثر نے اپنے ذمہ لیا ہے،شعر کا اور خاص طور پر غزل کی شعر کا سرمایہ اثر وتاثیر کی خمیر سیپنتا ہے تغزل کی تاثیر کا راز اس میں ہے کہ عبارت،اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبے کی تصویر کی رنگ آمیزی کی جائے''۔

(21)(اردو غزل۔یوسف حسین خان،انجمن ترقی اردو ہند،علیگڑھ،1957۔صفحہ 80-79)

غزل سے متعلق اپنی رائے کی اہمیت منوانے والے ایک اور نقاد نیاز فتح پوری شاعری بالخصوص غزلیہ کو دلوں کا معاملہ سمجھتے ہیں۔انہوں نے اپنے مضمون''غزل گوئی اور ترقی زبان پر عہد بہ عہد تبصرہ''میں غزل کی جامع تعریف کی ہے اور اس کی ماہیت اور وسعتوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

''محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل وتغزل ہے۔محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اس احساس وتاثر کے اظہار کا نام شعر ہے اس طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر اور آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور ترنم کو پیدا کرنے کے لئے مخصوص لب ولہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے ہیں''۔

(22)(نکات مجنون۔چراغ گورکھپوری۔صفحہ 66)

وہ غزل کی اصل روح کو واضح کرنے کے لئے آگے رقم طراز ہیں۔

''غزل کے اصل موضوع زندگی کی المنا کی اور محبت کا سوز وگداز ہے۔کیفیات عشق اور واردات زندگی کو دلسوزی اور درمندی،نرمی اور لطافت کے ساتھ بیان کرنے کا نام غزل ہے''۔

(23)(نکات مجنوں،فراق گورکھپوری،صفحہ 67)

فراق کے بعد پروفیسر آل احمد سرور اردو کے معروف ادیب اور نقاد ہیں۔غزل کی مقبولیت کے پیش نظر انہوں نے غزل کی تعریف میں جو باتیں لکھیں ہیں وہ وہ ہماری اس گفتگو کو مکمل کرنے کے لیئے کافی اہم ثابت ہوگی کہ غزل کیا ہے۔

’’ غزل حسن و عشق کی ترجمانی اور محبت کی داستان ہے۔جب تک دنیا میں چاندنی، بہار، جوانی، نغمہ سبزہ موجود ہے اس کی دلکشی موجود ہے، غزل زندہ بھی ہے اور اس کا حسن تابندہ، مگر زندگی محض چاندنی اور بہار کا نام نہیں اس طرح شاعری محض غزل گوئی میں محدود نہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل شاعری کی معراج ہے، غزل کا حسن بے ساختگی، کنائے، بلاغت، لطافت کا حسن ہے۔غزل بقول ایک نقاد کے 'ایک تاج محل ہے‘‘۔

(24)(آل احمد سرور، مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 1974 صفحہ 17،18)

☆اردو غزل کی ابتداء

عربی فارسی اور ممالک غیر میں غزل کی ابتداء کا مختصراً جائزہ لینے کے بعد آیئے ہم اردو ادب میں غزل کی ابتداء کا سرسری جائزہ لیں۔اردو غزل کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی اس ضمن میں محققین کی آراء میں کافی اختلاف ہے۔عام طور پر امیر خسرو کو اردو کا پہلا غزل گو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں بطور نمونہ غزل کا یہ مطلع پیش نظر ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لے ہوکاہے لگائے چھتیاں

یہ غزل ’’آب حیات‘‘ میں سب سے پہلے 1880 میں شائع ہوئی۔اس غزل کی بنیاد پر امیر خسرو کو اردو غزل کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔امیر خسرو کے بعد تقریباً تین سو ساڑھے تین سو سال تک غزل کے کم ہی نمونے ملتے ہیں، ان تمام غزلوں کی پہچان یہ ہیکہ ان میں ہندی اور فارسی الفاظ کی آمیزش ہے، شاہ جہاں کے دور تک اردو زبان نے اپنے ارتقا کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں مگر اس دور میں بھی غزل کے نمونے مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں ستر ہویں صدی میں دکن میں با قاعدہ اردو شاعری کا چلن ہو گیا تھا۔محمد قلی قطب شاہ با کمال صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔اس نے نہ صرف غزل بلکہ مثنوی رباعی اور مرثیہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، ان کی غزلوں میں سادگی روانی اور برجستگی عام طور پر ملتی ہے، ان کے یہاں فکر کی گہرائی، سوز و گداز، درد و زخم اور نشتریت وغیرہ کی تلاش ایک بیکار کوشش ہے انہوں نے حقیقت نگاری سے کام لیا جو کچھ بیان کیا وہ اس کے تجربات اور مشاہدات ہیں، فارسی غزل کی تصور پرستی کا عنصر قلی قطب شاہ کی غزلوں میں نہیں ہے۔قطب شاہ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

’’چارسو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کیشعراء کے عشقیہ کلام کے سامنے رکھ دیا جائے تو سوائے زبان کے تغیر کے اور کوئی فرق نہ ہوگا، وہی باتیں وہی مضمون اور وہی طرز ادااور وہی بحریں ہیں‘‘۔

قطب شاہ کے بعد عبداللہ، وجہی غواصی، بحری، نصرتی، ہاشمی اور شوقی وغیرہ شعراء نے غزل کی نشو نما میں نمایاں کردار ادا کیا گر چہ ان شعراء کا تعلق غزل کے تشکیلی دور سے ہے لیکن اس دور کے بعض اشعار چونکا دینے والے ہیں، ان اشعار میں ایک خاص ادبی شان اور زبان میں کافی ترقی و پختگی پائی جاتی ہے۔

اردو غزل اس دور تک فارسی کے اثرات کافی قبول کر چکی تھی۔غزل کی ہیئت میں ردیف کے ساتھ قافیہ بھی داخل ہو چکا تھا، لیکن مثنوی کے اثر سے باہر نہیں نکل پائی تھی، موضوعات میں رنگارنگی وسعت نظری نظر آنے لگی تھی، غرض غزل پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جارہی تھی، ایسے میں ولی نے غزل کی روایت کو اور آگے بڑھایا، مستقبل میں ترقی کے امکانات پیدا کیئے، اردو غزل کی روایت میں ولی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس کا اعتراف باقر آگاہ، میر حسن، قائم چاند پوری، میر تقی میر، محمد حسین آزاد اور مصحفی وغیرہ تذکرہ نگاروں نے کیا۔

قدیم دکنی غزل کا نمونہ ذیل میں پیش ہے۔

تج کیس گھنگر و والے بادل پٹیاں ہے کالے
تس مانگ کے اجالے بجلیاں اٹھیاں لگن میں

ملا خیالی

یوسف گم گشتہ پھر آگاہ بہ کنعاں غم نہ کھا
گھر تیرا امید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا

محمد قلی قطب شاہ

نین تجھ بھرے دیکھت نظر میانے اثر آوے
ادھر کے یاد کرنے میں زبان اوپر شکر آوے

مشتاق

طاقت نہیں دوری کی اب تو بیگ آمل رے پیا
تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
وجہی

تصور تجھ جواں کا اے صنم سمرن ہوا من کا
سدا دیول کی پوجا کام ہے ہر یک برہمن کا
سراج اورنگ آبادی

ولؔی نے فارسی اصناف و بحور اور اوزان کو ریختہ کے مزاج کے مطابق ڈھال دیا۔فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال سے شاعری کی نئی زبان کا خمیر تیار کیا۔خود بھی نئی ترکیبیں تراشیں،دکنی،شمالی اور فارسی زبانوں کے درمیان ایک ایسا توازن قائم کیا جس سے زبان کا وہ روپ سامنے آیا جسے معیاری زبان کہہ سکتے ہیں۔اس کا اثر یہ ہوا کہ غزل نے بہت جلد اپنا اصل مزاج پا لیا اور اس نے ترقی کی کئی منازل بہت جلد طے کر لیئے۔غزل میں تہہ داری،تخیل ایجاز و اختصار اور استعاراتی نظام،رموز و علائم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ولؔی کے دور میں غزل کے موضوعات میں کافی وسعت آئی۔غزل میں زندگی کے مختلف تجربات واحساسات کو شامل کر کے اسے رنگارنگی عطاء کی۔اس کی خاص بات یہ ہوئی کہ غزل داخلیت کی صفت سے آشنا ہوگئی۔حسن عشق غزل کا موضوع شروع سے ہی رہے ہیں لیکن ولی کا عشق سادہ اور پرکار ہے اس میں پاکیزگی اور ٹھیراؤ ہے۔ڈاکٹر ممتاز الحق کہتے ہیں۔

''ولؔی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کہ اس نے انحطاط پذیر معاشرے میں عیش پسندی کی عام روش کے خلاف عام سطح سے ہٹ کر سوچا۔اور زبان وشاعری کے ذریعہ اس کا اظہار کیا،خیال کی پاکیزگی اور زبان کی صفائی دوسمتوں میں بیک وقت کام کرنا معمولی درجہ کے شاعروں کے بس کا روگ نہیں''۔

(25)(اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل۔ڈاکٹر ممتاز الحق،2004،صفحہ 99)

وؔلی نے غزل میں تصوف وروحانیت کے مسائل بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیئے۔ان میں بعض اشعار اتنی صاف اورواضح زبان میں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بعد کے زمانے میں لکھے گئے۔نمونہ کلام۔

اے رشک ماہتاب تو دل کے صحن میں آ
فرصت نہیں ہے دن کو اگر تو رین میں آ

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

وہ ناز میں ادا میں اعجاز میں سراپا
خوبی میں گل رخاں سوممتاز ہے سراپا

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسےزندگی کیوں نہ بھاری لگے

وہ سیر کووادی میں مائل نہ ہواور نہ
آنکھوں کو غزالوں کی پاؤں تلے مل جاتا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی وکیا مجازی کیا

زندگی جام عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
تک لہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

☆ایہام گوئی کی روایت

وؔلی کے کے زیر اثر جو شاعری کی گئی اس کی نمایاں خصوصیت ایہام گوئی ہے۔ایہام کے معنی یہ کہ وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے اوران دونوں کے معنی میں سے ایک قریب اور دوسرے معنی بعید ہو۔ وؔلی سے متاثر ہو کر آبؔرو، ناجؔی ، یکرنگؔ اور آرزؔو قابل ذکر ہیں۔ان شعراء نے ایہام گوئی اور رعایت لفظی پر زیادہ زور دیا جس کی وجہ سے ان کی غزلوں کی معنویت اور اثر آفرینی کافی متاثر ہوئی۔اور شاعری احساسات اور جذبات کی ترجمانی کے بجائے لفظی گورکھ دھندہ ہو کر رہ گئی۔ابہام گوئی کی ترقی کا سبب سماجی عوامل رہے ہیں کیوں کہ یہ وہ دور تھا جب معاشرہ دورنگی کا شکار تھا۔پرانی اقدار بے اثر ہو گئیں تھیں۔قول وفعل میں تضاد پیدا ہو گیا تھا۔پورا معاشرہ اخلاقی طور پر بہت پست ہو گیا تھا،تصنع ،تکلف ،صنعت گری اور نمائش پر زور تھا۔اس وقت کی معاشرتی زندگی میں گھر سے زیادہ گھر کے باہر کی اہمیت تھی۔اس کا تجزیہ کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔-

''اس تہذیب کے مزاج کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ یہ گھر سے باہر گلی کوچوں میں نکل آئی تھی۔اوراپنا اظہار بازاروں ،میلوں ،کھیلوں ،عرسوں اور ناؤنوش کی محفلوں میں کر رہی تھی بیوی گھر کی چہار دیواری میں بند تھی اور طوائفوں کے کوٹھے کھلے تھے جہاں لاکر رنگ کی محفلیں جمتیں مے نوشی سے کیف وسرور مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا اور طوائفوں کے کھلے اجسام، ناراوااداؤں اور لٹک مٹک سے جنسی جذبات برانگیختہ کیئے جاتے ،فقرے بازی، ضلع جگت لطیفوں اور پھبتیوں سے جام زندگی میں مزا پیدا کیا جاتا۔ایہام اور ریاعت لفظی اور ذو معنی الفاظ اس ماحول میں اوران محفلوں میں زیادہ مزہ دیتے۔جو اس فن میں جتنا طاق ہوتا اتنا ہی کامیاب ہوتا''۔

(26)(تاریخ ادب اردو، (جلد دوم ،حصہ اول) جمیل جالبی ، ہندوستانی ایڈیشن ،صفحہ 191،190)

ایہام گوئی کے چند اشعار ملاحضہ فرمائیں۔

ہنس ہاتھ کو پکڑنا کیسا سحر ہے پیارے (سحر ،صبح)

پھونکا ہے تم نے منتر گویا کہ ہم کو چھو کر

(سحر ، جادو)

کریں جو بندگی ہوویں گنہگار
بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی
آبرو

کیا جانئے وصال تیرا ہو کسے نصیب
ہم تو تیرے فراق مین ائے یار مر گئے
یک رنگ

کیا ہوا خط مرا پڑھتا نہیں
جانتا ہے خوب وہ مضمون کو
شرف الدین

مجھے مت بوجھ پیارے اپنا دشمن
کوئی دشمن بھی ہووے اپنی جاں کا
یک رنگ

☆زبان کی سادگی وصفائی کی تحریک

ایہام گوئی اور تکلف اور تصنع کی جگہ اردو غزل میں سادہ گوئی اور انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی پر زور دینے کا سہرا مرزا جان جاناں کے سر جاتا ہے۔ جان جاناں نے اردو شاعری میں فارسی کی نئی اور خوب صورت ترکیبیں داخل کیں اور زبان میں صفائی اور شگفتگی پیدا کی۔ان کے کلا کی لطافت کا اندازہ ان کے اس بہترین نمونہ کلام سے لگایا جاسکتا ہے:۔

گر گل کو گل کہوں تو تیرے رو کو کیا کہوں
بولوں نگہ کو تیغ تو آبرو کو کیا کہوں

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہو تا چمن اپنا،گل اپنا،باغباں اپنا

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

مرزا کی زبان صاف اور سادہ ہے اب اس میں کافی نکھار اور شائستگی آئی ہے الفاظ کو برتنے کا اچھا سلیقہ ہے۔

مرزا کے بعد انعام اللہ خان نے اس تحریک کی اصلاحات کو پورے طور پر برتا اور اپنے دور کے دوسرے نوجوان شاعروں کے لیئے نمونہ بنے۔تاباںؔ ،فغاںؔ شاہ حاتمؔ وغیرہ اس دور کے بڑے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے زبان کی سادگی وصفائی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔مرزا کی نئ شاعری کی تحریک وقت کی اہم ضرورت تھی۔اس لیئے اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور آنے والے دور کے لیئے نہایت مظبوط بنیاد فراہم کی۔یہ اردو غزل کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اس دور میں میرؔ ،دردؔ ،سوداؔ ،میر تقی میر جیسے شاعر ملے۔

اس دور کی غزل کا بنیادی جذبہ عشق تھا۔عشق کو ایک رویے کی حیثیت حاصل تھی شاعر اپنے سبھی جذبات و احساسات کا اظہار عشق کے حوالے سے کرتا تھا، یہ عشق مجازی بھی تھا اور حقیقی بھی۔عشق یہاں عام انسان کی سطح پر بھی تھا مگر یہاں وصال کے لئے مدھم اور ہجر کے لئے تیز تھی اسکی وجہ معاشرتی پابندیاں اور پردہ کا چلن تھا۔اس لئے غزل کا شاعر اشاروں اور کنایوں میں بات کرتا تھا۔لسانی اعتبار سے غزل نے عوامی زبان سے اپنا رشتہ استوار کیا تھا۔عام بول چال کے الفاظ شاعری میں استعمال کئے جانے لگے تھے فارسی کا استعمال اس حد تک ہی ہوا کرتا جتنا کہ بول چال کی زبان میں ہوتا تھا میر اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں۔

☆میر تقی میر

اردو شاعری کو درد و اثر اور سوز گداز سے مالا مال کرنے والے شاعر میرؔ ہیں ان کی شاعری ایک دکھے ہوئے دل کی آواز تھی۔میر کی شاعری کو المیہ رنگ و آہنگ ان طوفانوں نے بخشا تھا جن سے وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے ماحول دونوں میں گزرے تھے،والد کا سایہ بچپن میں ہی چھن گیا۔رشتہ داروں کی سرد مہری نے دکھوں میں اضافہ کیا۔معاشی وہ سماجی پریشانیاں مستقل آزر تھیں۔اس میں محبت کا غم بھی۔میر کا کمال یہ کہ وہ بڑی سے بڑی بات کو تمام انسانی جذبوں کے ساتھ ملا کر بیان کرتے ہیں اس وجہ سے ان کا غم ہمارا غم بن جاتا۔وہ فکر و خیال کو بھی احساس و جذبہ میں منتقل

کر دیتے ہیں یہی وجہ ہیکہ میؔر کے اکثر اشعار سے ہم معنی سمجھے بغیر بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔

کیا جانوں دل کو کھینچتے ہیں کیوں اشعار میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

نازکی ان کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب ایک سانحہ سا ہو گیا

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

میر کی شاعری درد انگیز ضرور ہے لیکن زہرناک اور مردم بیزار نہیں۔ان کو انسان کی عظمت پر بھر پور بھروسہ ہے اور اس کو وہ سہل چیز نہیں سمجھتے یہ عرفان ان کو تصوف کے مثبت پہلوؤں سے حاصل ہو اہے میر ناکام ہوتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے ان کے ہاں مصیبت میں استقامت ہے اور محرومی میں غیرت اور حمیت۔ان کے کلام میں درد کی لو اور انسانیت کی شبنم کا پرتو ہے۔ان کے ہاں وہ جذبات ہیں جو شاعری کی جان ہیں اور جن کے متعلق ارسطو کہتا ہیکہ ''جس میں سوز و الفت نہیں وہ انسان لازمہ انسانیت سے خارج ہے''اس کا دوسرا نام میر کے الفاظ میں دردمندی ہے۔میؔر نے غم عشق اور غم آفاق کو مردانہ وار اٹھایا ہے وہ ڈوب کر ابھر سکتا ہے اور مرنے کے بعد آگے چلنے کا عزم رکھتا ہے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام لیا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل ایک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

لے سانس بھی آہستہ بھی کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشہ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

میر کے کلام کی دل آویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہیکہ وہ اپنے واردات اور حالات کو ایسے پرتاثیر دلنشیں اور انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا اور بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ان کے کلام میں جنس کا طوفان، طلاطم اور ان کی محبت میں شورش و ہنگامی نہیں ہے۔اعتدال، احساس اور اعتدال بیان ہے دھیمی دھیمی آنچ اور میٹھا میٹھا درد ہے اسی نے ان کے لب ولہجہ میں بلند سنجیدگی اور ماورائی سادگی پیدا کر دی ہے۔اور باوجود ہجوم غم کے ان کی شاعری کو ایک اثباتی میلان اور تاب وتوانائی بخشتی ہے جو زندگی کی ظلمت میں ہمارا بڑا سہارا ہے۔ان کے کلام کا نمونہ ملاحضہ فرمالیں کتنی معمولی بات کہی ہے لیکن سادہ بلیغ اور موثر انداز میں۔

کہتا ہے دل کہ آنکھ نے مجھ کو کیا خراب
کہتی ہے آنکھ یہ کہ مجھے دل نے کھو دیا

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اس شور سے میر روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہے کو روتا رہیگا

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

☆سوداؔ

اکثر نقادسودا کی غزل گوئی کا مقابلہ میر سے کیا کرتے ہیں لیکن یہ خیال درست نہیں۔سودا نے اپنی قادرالکلامی،زور بیان اور زبان دانی سے اردو غزل کو نیا رنگ وآہنگ دیا۔ان کی غزلوں میں شگفتگی،نشاط وکیف اورطنز ومزاح کی چاشنی ہے۔جذبہ واحساس کے مقابلے میں ان کے یہاں تخیل کی بلند پردازی اورمضمون آفرینی زیادہ ہے۔

سودا کا بڑا کارنامہ یہ ہیکہ انہوں نے فارسی روایت کواردو میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کےعلاوہ ان کی غزلوں میں بیک وقت کئی رنگ ملتے ہیں۔اس کا فائدہ آنے والی نسلوں کو ہوا۔سوادغزل کے مزاج سے واقف ہیں اورانہوں نے حتی الامکان غزل کے موضوعات کوغزل کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔مگراپنی افتادطبع کے لحاظ سے چونکہ سودابیروں بیں ہیں اوران میں بانکپن اورسرمستی،شگفتگی اوررعنائی ہےاس لیئے جب عام طور پران کا مقابلہ میر سے کرتے ہیں توانہیں مایوسی ہوتی ہے کیوں کہ میر دروں بین ہے۔سوداکےکلام کانمونہ ذیل میں ہے۔

جھگڑا تو حسن و عشق کا چلتا پل کے بیچ
گر محکم ہیں قاضی کے تو روبرو نہ ہو

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفت جاں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریباں سحر بھی

اس دورکی اردوغزل میں سراپا نگاری کا رجحان دکنی غزل کے مقابلے میں کم ہوگیا۔شاعروں نےعشق کے جذبات اور کیفیات کی موثر انداز میں ترجمانی کی اسی کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی کا بھی رجحان فروغ پایا،غزل کے موضوعات میں وسعت ہوئی،حیات وکائنات کے گونا گوں مسائل پر شعراء نے اپنے نتائج فکرکوتجربات ومشاہدات کی آنچ میں تپا کرشعر کے سانچہ میں ڈھالا۔غزل میں تصوف اوراخلاق کے مضامین بھی باندھے گئے اس دورکی غزلیہ شاعری کے رنگ اورمزاج کا اندازہ میرؔ سوداؔاوردردؔ کی شاعری سے لگایا جاسکتا ہے۔

☆خواجہ میر درد

میر درد اپنے دور کے دوسرے شعراء کی طرح صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے تصوف تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اس بحر کے شناور تھے۔ان کی شاعری پر بھی تصوف کا گہرا اثر پڑا۔ان کی شاعری واردات و کیفیات کی شاعری ہے۔ان کی نگاہ ظاہر سے کم الجھتی ہے۔وہ خارجیت پسندی کے بجائے داخلیت پسندی کے دلدادہ ہیں۔درد کے یہاں عشق ایک اعلیٰ جذبہ ہے۔جس کے ذریعے ایک انسان حقیقت تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔عشق اور تصوف کی آمیزش نے ان کی شاعری کو نئے ذائقہ سے آشنا کیا۔غم کی تلخی کم اور سرور پیدا ہو گیا ہے۔

ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے
کوئی اس بات سے آگاہ نہ ہو

گزرا ہے بتا کون صبا آج ادھر سے
گلشن میں تیرے پھولوں کی یہ باس نہیں ہے

اندازہ وہی سمجھے میرے دل کی آہ کا
زخمی جو ہو چکا ہو کسی کی نگاہ کا

ازیت مصیبت ملامت بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

دردؔ نے اردو غزل کو نئے استعارے نئی علامتیں دیں ہیں،ان کی شخصیت کی طرح ان کا لب ولہجہ بھی بہت معصوم اور پرتاثیر ہے۔ان یہاں ایسے نشتر کثرت سے ملتے ہیں جو جذبہ کی شدت کی وجہ سے میر کے نشتروں کے قریب پہنچ گئے ہیں۔یہی نشتریت اور اثرانگیزی ان کی غزلوں کو روایتی سطح سے ہٹا کر تغزل کے بلند مقام تک لاتی ہے۔ایجاز کو غزلیہ شاعری میں ایک اہم مقام حاصل ہے کم لفظوں میں زیادہ باتیں کہنا ایک فن سمجھا جاتا ہے۔رمزیت واشاریت اس لحاظ سے غزل کی جان ہے۔درد کی شاعری میں رمزیت واشاریت کا حسن اپنے شباب پر ہے جسکی وجہ سے غزل کی مجموعی فضا میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اور معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

بے وفائی پر اس کی دل مت جا
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل
اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتہ وضو کریں

جان سے ہوگئے بدن خالی
جس طرف تونے آنکھ بھر دیکھا

ان نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر

ایہام گوئی کی تحریک پھراس کا ردعمل پھراس کے نتیجہ میں میر وسودااوردرد کے دور تک غزل کو یکے بعد دیگرے تین ادوار سے سابقہ پڑااسی لئے اٹھارہویں صدی غزل کی ترقی میں معاون ثابت ہوئی۔ یہ اردوغزل کی خوش قسمتی ہے کہ اس کواس دور میں آبرو،مظہر جان جاناں،شاہ قائم،میر،درداور سودا جیسے عظیم فنکار نصیب ہوئے۔دہلی کے بعد لکھنو شعر و شاعری کا مرکز بن گیا۔خان آرزو،فغان،سودا،میر،میرسوز،جعفرعلی حسرت،جرات،انشاءمصحفی اوررنگین وغیرہ لکھنوآئے۔آزادی اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے تعیش پسندی عام تھی۔نوابوں اور وزیروں کے ساتھ عوام بھی دادعیش دے رہے تھے۔بازاری عورتوں اورطوائفوں کی اس ماحول میں بڑی اہمیت تھی۔معاشرہ میں نسائیت سرایت کرچکی تھی۔مردانہ جذبات وخیالات کم زور پڑتے جارہے تھے۔تکلف تصنع اور بناوٹ تہذیب کے اہم عناصر بن گئے تھے۔اس ماحول کا اثر شاعری پر بھی پڑا۔جذبات کی پاکیزگی،متانت اور سنجیدگی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔شاعری میں خارجی عناصر کا عمل دخل بڑھ گیا۔معاملہ بندی،جنسی لذت پسندی عام ہوگئی۔ریختی کی ایجاد ہوئی۔جس میں عورتوں کے جذبات کی عورتوں کی زبان میں عکاسی کی جاتی تھی۔اس کا مقصد جذبات کو برانگیختہ کرنا تھا۔اس کے ذریعے عورتوں کی زبان اورمحاورے شاعری میں داخل ہوگئے۔ یہاں کی شاعری دہلی کی شاعری سے مختلف تھی لہٰذااس کولکھنویت کا نام دیا گیا۔غزل کے نمونے اس وقت سامنے آتے ہیں جب داخلیت اور خارجیت اورفکر و جذبہ کے درمیان توازن اورہم آہنگی قائم رہے۔

اردوغزل نے نہ توسپاٹ بیانات کوقبول کیاہےاورنہ صنائع بدائع سے بوجھل فنکاری

کو لکھنوی رنگ شاعری کی شناخت جن شعراء کی غزل گوئی سے ہوتی ہے ان میں جرات،انشاء،رنگین،آتش،ناسخ اہم ہیں۔

مصحفی کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔جرات کا بڑا کارنامہ یہ ہیکہ انھوں نے غزل میں ذاتی تجربات کو داخل کیا سنی سنائی باتیں اور فرضی واقعات ان کے یہاں نہیں ملتے۔سچے عشقیہ جذبات کی بھی ان کے یہاں کمی نہیں۔

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ ان کا جوبن وہ کہ گدرایا ہوا

گو وہ نہ بوسہ دیوے لیکن اس آرزو میں
کس کس مزے کی باتیں اپنی زباں پر ہیں

یاد کیا آتا ہے وہ میر لگے جانا اور آہ
پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائیگا

مصحفی اس دور کے اہم غزل گو شاعر ہیں۔ان کی شاعری ناکام آرزوؤں اور حسرتوں کی شاعری ہے فصل بہار آئی بھی چلی بھی گئی مگر قفس سے آزادی نصیب نہ ہوئی۔انہوں نے قلبی واردات کی ترجمانی اعتدال اور سنجیدگی کے ساتھ کی ہے۔سوز و گداز ایک طرح کا دھیما پن شیرنی اور گھلاوٹ ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔

جتنی الفت زیادہ ہوتی ہے
اتنی حسرت زیادہ ہوتی ہے

جو اے مصحفی راتوں کو اس شدت سے روئے گا
تو میری جاں پھر کیوں کر کوئی ہمسایہ سوئے گا

کبھی جو یوں بھی ملو تو مہربانی ہے
غرض وہ وعدہ وصل کا تو درکنار رہا

عشق ہے ہم کو اب تک تجھ سے
اپنی خواہش کو نہاں رکھتے ہیں

تم رات وعدہ کر کے بھی جو ہم سے چلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

☆ناسخ لکھنوی

اردو غزل اپنے ارتقائی سفر میں جس طویل شاہ راہ سے گزری ہے ناسخ اس کی منزل مقصود نہ ہونے کے باوجود ایک ایسے اہم سنگ میل ضرور ہیں جہاں آ کر کاراون غزل نے نہ کچھ عرصہ تک قیام کیا اور دم لیا تھا بلکہ منزل مقصود کے لئے نیا رخت سفر حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس رہ گزر کا پتہ پالیا تھا جس سے گزر کر اردو غزل نے غالب تک رسائی پائی۔ اور غالب کی رہنمائی غزل کو کس حد تک راس آئی یہ دانشور بہتر جانتے ہیں۔

لکھنوی شعراء میں ناسخ و آتش کا نام اکثر ایک ساتھ آتا ہے۔ انہیں لکھنوی رنگ کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔ ناسخ کی حیثیت ایک استادِ سخن کی تھی۔ انہوں نے زبان و شاعری کی اصلاح کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور اپنے عہد کی سماجی اور معاشرتی رجحانات کو اس طور پر اپنی شخصیت اور شاعری سے ہم آہنگ کیا ہیکہ وہ اس دور کے نمائندہ شاعر بن گئے۔ مضمون آفرینی، صنعت گری اور منطقی استدلال پر اپنی غزلوں میں توجہ دی جس سے جذبہ و احساس دب کر رہ گئے۔

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

ہائے قاصد پھرتے پھرتے گھس گئے مثل قلم
خط وہ لیتا ہی نہیں کیا فائدہ تحریر سے

مر گیا ہوں دیکھ کر جلوہ رخ پر نور کا
میری لوحِ قبر کو زیبا پتھر طور کا

خواب میں وہ آنے کا کیوں نہ اب کرے وعدہ
یعنی کب جدائی میں مجھ کو نیند آنی ہے

رشک سے لیتے نہیں نام کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اسے ہم یاد کرتے ہیں

اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں
خشک ہوجائے جو پانی تو پیدا ہوا

☆آتش لکھنوی

عام شعراء کی طرح آتش کی شاعری بھی مضامین حسن وعشق کے ارد گرد گھومتی ہے۔ وہی ناز و نیاز، ہجر ووصال، خواہش دید اور تمنائے وصال جیسے موضوعات ان کے اشعار میں بھی ملتے ہیں لیکن یہاں بھی ان کا نقطہ نظر سب سے جدا ہے۔ ان کے یہاں دہلی کے شعراء جیسا افلاطونی عشق یا لکھنوی شعراء کی ہوسناکی اور جنسیت زدگی نہیں ہے۔ عشق سے متعلق وہ بہت صحت منداور مثبت زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کا محبوب کوئی ماورائی مخلوق نہیں بلکہ گوشت پوست کا ایک انسان ہے جس کے سینہ میں ایک دل دھڑکتا ہے۔ اسی وجہ سے آتش کے عشقیہ مضامین میں بڑی گرمی حرارت اور فطری پن ہے۔ آتش ایک آزاد فطرت کے مالک اور ہر حال میں مست رہنے والے انسان تھے۔ ان کی اس مخصوص فطرت اور ذہنی ساخت نے ان میں ایک قلندرانہ شان پیدا کر دی ہے۔ ان کی شاعری میں بے نیازی، استغنا رندی ودرویشی اور دیگر مسائل تصوف کا بیان کثرت سے ملتا ہے۔

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایا بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگو

دکھا کے چہرہ روشن وہ کہتے ہیں سر شام
وہ آفتاب نہیں ہے جسے زوال ہوا

پھر گئے ہیں معرکوں میں مجھ سے تلواروں کے منھ
سخت جانی نے مری توڑے ہیں خنجر سیکڑوں

رہی ہیں آنکھیں بند تصور میں یار کی
نارنگہ سے اپنے بندھا ہے خیال دوست

آتش کی غزل گوئی ایک مسلسل ریاضت ہے، سعی ہے جستجو ہے، انتشار میں وحدت دریافت کرنے کی کوشش ہے۔ نفس کوشی اور نفس کشی ہے۔ عالم کثرت میں کارزار ہے، احساس وتخیل کو جگائے رکھنے کی اور جگمگانے کی پیکار ہے۔ پوری مادی تجربات کو ذہن ودل میں سمیٹ کر مراقبہ کی سعی مسلسل ہے۔ آتش غزل کے وفادار تھے۔ ان کے کلیات میں سوائے غزلوں کے کسی دوسری صنف سخن کا نشان

تک نہیں ہے۔

کام ہے شیشے سے ہم کو اور نہ ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شراب روح پرور سے غرض

خوشبو سے معطر ہو رہا ہے دماغ جان
چلتی ہے کس طرف سے ہوا کچھ نہ پوچھئے

جب بھی دیکھئے کچھ اور ہی عالم ہے تمہارا
ہر بار عجب رنگ ہے ہر بار عجب روپ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرہ خون نہ نکلا

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

☆ذوق۔غالب اور مومن کا دور

غزل کا یہ دور بلندمتنوع مضامین،نازک خیالات،نیا انداز بیاں،معنی خیز تراکیب،تشبیہات واستعارات کا دور تھا۔مومنؔ ذوقؔ اور غالبؔ جیسے فنکاروں نے غزل کواپنی منزل کی طرف گامزن کیا۔اورغزل نئی بلندیوں کی جانب گامزن ہوئی۔غزل کا یہ دورآج بھی اردوغزل کا گراں بہا سرمایہ ہے۔یہ عہد سیاسی طور پرمغلوں کے زوال کا عہد ہے۔افراتفری،معاشی ابتری کی وجہ سے تہذیبی وارتقائی قدروں میں تبدیلیاں رونماں ہورہی تھی دنیائے سیاست بربادادور دنیائے ادب آباد ہوکر پوری آب وتاب کے ساتھ اپنی بہار دکھارہی تھی۔

☆ذوق

بچپن ہی سے ذوق کی طبیعت شعر وسخن کی طرف مائل تھی۔انہوں نے شعرگوئی میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ انہیں استادفن کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ذوق کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ زیادہ تر قصیدے ملتے ہیں۔ان غزلوں میں اختصار اور برجستگی ملتی ہے۔شدت جذبات اورتہہ دار تشبیہات سے ان کا کلام خالی ہے عام طور پر ہر بول چال کی سہل زبان استعمال کرتے ہیں۔اسی لئے ذوق کے زیادہ تر اشعارآج بھی لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہیں حتیٰ کہ زبان زدہو چکے ہیں۔

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار اسے یا روکر گزار دے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دہلی کی ادبی فضا میں ذوق کا دور ادبی گرہ بندیوں کا دور تھا۔ادبی معرکوں اور شاعرانہ مقابلوں میں ایک گروہ دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ایسے میں زبان و بیان کو معیاری بنانے پر پوری توجہ صرف کی جاتی تھی،لفظوں کی تراش خراش،دوغزلہ،سہ غزلہ،اور جو غزل کہتا عام تھا۔وہ قادر الکلام شاعر تھے۔زباں کو سادگی اور صفائی۔بیان کی پختگی،محاورات کا برمحل استعمال،بھاری قافیوں میں بے شمار اچھے شعر نکالنا،نئے نئے مضامین پیدا کرنا ذوق کا بڑا کارنامہ تھا۔وہ اخلاقی مضامین اور تصوف کے مسائل کا بیان بھی کرتے تو اتنے جاذب نظر ہوتے۔کہ مصنوعی پن کا احساس نہیں ہوتا۔

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

مقدر ہی یہ گر سود زیاں ہے
تو ہاں ہم نے کچھ کھویا نہ پایا

☆مرزا اسداللہ غالب

دیکھنا تقریر کی لذت جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گو یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب نے زندگی کے نشیب وفراز،حکومت کے بکھرے ہوئے شیرازے قدروں کی شکست وریخت اور زندگی کی متلون مزاجی کے مناظر دیکھے تھے۔اور گوں ناگوں تجربات سے اپنی جھولی بھری تھی اوراس طرح وہ حیات کے مزاج شناس بن گئے تھے۔غالب کے دیوان میں انسانی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کی موثر تصویر نظر آتی ہے۔غالب کی شاعری میں تہذیبی بصیرت برابر جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔غالب کے اشعار زندگی کی آگہی اور بسیار شیوگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔غالب نے عصری اساس کی تخلیقی بازیافت کی ہے،ان کے ایسے اشعار عصریت کی سطح سے بلند ہوکر آفاقی تجربے کا احساس دلاتے ہیں۔غالب جس تہذیبی ماحول کے پروردہ تھے اس کی کچھ اخلاقی قدریں بھی تھیں۔غالب اپنی افتادِطبع اپنی آزادخیالی کے باوجود اخلاقی اقدار کی پاسداری اوران کی اہمیت کے قائل تھے۔ان کا ذہن احترام آدمیت، کشادہ قلبی، وسعت نظر،صلحِ کل اوراعلیٰ اقدار کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔غالب کی شخصیت کی تشکیل جس معاشرے میں ہوئی تھی اس کا ایک مخصوص ضابطہء اخلاق تھا۔غالب کا ایک آفاقی پہلو یہ بھی ہیکہ انہوں نے انسان کی سربلندی کا احساس دلایا اورفرد کی عملی زندگی میں بے ریائی،خلوص،صداقت پسندی،تسلیم ورضاء،عفو ودرگزر،اورانسان دوستی کے جذبات پروان چڑھائے۔

اقرار میں کہاں انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غم ہستی کا کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رنج کا خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑی مجھ پر کہ آساں ہوگئی

آزاد رہ ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اسقدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطاء کرے کوئی

غالب کے یہاں شاعری کا زیادہ تر حصہ حسن وعشق کے مختلف واردات و کیفیات سے متعلق ہے لیکن غالب اپنے کاروبار عشق کے لئے دنیا سے دور یا افق کے پار نہیں جاتے۔ وہ اسی دنیا میں رہتے ہیں وہ زندگی کے مختلف مسائل اور حالات کے تقاضوں سے پوری واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ غالب غم روزگار سے متاثر ہوکر جن احساسات کا اظہار کرتے ہیں یوں تو وہ ان کے ذاتی تجربوں کا اثر ہے لیکن غالب کا یہ کمال ہیکہ ان کا ذاتی تجربہ ایک دور کے تجربہ کی آواز بن گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں۔

''لوح سے تحت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں نہیں، کونسا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار موجود نہیں ہے''۔

غالب نے شاعری کو سطحی جذباتیت، غیر صحت مند رومانیت، اور لفظی بازی گری کے تنگ دائروں سے نکال کر زندگی کے تقاضوص سے قریب تر کیا۔ غالب انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت۔ جسمانی تقاضوں اور اس کے فکر وشعور کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ محبوب سے عجز و نیاز، شوخی وچھیڑ چھاڑ، خودداری غرض یہ کہ تمام مضامین سمٹ آئے ہیں۔ اور ان تمام کیفیتوں کا اظہار اپنے مخصوص لب ولہجہ میں کرتے ہیں۔ نمونہ کلام دیکھئے۔

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کوئی مرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھرنہیں آتی

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں میرا بھلا نہ ہو

غالب کا کارنامہ یہ ہیکہ ان کے یہاں غزل اپنی تمام رنگارنگی کے ساتھ موجود ہے اس میں رموز ونکات اور تہہ داری بھی۔مضمون آفرینی کا کمال بھی ہے اور ترکیب سازی کا جوہر بھی۔غرض یہ کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک کامیاب غزل کے لئے جس لفظ و معنی کے حسین پیوند، جذبہ کی سچائی اور غنائی کیفیت، خون جگر اور لطف نظر کے امتزاج اور ایک خاص قسم کی نغمگی اوار موسیقیت کو شرط قرار دیا ہے۔غالب کی غزلیں اس کی عمدہ مثال ہیں۔اسی لئے غالب کو ہمارے دور کا ہر دلعزیز اور آفاقی شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

☆مومن خاں مومن

مومن کی غزل کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے اجزائے ترکیبی میں تغزل داخلیت، نازک خیالی، اسلوب کی جدت، پیچیدہ بیانی، اور سادگی شامل ہیں، ان کی غزلیں بانکپن، شگفتگی اور رنگینی کے اعتبار سے ایک سدا بہار عظمت کی حامل ہیں۔فکر وفن کا حسین امتزاج ان کے ہاں نظر آتا ہے۔انہوں نے محبت کی مختلف کیفیات وارادت اور گوں ناگوں تجربات کا جس کامیابی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے اس کی مثال غالب کے سوا کسی اور شاعر کے یہاں شائد ہی مل سے۔ان کی غزلوں کا یہ رنگ شروع سے آخر تک قائم رہا۔ان کی غزلوں میں ان کی شخصیت کا بھرپور اظہار نظر آتا ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جو حجاب نہ ہوئے تو جان جائیگی
کہ راہ دیکھی ہے اس نے حیا آنے کی

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگا ہ میں

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا ہوتا

محفل میں مرے نام کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامئی عشاق کا اعجاز تو دیکھو

وصل کی شب شام میں سوگیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہونگے

مومن کی غزلیں زندگی کی تاریک پہلو کے بجائے روشن پہلو کی ترجمان ہیں۔ان میں زندگی سے بھرپور ایک نشاطیہ آہنگ ملتا ہے۔مومن نے اپنے طرز ادا کو موثر بنانے میں طنز سے بڑا کام لیا ہے۔ان کے طنز میں چھیڑ چھاڑ اور البیلا پن ہے۔اسلوب کو سنوارنے اور نکھارنے میں مومن کی زبان دانی اور لفظیات سے واقفیت کا بڑا ہاتھ ہے۔نئ نئ ترکیبیں استعمال کرنے میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔غرض مومن کی غزلیں اردو شاعری کا بہترین ورثہ ہیں۔وہ اپنے مخصوص شاداب اور نشاطیہ لہجے،فنی رچاؤ اور اپنے صحت مند تصور عشق اور انسانی احساسات ونفسیات کے تجزیے سے اپنی غزلوں میں جس طرح ہمہ گیری اور آفاقیت پیدا کرتے ہیں وہ انکی غزلوں کو زندہ رکھنے کے لیئے کافی ہے۔

مومن کے کلام کا عمدہ نمونہ ملاحضہ فرمائیں۔

تھے وعدے سے پھرانے کے خوش، یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

قیس کی دیوانگی میں عقل کیا حیران ہے
مجھ کو وحشت ہو گئی تصویر لیلیٰ دیکھ کر

میں بھی خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا،نباہ نہ کی

میرے آنسو نہ پوچھنا دیکھو
کہیں داماں تر نہ ہو جائے

غیروں کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے

☆غزل کے قدیم موضوعات

اردوغزل کی خصوصیات اورارتقاء کا جائزہ لینے کے بعد آیئے قدیم اردوغزل کے موضوعات کا تذکرہ کرلیں تا کہ جدیداردوغزل کوان کے اثرات اور موضوعات کی وسعت کا اندازہ ہو سکے۔عربی اور فارسی غزل سے قدیم اردوغزل کو جوموضوعات وراثت میں ملے تھےاوردوغزل نے ان موضوعات کا استعمال کرتے ہوئے اورکن جدید موضوعات کوغزل میں داخل کیا دیکھتے ہیں۔

اردوغزل کے موضوعات پر تذکرہ کرتے وقت ہمیں ناقدین کی جانب سے تین قسم کے نظریات ملتے ہیں. ایک نظریہ کچھ ناقدین مانتے ہیں کہ غزل کا کوئی موضوع نہیں ہوتا۔دوسرے وہ ناقدین جوغزل کومحض عشق ومحبت مانتے ہیں اس میں دو ذیلی نظریات شامل ہیں ایک محض جنسی محبت کو ماننے والے دوسرے وہ جوعشق حقیقی کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔اور تیسری قسم ناقدین کی یہ ہیکہ غزل کو کچھ خاص خاص موضوعات کے دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں ہر قسم کے مضامین شامل کئے جاسکتے ہیں۔

زمانے قدیم کے شعرا عشق ومحبت کوغزل کا موضوع مانتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہی وہ عناصر ہیں جن سے غزل بنتی ہےاورلوگ غزل کے لغوی معنی (عورتوں سے گفتگو یا عورتوں کی گفتگو)

پر زور دیتے ہوئے اس کے اصطلاحی معنی بھی تقریباً طے کر چکے تھے۔اور وہ غزل میں محبت اوراس کے متعلقات کو ہی غزل میں شامل سمجھتے تھے۔ یہ وہی شعراء ہیں جو محبت کے جذبہ سب سے اہم جذبہ مانتے ہیں اوران کا یہ بھی خیال ہیکہ یہ جذبہ دوسرے تمام جذبات پر حاوی ہوتا ہے اسی لیئے یہ لوگ عشق ومحبت کو ہی غزل کا اہم ترین موضوع مانتے ہیں۔اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ عشق ومحبت کا دائرہ محدود نہیں۔محبت سینکڑوں قسم کی ہوسکتی ہے انسان سے انسان کو محبت سے لیکر انسان کی خدا سے محبت تک۔محبت کے بے شمار رنگ ہیں مگر کچھ لوگ جنسی محبت یعنی مرد اور عورت کی محبت کو ہی غزل کا موضوع مانتے ہیں کچھ لوگ جب اور آگے بڑھے تو انہوں نے انسان کی خدا سے محبت کو بھی غزل کا موضوع مان لیا اور اسے عشق حقیقی کا نام دیا۔دراصل ان دو رشتوں کے علاوہ دنیا میں اور بے شمار رشتے ہیں جن میں محبت کا جذبہ ایسے ہی کارفرما ہوتا ہے۔آدمی کی اپنے والدین سےمحبت ، بھائی ، بہن، دوست ،عزیز و اقارب سے محبت ، جانوروں سے محبت، وطن سے محبت ،قوم سے محبت ،قدرتی مناظر سے محبت، وغیرہ وغیرہ۔لیکن قدیم غزل میں جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش اور خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ یوسف حسین کا بھی عشق و محبت کو ہی غزل کا اہم ترین موضوع مانتے ہیں۔مگر وہ عشق کے وسعت کے قائل ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔

''غزل گوشاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔زندگی نام ہے علائق کا جہاں تعلق ہوگا وہاں جذبہ ہوگا اور جہاں جذبہ ہوگا وہاں کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہوگا۔جس طرح فطرت کے مظاہر اوران کی قوتیں علائق کی زنجیروں میں بندھی ہوتی ہیں اسی طرح زندگی بھی تعلقات کی سنہری ڈوریوں میں جکڑی ہوتی ہے تعلق۔فطری بھی ہے اور معاشرتی بھی''۔ (27) (اردوغزل یوسف حسین خان۔1953 صفحہ68۔69)

غزل میں جنسی محبت کے طرفدار شعراء یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ محبت ایک فطری جذبہ ہے ہر انسان کو اس سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ جذبہ تمام دوسرے جذبوں پر حاوی ہے اس لیئے غزل میں اس کا اظہار ہوتا ہے تو یہ فطری ہیا ور غزل میں اپنے جذبات کو جگہ ملنی چاہیئے ۔ان دلائل کے مقابلے میں جب ہم عشق حقیقی کے طرفداروں کی رائے پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ عشق حقیقی کو ہی اہم مانتے ہیں ان کے خیال میں جذبہ کی سچائی اور خلوص عشق حقیقی میں ہی ممکن ہے۔شبلی نے دور اول کی غزل کا جائزہ لیتے ہوئے لکھاہیکہ غزل نے ایک مدت تک کوئی نمایاں ترقی نہیں کہ

''غزل کی تحریک عشق ومحبت کے جذبات سے ہوتی ہے۔لیکن ایران میں مدت تک جنگی جذبات کا زور رہا۔غزل کی ترقی کی تاریخ تصوف سے شروع ہوتی ہے۔تصوف کا تعلق تمام تر واردات اور جذبات سے ہے اور اس کی تعلیم کی پہلی ابجد عشق ومحبت ہے''۔

(28)(شعرالعجم (حصہ پنجم) شبلی نعمانی۔طبع چہارم،1957 صفحہ،36)

یہ طے رہا کہ عشق ومحبت اور غزل لازم وملزوم سمجھے جاتے ہیں۔بعض کے نزدیک تو اگر غزل میں حسن وعشق کو ذکر نہ ہو تو وہ غزل ہوتی ہی نہیں۔اس سے کسی کو انکار نہیں کہ عشق ومحبت غزل کا بڑا موضوع ہے۔اس کے علاوہ اگر ہم غزل کی روایت پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ہم کوئی بھی بات کریں زبان وہی استعمال کرتے ہیں جو عاشق ومعشوق غزل میں کرتے آئے ہیں۔

حسن وعشق کے تعلق اور اس سے متعلق تمام واردات وکیفیات کا منبع جذبہ عشق ہے عشق ایک فطری جذبہ ہے اور یہ دوسرے تمام جذبات پر حاوی ہے اس میں بلا کی شدت اور شورش ہے یہ دل میں ایک خاص ذوق وشوق پیدا کرتا ہے۔اس کے تحت انسان سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔اس کی تڑپ بے چینی اور جوش کا مقابلہ کسی دوسرے جذبے سے نہیں کیا جا سکتا۔شبلی نعمانی کا خیال ہیکہ۔

''عشق کی منزل اگرچہ دور دراز ہے۔اور تمام عمر صرف کرنے کے بعد بھی یہ یہ راہ طے نہیں ہو سکتی سینکڑوں نئی نئی وارداتیں اور مقامات پیش آتے ہیں رنج وحسرت،جوش وضبط،وصل وہجر،گلہ شکوہ،صبر وبے قراری،مستی وہشیاری ان سب مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے لیکن کوئی حالت لطف ومزے سے خالی نہیں ہوتی''۔

(29) (شعرالعجم (حصہ پنجم) شبلی نعمانی۔طبع چہارم،1957 صفحہ،84)

شبلی نعمانی کے اس خیال سے ظاہر ہیکہ غزل کا اصل موضوع حسن وعشق ہے اس کے ذیلی موضوعات کی غزل میں بھر مار ملے گی۔عشق کی مختلف واردات کا قدیم شعراء نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے اس میں اور آج کی عشقیہ شاعری میں زبان کے فرق کے علاوہ زیادہ فرق نہیں آئے گا۔وہ تمام جذبات جس سے عاشق دوچار ہوتا ہے اس کی تمام تر کیفیتیں،داخلی اور ظاہری صورت میں اردو غزل میں ظاہر ہوتی ہیں اور ان کا مطالعہ کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔آیئے حسن وعشق کی مختلف واردات کا تذکرہ شعراء نے اپنی زبان شاعری میں غزل کے توسط سے کس طرح ادا کیا اس پر نظر ثانی کریں:۔

محبوب کا انتظار کرنے میں عجیب سا لطف ہے۔

محبوب کا انتظار کرنے میں عجیب سا لطف ہے۔

جو غم بے اثر نہ ہو جو شب بے سحر نہ ہو
وہ غم انتظار کب و شب انتظار کیا
فانی

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
غالب

محبت میں دیوانگی کا عالم ہو جاتا ہے اور سوائے محبوب کے کچھ سمجھ نہیں آتا۔

کبھو رونا کبھو ہنسنا کبھو حیران ہو رہنا
محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے
سودا

پہلے تو دیوانگی کا عالم اس پر محبوب نے اعتبار کو چکنا چور کر دیا۔

پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
غالب

محبوب کے بے وفائی سے دل کا ٹوٹ جانا۔

بس وعدہ وصال سے کم دے فریب مجھے
آتے ہی مجھ کو تیرا بہت اعتبار ہے
میر

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا
داغ

محبت میں محبوب سے کوئی اور ملے تو اس کی حسد و جلن عروج پر ہوتی ہے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھا م لیا

میر

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھ کو غیر کے پاس
پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

سودا

معشوق کو راحت میسر ہو اسلئے حضرت ناصح اور واعظ کا تذکرہ۔

ناصح ہے طعنہ زن مری ناکامیوں پہ کیا
دل جوئیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا

مومن

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

غالب

غم عشق کو بھلانے بزم مئے کا سہارا۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

غالب

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پیوں تو مزہ ہے شراب کا

میر

محبوب کی محفل میں رسوائی کا ذکر۔

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سائے سے مرے وحشت اے رشک پری اتنی

مومن

نکلنا خلد سے آدم کا تو سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کے ترے کوچے سے ہم نکلے
غالب

محبوب کی ادائیں شوخیاں وشرارتیں۔

ہم نشیں پوچھو نہ اس شوخ کی شوخی مجھ سے
کیا کہوں تجھ سے غرض جی کو مرے بھاتا ہے
درد

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا تمہاری نگاہ میں
داغ

محبوب کی حیا، حجاب وشرم کا تذکرہ۔

اظہار محبت پر اس طرح وہ شرمائے
سب ان کی حیا میری آنکھوں میں اتر آئی
جذبی

جو بے حجاب نہ ہوئے تو جان جائیگی
کہ راہ دیکھی ہے اس نے حیا آنے کی
مومن

محبوب کی بے وفائی پر اسے بھولنے کی کوشش میں یاد کرنا۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
غالب

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے مٹایا نہ جائے گا
غالب

محبت میں اٹھتے شدید جذبات کا بیان۔

دل ہی تو ہے سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں
غالب

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
آتش

عشق کی شدت میں گھبرا کر مر جانا۔

ہوگی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی
میر

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
ذوق

محبت کی راہ کانٹوں سے بھری ہے۔

رسوائیاں اٹھائیں جور و عتاب دیکھا
عاشق تو ہم ہوئے پر کیا کیا عذاب دیکھا
درد

غم ہستی کا کس سے ہو جز مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
غالب

وصل وہجر کی داستان۔

وصل ہجراں میں جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
میر

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
غالب

محبت میں خاموشی اختیار کرنا۔

اب غرض خامشی ہی بہتر ہے
کیا کہوں تجھ سے ماجرہ قاصد
میر

لوگ کہتے تھے چپ ہے تجھے
حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا
داغ

محبت بھرے خطوط میں معشوق کا ذکر۔

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں
غالب

راز نہاں زبان اغیار تک نہ پہنچا
کیا اک بھی ہمارا خطا یار تک نہ پہنچا
مومن

معشوق کے بغیر صبر و سکون حاصل نہیں۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں ہو گئے ناچار جی سے ہم
مومن

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
غالب

محبوب کا وعدہ خلافی کرنا:۔

تیرے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جاں جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جائے اگر اعتبار ہوتا
غالب

غضب کیا ترے وعدے پر اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

تنہائی اور محبت اف!

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
جگر

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریباں سحر بھی
سودا

عشق میں بے قراری و بے چینی کا عالم۔

کیا آگیا دل بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگادی بہار میں
جگر

بے دلوں کی ہستی کیا جیتے نہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے
یگانہ

عشق کے روگی کا اللہ حافظ۔

سے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
ولی

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا
داغ

محبت بے نام جذبہ ہے:۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرہ خون نہ نکلا
آتش

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے
سودا

محبت کی راہ آسان نہیں۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
جگر

عشق پر زور نہیں یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے
غالب

محبوب کے حسن و جمال کا ذکر۔

جب بھی دیکھے کچھ اور عالم ہے تمہارا
ہر بار عجب رنگ ہے ہر بار عجب روپ
آتش

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے
میر

شاعر کا محبوب بے مثال ہوتا ہے۔

تمہارے روبرو پھیکا رخ شمس و قمر دیکھا
وہ نان بے نمک پایا یہ شیر بے شکر دیکھا
ذوق

نازکی ان کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر

محبت کی پہلی نظر کا اثر۔

اول عشق میں ہی میر جی تم رونے لگے
خاک ابھی مند کو ملو،نالہ وفریاد کرو
میر

آنکھیں جو ڈھونڈتی تھیں نگہ ہائے التفات
گم ہونادل کا وہ مری نظروں سے پا گیا
مومن

محبوب کے دیدار کے بعد شوق تمنا کا بڑھ جانا۔

چارہ دل سوئے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
مومن

عشق صبر طلب اور تمنائے بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
غالب

عشق مجازی کے ساتھ غزل کا ایک اہم موضوع عشق حقیقی ہے۔عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔عشق مجازی توکل،صبر ورضا،ترک ہوس،نفس کشی وغیرہ سکھا تا ہے عشق حقیقی کے لئے زندگی بے نام ہے موت ووصال ہے زندگی کے رسم ورواج،محبوب سے ملاقات کے راستے میں رکاوٹ تھے جو زندگی کے ساتھ ختم ہوگئے۔اوراصل محبوب سے ملاقات زندگی کے بعد ہے۔جس کی شرطیں صفائی ء

قلب،خلوص نیت،ظاہر و باطن کا یکساں ہونا، برابری رواداری،دوسرے مذاہب کا احترام،اور اخلاقیات ہیں۔اردوغزل میں تصوف اوراخلاقیات کا ذکر ہمیشہ ہی سے اہم موضوع رہا ہے۔جس میں شعراء نے کبھی فلسفہ وحکمت کا ذکر کیا تو کبھی ریا کاری کو برا مانا،گناہ وثواب کا تذکرہ کیا،اپنی برائیوں پرنظر کی تو کبھی دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے کی تلقین دی ہے۔اوراس کے برخلاف نفرت،حسد،کینہ ونفاق،تعصب، ظاہرداری،نام ونمود کی خواہش،مصنوعیت وغیرہ سے پرہیز کی تلقین کی۔اخلاقیات اورتصوف کوظاہرکرتے ہوئے چنداشعار ملاحضہ فرمائیں:۔

گیا شیطاں مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

ذوق

نازکی ان کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

درد

روک تو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطاء کرے کوئی

غالب

گیا شیطاں مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

ذوق

نازکی ان کے لب کی کیا کہئے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

درد

روک تو گر غلط چلے کوئی

بخش دو گر خطاء کرے کوئی

غالب

گرمی سہی کلام مین لیکن نہ اسقدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت خود مختاری کی

چاہتے ہیں جو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

میر

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہوں

غالب

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ذوق

موت کا ایک دن معین ہے غالب
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
غالب

غزل میں قدرتی مناظر کا ذکر، تصاویر مناظر کے ساتھ، تصاویر جذبات، خیالات حقیقت اور فکر وغیرہ کا بیان بھی اس میں شامل ہے۔ داخلیت کا عنصر قدیم غزل سے توجہ اور دلچسپی کا باعث بنا ہے۔ اپنے دلی جذبات، خیالات، دکھ درد، تالیف کا بیان کرنا اور دوسروں کی تکلیف، دکھ، خیال و احساس کو اپنا محسوس کرنا، داخلیت میں شامل ہے۔ اور اس بیان میں ابہام گوئی کا تصور غزل کے ابتدائی دور میں عروج پر تھا۔ جس میں ہندی دوہوں کا اثر، ذومعنی بات کہنے اور الفاظ کے کھیل سے بات میں بات پیدا کرنے کا رواج عام تھا۔ بعد کے دور میں حاتم، مرزا مظہر جان جاناں اور میر وسودا نے اس کی اصلاح کی کوشش کی دھیرے دھیرے غزل میں مواد طرف توجہ کی گئی اور فلسفہء حیات کائنات کو تصور غزل کے موضوعات میں شامل کوتے گئے۔ چند اشار بطور نمونہ ملاحضہ فرمائیں۔

دوسروں کی تکلیف کا احساس

جو تو اے مصحفی راتوں کو اس شدت سے روئے گا
تو میری جاں پھر کیوں کر کوئی ہم سایہ سوئے گا
مصحفی

داخلیت

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویہ بھی میرے دل میں ہے
غالب

☆قدیم اردو غزل میں سماجی وسیاسی مسائل

اردو غزل اپنے ابتدائی دور میں ہندی الفاظ، فارسی کا اثر رسم ورواج اور تہذیبی عناصر کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ تصوف سے حیات و کائنات کے مختلف مسائل کی ترجمانی غزل نے کی۔ اس کے ذریعے انسان برابری اور زندگی کی ناپائیداری کے تصورات پر زیادہ توجہ دی گئی۔ اسی کے تحت انکساری، حق گوئی، بے باکی، صفائی قلب، اور روحانیت وغیرہ پر زور دیا گیا۔ مگر سماجی زندگی

اور سیاسی مسائل کی عکاسی تصوف سے ممکن نہ ہوسکی تھی۔ان حقائق سے دوچار ہونے کے لئے حوصلہ،فکر وآگہی اور فلسفیانہ طریقہ کار کی ضرورت تھی۔ابتدائی دور میں اس کا فقدان تھا۔بعد کے دور میں تصوف کے اثرات سے بالاتر ہوکر سیاسی اور سماجی حقائق نمایاں طور پر غزل میں سموئے جانے لگے۔اس کے بیان کے لئے خاص رموز وعلائم کا استعمال ہوا مثلاً صیاد و باغباں، قاتل ومقتول، جور فلک، ستم باغباں، بہار وخزاں،صحرا وگلستان، یہ علامتیں سماجی وسیاسی جبر، بے اطمینانی اور نا برابری وغیرہ کے اظہار کے لئے ابتدائے جدید غزل تک استعمال ہوتی رہی ہیں۔

ہر دور میں غزل میں سیاسی سماجی اور تہذیبی مسائل کی عکاسی ملتی ہے اس کے پیش نظر غزل کو محض حسن وعشق کے مسائل تک محدود کرنا حقائق سے دوری اختیار کرنے کے مترادف ہے۔جن نقادوں نے کھلے ذہن سے غزل کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا اور کچھ نقاد غزل کو صرف نیم وحشی صنف سخن، بوالہوسی اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی صنف سخن کہا ہے۔کسی نے منتشر خیالی کا مرصع کیا ہے۔یہی وجہ ہیکہ غزل میں جزئیات اور تفصیلات تلاش کرنے والوں کو مایوسی ہوتی ہے۔اور لوگ اس کے اختصار اور خاص علامتی زبان کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ غزل میں خارجی مسائل کی عکاسی ممکن نہیں۔جبکہ غزل میں زندگی کے ہر خارجی جذبہ کا اظہار داخلی جذبہ بن کر نکلتا ہے وحید اختر غزل کی وسعت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''غزل زندگی کی طرح وسیع بھی ہے اور متنوع بھی تغزل روح عصر وروح کائنات کی شاعرانہ گرفت واظہار کا نام ہے۔جو کیفیات وتجربات عشق کے ساتھ ساتھ تمام مسائل کائنات اجتماعی واخلاقی نظام اور سیاسی وسماجی اقدار کا احاطہ کر لیتا ہے''۔

(30) (خواجہ میر درد۔تصوف اور شاعری:وحید اختر۔1971 صفحہ 381)

یہ سچ ہیکہ ابتدائی دور میں غزل میں صرف عشقیہ جذبات کا بیان ہی ہوا کرتا تھا لیکن بعد کے دور میں انقلاب زمانہ کے پس منظر میں مختلف شعراء اپنے خیالات کا اظہار شعر کی صورت میں کر رہے تھے۔اقدار کی شکست وریخت، معاشرتی زندگی میں انتشار اور افراتفری نے ان شعراء کو جھنجھوڑا اور اس حالات کا تذکرہ بھلا شعراء اپنی شاعری میں کیوں نہ کرتے اٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کا زوال اور انگریزوں کی آمد کا ذکر بھی غزل میں ہوا ہے۔غالب کی غزلیں ان کی سماجی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی عکاس ہیں۔

اے حشر جل کر تہہ و بالا زمین کو
گر کچھ نہیں تو امید تو ہے انقلاب میں
مومن

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرت
اگر ہوتا چمن اپنا،گل اپنا،باغباں اپنا
مرزا مظہر جان جاناں

ڈال دو سایہ اپنے آنچل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا
آتش

ملے برسوں وہی بے گانگی تھی
ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
میر

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا
مصحفی

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو در خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے
فراق

رہیئے اب ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ اور ہم زباں کوئی نہ ہو
غالب

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
فیض

☆☆☆☆

بابِ دوّم
جدید اُردو غزل کی خصوصیات

☆جدید اُردو غزل کی خصوصیات

وہ غزل جو کسی انقلابی انداز بدلتے ہوئے ماحول کی صحیح ترجمانی میں خود اپنے آپ کو بدل دے جدید غزل کہلاتی ہے۔ یہ انداز غزل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب احساس، جذبات، خیالات، تصورات، اقدار اور غور وفکر کے مزاج میں نیا نقطۂ نظر دوڑتا ہے۔ ان حالات کے زیر اثر سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی زندگی اور ادب کا کارواں نئی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال اردو غزل میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد پیدا ہوئی۔ اس واقعے نے ہماری سماجی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر بڑے گہرے نقوش مرتب کیے۔ غزل کو جدت سے ہم کنار کرنے میں ان حالات کا بڑا دخل ہے جو انگریزوں کے زیر اثر پیدا ہوئے۔ انگریزوں کے ساتھ ساتھ مغربی خیالات وافکار بھی ہماری زندگی میں داخل ہوئے۔ ان افکار وخیالات نے زندگی کو انقلابی انداز سے بدلنے پر مجبور کیا۔ یہ بدلتے ہوئے حالات اس زمانے کی غزل کو بھلا کیسے تبدیل نہیں کرتے۔ ان حالات میں بعض ایسی شخصیتیں ابھر کر سامنے آئیں جو شعوری طور پر غزل کو بدلتے ہوئے حالات کی رفتار سے ہم آہنگ کرے۔ حالی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ حالؔی نے غدر کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انہوں نے ایک تہذیب کو بکھرتے اور دوسری تہذیب کو سنورتے دیکھا۔ دونوں حالات کے نشیب وفراز کی ساری کیفیات ان کی آنکھوں کے سامنے رہیں اور اس صورت حال نے انہیں اس قدر متاثر کیا وہ اسی میں ڈوب گئے۔ حالی کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کے لیے غدر سے قبل اور اس کے بعد کے حالات کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرتا نظر آرہا تھا۔ مغلوں کی حکومت صرف قلعہ تک رہ چکی تھی۔ قلعہ کے باہر انگریزوں کا رعب دبدبہ تھا۔ حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ ہر طرف افراتفری تھی اور بطور خاص مسلمان افراتفری و بحران کا شکار ہورہے تھے۔ کیوں کہ مسلمانوں نے ذہنی طور پر انگریزوں کے تسلط کو قبول نہیں کیا تھا۔ اسی ذہنی کیفیت کے باعث وہ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے پستی میں گرتے جارہے تھے۔ غدر سے قبل مسلمانوں کی زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جس سے ان کی زندگی کوئی نئی صورت اختیار کرتی۔ مغلیہ دور کی طرح انگریزی نظام رائج ہوا تھا۔ اس جاگیردارانہ نظام میں بھی نوچ کھسوٹ، لوٹ مار کا وہی عالم تھا۔ مسلمان اس نظام کو قبول نہیں کرسکے اس لیے وہ معاشی طور پر بدحالی کا شکار ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ

معاشی بدحالی انہیں معاشرتی اعتبار سے پستی کی طرف لے جاتی ہے۔اس معاشی بدحالی نے مسلمان کو کہیں کا نہ رکھا وہ اپنی اہمیت کھوتے چلے گئے۔

غدر مسلمانوں کی کھوئی ہوئی طاقت کو ایک بار پھر حاصل کرنے کی ناکام کوشش تھی۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کوئی مضبوط بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک جذباتی نعرے کے تحت لوگ ایک مرکز پر جمع ہوئے تھے۔اس بغاوت میں مسلمانوں کی ناکامی کا سارا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا۔ان کی رہی سہی قوت بھی ختم ہوگئی۔ظلم وستم کے وہ پہاڑ ان پر ٹوٹے کہ انہوں نے سب کچھ بھلا دیا۔معاشی اور معاشرتی حالت کچھ اور بھی خراب ہوگئے۔ یہ مسلمانوں پر بڑا نازک وقت تھا کیوں کہ انگریز صرف انہیں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور ہندوستان کے دیگر طبقوں کو مسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔اس وقت مسلمان ہر اعتبار سے ٹوٹ چکے تھے۔ حالات نے انہیں گہری کھائی میں ڈال دیا تھا کہ راستے کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔غدر نے ان کی حالت کو اس درجہ تباہ کر دیا تھا کہ ہر اعتبار سے ان کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔اب دوبارہ صف آرا ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا چنانچہ وہ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے مجبور ہوگئے۔

۱۸۵۷ء کے فوری بعد مسلمانوں کی حالات کی تصویر ڈاکٹر ہنٹر کے الفاظ میں ؎

''حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکومتِ عملی میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ (اب ان پر) بالکل بند ہے۔غیر سرکاری ذرائع میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔وہ سرکاری ملازمتوں کے قبل ہوں تو بھی ان کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا۔ان کی قابل رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔اعلیٰ حکام تو ان کی پستی کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔

27۔(ہمارے ہندوستانی مسلمان-ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، اقبال اکیڈمی، ۲۴۲)

Our Indian Musalman of W.W/1871 - Hunter

زمین ان پر تنگ تھی اور آسمان سخت۔بات بات پر زبان قلم کی جاتی، وفاداری کسی صورت متعین نہیں ہوسکتی تھی۔فوج سے باہر نکال دیا گیا۔ جتنے ہندوستانی سرکاری ملازمتوں میں لئے جاتے ان میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔مسلمان جو برسر اقتدار تھے ان کو گرایا گیا اور جو پہلے زیادہ معزز نہ تھے ان کو

اکسانے کی کوشش کی گئی۔ غدر کے بعد بھی کافی عرصہ تک مسلمان دور بدحالی اور پریشانی روزگاری میں مبتلا رہے۔ مسلمانوں کی سیاہ بختی میں اضافہ کے طور پر انگریزوں نے اپنی مصلحت کے پیش نظر کچھ ایسی سیاسی اور سماجی کشمکش پیدا کردی کہ ہندو اور مسلمان دونوں نفسانفسی کا شکار ہو گئے۔

اور اپنی اپنی اصلاحی کوششوں میں سرگرداں رہے۔ جبر واستحصال کا کچھ ایسا حال تھا کہ کسی قوم کو سکون کی سانس لینے یا انگریزوں کے خلاف سر اٹھانے کا خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کی شکایتوں کا ازالہ اور بدگمانیوں کو دور کرنے کی تدبیریں مسلمان کرنے لگے۔ سرسیّد کی تحریک اسی صورتِ حال کی پیدائش ہے۔

سرسیّد تحریک اگر چہ ابتداء میں تعلیمی تھی لیکن اس نے مسلمانوں کی زندگی کے عام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ بعد میں اس کی نوعیت سیاسی، معاشی اور معاشرتی بھی ہوگئی۔ اور اس نے ایسے مسلمانوں کو ایک راہ دکھائی جو غدر کے بعد کسی سہارے کی تلاش میں تھے۔ سرسیّد نے مذہب کے غلط تصورات جو زندگی کی لیے وبال بن گئے تھے انہیں صحیح تصور کے ساتھ پیش کیا۔ اسی لئے یہ تحریک میں مذہب کو بھی شمولیت مل گئی۔ اندھے عقائد اور غلط روایات کو خیر باد کہا، معاشرے میں عورت کی حیثیت کو متعین کیا۔ ادب جو برسوں سے صرف تفریح کا ذریعہ رہا اس کو افادیت کے ساتھ ملک وقوم کی تعمیر میں اس سے کام لینے کے قابل بنایا۔ سرسید بہترین نباض تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی حالت کو بخوبی دیکھا اور سمجھا اور زندگی کے لیے کچھ اصول بنائے۔ جن پر چلنا مسلمانوں کے لیے ضروری تھا۔ نئے نظام کی بدولت مسلمانوں کا متوسط طبقہ وجود میں آیا۔ اسے معاشی طور پر مستحکم بنانے کے لیے تعلیم کی ضرورت تھی۔ نظریہ حیات میں تبدیلی کے بغیر اس راہ میں کامیابی ممکن نہیں اور حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا اسی لیے مسلمانوں کا بڑا طبقہ سرسیّد کے رنگ میں رنگ گیا۔ بقول آل احمد سرور....

''سرسیّد اردو دان طبقہ کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً جمود سے حرکت کی طرف، تنگ نظری سے وسعت نظری کی طرف، اندر کی بھول بھلیاں سے باہر کی روشنی کی طرف، داخلی کیفیات سے خارجی واردات کی طرف، تقلیدی علوم سے علوم جدیدہ کی طرف، حافظہ اعجاز سے زین کی براقی اور جولانی کی طرف، شرح وتفسیر وتوجیہ وتامل سے تجزیہ استدلال بحث ونظر کی طرف مائل کیا۔''

28۔(علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر ۴۹، اردو غزل کے ۵ سال ۱۵۵)

سرسیّداوران کے رفقانے جوادبی اورسماجی خدمات انجام دیں وہ ایسی غیر فانی ہے کہ ادب کی تاریخ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔جس میں حالی،شبلی،نذیر احمد، وقارالملک وغیرہ نے ادب میں جس سرخروئی سے کام کیا وہ قابل فراموش نہیں۔سرسیّد کے طرز پر ادب کی تعمیر ہوئی نثر اور نظم دونوں ہر فکر و فن،معنی ومفہوم،اصلاحات و روایات پر ایسا اثر مرتب کیا کہ دنیائے ادب ہمیشہ آپ کی خدمات کی مرہونِ منت رہیں گی۔

بقول سیّد عبداللہ...

''ہمارے ملک میں سرسیّد ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے فکر وادب میں روایت تقلید سے ہٹ کر آزادی رائے اور آزادی خیال کی رسم جاری کی۔اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقائد میں عقل،نیچر،تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ادب میں ایک نیا پن،ایک ہمہ گیری،ایک مقصد،ایک سنجیدگی ایک خاص قسم کی معقولیت پیدا کی جس کے سبب اب ادب کو کوئی بے کاروں کا مشغلہ نہیں کہہ سکتا تھا۔''

(علی گڑھ میگزین-اُردو ل غزل کے ۵۰ سال-ص ۱۱۷)

سرسیّد نے ''اسباب بغاوت ہند'' میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر نظر کی اور اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں تبدیلی کے لیے لائحہ عمل تیار کیا۔وہ ادب سے تبدیلی اور انقلاب کا کام لینا چاہتے تھے۔وہ شاعری کو حقائق کی طرف لانا چاہتے تھے۔''نیچرل پوئٹری'' کا تصوران کے ہاں روح عصر اور قوم کے مزاج اور افکار کی نمائندگی کی شاعری تھا۔وہ افادی شاعری کے قائل تھے۔اور یہ کام سرسیّد نے حالؔی کے ذریعے سے کروایا۔تصنع اور مینا کاری ہمارے ادب سے دور ہوئی۔اُردو کو بیان اور مطالب کی قوتیں حاصل ہوئیں اور ادب میں افادیت کی شان پیدا ہوئی۔حالی نے یہ تمام حالات دیکھے اور انہی حالات میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔حالی سرسید کے دستِ راست تھے۔سرسیّد جو سوچتے تھے حالی اسے عوام تک پہنچاتے۔سرسیّد اور ان کی تحریک نے حالی کو قومی شاعر بنایا۔قدیم شاعری سے متعلق حالی کا خیال ہے۔

''زمانے کا نیا ٹھاٹ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکو سلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے

شرم کی بات ہے عزیز خاک میں مل گئے علم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ دین کا صرف نام باقی ہے افلاس کی گھر گھر پکار ہے پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے اور یہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔ اور ساری ناؤ کی سلامتی ہماری سلامتی ہے پر چند لوگ بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھ چکے ہیں۔

(حالی- دیباچہ- مسدس مدو جزر اسلام)

☆الطاف حسین حالی

حالی اُردو کے پہلے ناقد، پہلے سوانح نگار، پہلے قومی شاعر، پہلے صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ حآلی غزل کی جادوئی کیفیت، رمز و ایجاز سے ہمیشہ متاثر رہے۔ لیکن غزل کی یکسانیت سے تنگ تھے۔ وہ غزل کو روایتی اور رسمی عناصر سے آزاد کروانا چاہتا تھے۔ اور موضوعات کے شیشوں سے غزل کا ایسا شیش محل تعمیر کرنا چاہتے تھے یہاں حقیقی واقعات کا عکس واضح نظر آئے۔ یہی وجہ تھی کہ حآلی کو غزل سے زیادہ ان کے''مقدمہ شعر و شاعری'' کا اثر ہوا۔ مقدمہ نے اردو تنقید کی اور اردو شاعری کی دنیا بدل دی۔ حالی کے مطابق شعر کو آرزو نے انصاف علم اخلاق کا نائب مناسب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ شاعری سوسائٹی کی تابع ہے اور شعر یہ کی خوبی ہے کہ وہ سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہوا اور اصلیت پر مبنی ہو۔ حآلی کے ان شعری پیمانوں نے غزل کی دنیا بدل دی۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکان سب سے الگ

غرض حآلی اور سر سیّد نے غزل کی تنقید کو اس درجہ پر پہنچا دیا تھا کہ شاعری کا نیچرل ہونا اہم وصف قرار پایا۔ نیچرل شاعری کو اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں قبولیت حاصل ہوئی۔ جب مسلم شرفا اور تعلیم یافتہ طبقہ میں سر سیّد کو اہمیت بڑھی تو حالی کے نظریات ادب بھی خود بخود معتبر ہو گئے۔

حالی نے اپنی غزل سے اخلاقی درس کے لیے طنز و مزاح سے کام لیا، ان کے کلام میں عمیق گہرائی ہے۔ معرفت و حقیقت کو خصوصیات واضح نظر آتی ہے۔ حالی کا رنگ سخن ہمیشہ منفرد رہا۔ انہوں نے مسلسل غزلیں لکھیں اور ایک مرکزی خیال کو مربوط صورت میں بیان کرنے کا طرز بھی اپنایا۔ وہ غزل سے افادی اور مقصدی کارہائے نمایاں انجام دینا چاہتے تھے، جس کی وجہ سے اکثر یہ رجحان

سیاسی اور سماجی شکل اختیار کر جاتا۔ اور موضوعِ سخن حسن و محبت کی داستانوں کو چھوڑ کر تعمیری و اصلاحی جذبات کا حامل بن جاتا۔لیکن ان تمام تجربات کے باوجود حالی نے غزل کے دلکش انداز سے کبھی بے احتیاطی نہیں برتی۔ان کے اشعار دل سوز، حسن و محبت کی چھیڑ چھاڑ، حسن بیان کا جادو، ترنم، سوز گداز، شباب و شادمانی کا تذکرہ ان کی غزل کا مایہ ناز سرمایہ ہے۔

اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا
بس آ گیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھائیے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ صرف تمنا ہوا چاہتا ہے

حالی کی جدید غزلوں میں کوئی تک نہیں کہ کچھ شعر سپاٹ اور کچھ ایسے بھی ملیں گے جن میں وعظ و نصیحت ہے مگر یہ خیال کہ حاؔلی کی غزلیں سبھی ایک رنگ میں رنگی ہیں غلط ہے۔اگر اپنے قدیم رنگ میں غزل کہتے تو کیا اردو کے کے چوٹی کے شعراء میں ان کا شمار ہوتا؟ حاؔلی جدید غزل کے موجد ہیں۔امام ہیں۔جدید غزل میں ان کے خیالات اور فکر پر اثر ضرور پڑا ہے مگر ظاہری لباس اور حسن وہی رہا ہے۔معنی بدلے ہیں صورت نہیں۔ان کی چند جدید غزلوں کے شعر ملاحظہ فرمائیں۔

شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ   ہچکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون

دل دکھاتے ہیں وہی جس میں کہ گھر کرتے ہیں   غم زد و رنج و مصیبت پہ کر و ناز کہ وہ

تو نے دیکھی نہ انتہا میری   ابتدائے وفا ہے سر دینا

چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا   الفت میں دم بدم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی

شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا   افسانہ تیرا رنگیں، روداد تیری شیریں

بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ   یا رب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو

یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز   بزم ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حاؔلی

تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا عبور تھا   حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں

دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد   حالی کی سن اور صدائیں جگر خراش

تم کو ہزار شرم ہی مجھ کو لاکھ ضبط   الفت و راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

بہت چین سے دن گذرتے ہیں حالؔی   کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش   کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں زندگانی

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن   راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے   ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

معنی کا تم نے حالی اگر دریا بہا دیا   یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالؔی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بے کار تجھ کو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

حالی کے بعد قدیم غزل اور جدید غزل کے تصورات میں بڑا فرق آ چکا تھا۔ عہد بہ عہد غزل اپنے سماجی و سیاسی پس منظر کی پیداوار رہی ہے۔ لیکن حالی سے قبل وہ صورتیں ہمارے سامنے نہیں آئیں جس کی نمائندگی بیسویں صدی میں علامہ اقبال اور حسرت موہانی کی غزلیں کرتی ہیں۔ غزل کے بڑھتے سماجی شعور نے عشق میں جذباتیت کو کم کیا۔ غم جاناں کے بجائے غم دوراں اہم موضوع ٹھہرا۔ غزل کا عاشق پہلی بار ہوش مند انسان کی شکل میں سامنے آیا۔

موضوعات میں تنوع، زندگی کی تلخیوں، الجھنوں کا گہرا شعور اس زمانے میں ابھرا تو غزل کا دامن بہت تنگ نظر آیا۔ لیکن حالی کی تحریک نے غزل میں ظاہری طور پر کسی تبدیلی کے باوجود زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ اس عہد میں شاعروں نے نہ صرف زندگی کو قریب سے دیکھنا شروع کیا بلکہ زندگی کیسی ہونی چاہیے اس پہلو پر بھی غور و خوض کیا۔ اقبال نے غزل میں جب ''پیامبری''

شروع کی تو اس جذبے کے پس پشت زندگی کو تبدیل کرنے کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ اقبال سے قبل غزل میں جو بے عملی اور زندگی سے فراریت کا رجحان تھا وہ غزل کے اس نئے رجحان کے ساتھ روبہ زوال ہوا۔

سماجی و سیاسی تبدیلیوں کے زیر اثر غزل کی جو نئی صورتیں منظر عام پر آئیں ان میں ہیئت کا جمالیاتی تصور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غزل کے اشعار میں مختلف ذہنی کیفیتوں کو جس طرح پیش کیا جاتا رہا جدید غزل گو شعراء نے اس پر خصوصی توجہ دی اور غزل کے اشعار سے معنوی انتشار، بے ربطی،

تضادات کو بڑی حد تک دور کیا۔ غزل وقت کے ساتھ خود بدلتی جا رہی تھی۔ غزل کا دامن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ روزمرہ کے سیاسی امور غزل میں خصوصیت کے ساتھ شامل کئے جانے لگے۔ غزل کی دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کے باوجود ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو روایتی غزل کی تخلیق کر رہا تھا۔ کچھ شعراء غالب کی اتباع کر رہے تھے۔ اور کچھ شعراء حالی کے نقش قدم پر اپنی غزل کی کشتی پر سوار تھے۔ مختصر یہ کہ اب شعر وسخن کی دنیا بدل چکی تھی اور ایک نئی سنگِ میل کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ جدید غزل گو شعراء کی دنیا بدل چکی تھی ان میں کافی وسعت آ چکی تھی۔ غزل میں افادی رجحان کی شناخت بہ آسانی ہو سکتی تھی۔ جو ترقی پسند غزل سے قبل ظہور میں آ چکی تھی۔

پنڈت برج نارائن چکبست قومی اور وطنی جذبے سے سرشار تھے۔ اس لیے وہ ہندوستان کے سیاسی وسماجی مسئلہ پر کھل کر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا غزل گوئی ترک کر کے نظم نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے اور بحیثیت نظم نگار مشہور ہوئے۔ ویسے اگر وہ نظم نہیں بھی کہتے تو ان کا شمار یقیناً اردو کے بڑے غزل گو شعرا میں ہوتا۔ کیوں کہ چکبست نے غزل کی کھوئی ہوئی شان واپس لانے کے لیے غزل کی روح میں خوشگوار تبدیلی پیدا کی اور غزل کو روایتی وفرسودہ مضامین سے نجات دلائی۔ اور موضوع کے اعتبار سے اس میں وسعت پیدا کی۔ ان کی غزلوں میں معاملہ بندی اور حسن وعشق کی واردات نہیں ہے لیکن ان کے سیاسی اشعار میں حسن وعشق کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سچے وطن پرست بھی تھے۔ انہیں ملک وقوم سے بے انتہا محبت تھی۔ اس لیے ان کے قومی جذبہ محبت کی شدت نے ان کے سیاسی اشعار میں وہی درد واثر نغمگی اور رعنائی پیدا کر دی جو عاشقانہ غزلوں کی خاص صفت ہے۔ چکبست کی غزلیں حب الوطنی، انسان دوستی اور قومی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

نواب جعفر علی خان اثر لکھتے ہیں

''چکبست نے غزلوں میں قادرالکلامی کا عجیب وغریب نمونہ پیش کیا ہے۔ زبان غزل کی ہے لیکن جذبات عشق وحسن کے افسانوں سے قریب قریب خالی ملکی آزادی، اصلاح رسم ورواج، یکجہتی ورواداری، اتحاد ومساوات اور اسی قسم کے مضامین ہیں۔ لطف یہ کہ لہجہ کہیں خطیبانہ نہیں ہونے پاتا اور تاثیر لفظ لفظ پر نثار ہوتی ہے۔''

!(چھان بین -(مجموعہ مضامین اثر) آثر صفحہ ۱۴)(31)

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں　　وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں

یہ انقلاب ہوا عالم اسیری میں　　قفس میں رہ کر ہم اپنی صدا بھول گئے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ میری　　کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

جنونِ حب وطن کا مزا شباب میں ہے　　لہو میں پھر یہ روانی رہے نہ رہے

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا　　نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا　　خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے　　ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کو انتہا کیا ہے

زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا　　خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرزِ جفا کیا ہے　　ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کو انتہا کیا ہے

حالؔی اور اقبالؔ کی غزل کی درمیانی کڑی کے طور پر اکبرالہ آبادی کا نام زباں پر آتا ہے۔ غزل کے عبوری دور میں انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ غزل کے مزاج میں تنزل کی شیرنی کے ساتھ ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا اکبر کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ جذبے میں صداقت اور زباں پر قدرت ہو تو شعر میں ضرور اثر ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں اپنے کارناموں، قدروں اور روایتوں پر بھروسہ ہونا چاہیے اور اس کے تحفظ کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ مغربی اثرات سے ملک کا روحانی مزاج تباہ ہو جائے گا۔ اسی لیے جب علی گڑھ کالج کے ذریعہ مغربی علوم کی ترویج کی گئی تو اکبر کو اپنے تہذیب وتمدن اور مشرقی علوم وفنون کے تحفظ کی بڑی فکر ہوئی۔ طنز ومزاح کی چاشنی کے ساتھ تصوف، فلسفہ اور حکمت کے مضامین سے غزل کو آراستہ کر کے غزل کی اصلاح کی اور غزل سے معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان کی غزلیں تنقید حیات اور آئینہ کائنات بھی پیام تفریح بھی ہیں اور جز و پیغمبری بھی۔

اکبر نے مصلحت اندیشی کے علاوہ تقاضائے عصر کا بھی لحاظ رکھا اور اپنے کلام کو زندگی و شاعری دونوں کی ہلکی پھلکی تنقیدی بنا کر پیش کیا۔ اور اقبال کے لیے سامان فکر وعمل فراہم کرنے میں کسی

حد تک معاون و مددگار ثابت ہوئے تھے۔

نئی تہذیب میں مذہبی تعلیم شامل ہے	مگر یونہی گویا آب زم زم مئے میں داخل ہے
اک مست قلندر کہتا تھا اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں	یاروں نے کہا سب جھوٹ غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
حامدہ چمکی نہ تھی جب انگلش مے بے گانہ تھی	اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
کیا وہ خواہش کہ جسے دل بھی سمجھتا ہو حقیر	آرزو وہ ہے جو سینے میں رہے ناز کے ساتھ
جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی	موت روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا
جن کے جلوے نہ سما سکتے تھے ایوانوں میں	ان کی خاک آج پڑی ہے ویرانوں میں
ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے	ڈاکہ تو نہیں ڈالہ چوری تو نہیں کی ہے
یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے	خدا ہی خوب واقف ہے کس پر کیا گذری ہے
دل کی خاطر تو ہے لازم تجھے بک جانا بھی	صرف آنکھوں کا مزا ہو تو خریدار نہ بن

☆محمد علامہ اقبال

علامہ اقبال کا عہد پورے طور پر غلامی کا عہد تھا۔ انگریزوں کا تسلط وقبضہ پورے ہندوستان پر تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار جا چکا تھا۔ اسی لیے خاص طور پر انگریز مسلمانوں پر ظلم و جبر کرر ہے تھے۔ تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی جارہی تھی۔ جدید تعلیم سے نا آشنائی کی بدولت احساسِ کمتری معاشرے میں بیماری کی طرح پھیل چکی تھی۔ انہیں اپنی تہذیب معاشرت اور رہن سہن میں مذہبی قدروں کے تحفظ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ شعروادب کے میدان میں بھی جدید وسعتوں سے نا آشنا تھے ایسے میں کرنل ہالرائڈ نے زبان اردو کو ترقی واصلاح کے مختلف طریقے اپنائے۔ نئے اقسام کے مشاعرے ہونے لگے جس کا مقصد اردو شاعری میں وسعت و گہرائی پیدا ہو وہ عاشقانہ خیالات اور بلبل کے بجائے جذبات انسانی، مناظر قدرت اور قدرت کی نیرنگیوں کی اصل تصویریں کھینچی جائیں۔ ان شعراء میں اقبال کی شاعری سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز تھی۔

اقبال کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے دور میں انہوں نے صرف غزلیں کہی اور اس پر داغ کا رنگ واضح نظر آتا ہے...

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی	مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں	مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

دوسرے دور میں ان کے کلام میں فلسفہ خودی کے ساتھ فلسفہ بے خودی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وطن سے محبت اگر چہ ان کو اب بھی عار نہ تھی تاہم اس دور میں ان کا نظریہ قائم ہوا کہ وطنیت پر اسلامی قومیت کی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ	نمود ہر شئے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے
اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے	عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے
پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات	تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من
یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت	سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی
عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں	کہ یوں ٹوٹا ہوا تارا یہ کامل نہ بن جائے

تیسرے دور میں انہوں نے فارسی پر زیادہ توجہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ اس دور میں اقبال کی آپ سے عقیدت و محبت بے انتہا بڑھ گئی تھی۔ اس دور میں انہوں نے بڑی کامیاب نظمیں لکھیں۔

چوتھے دور میں اقبال فلسفہ خودی سے سرشار نظر آتے ہیں۔ خودی کے ساتھ اقبال نے سیاست کو موضوع شعر بنایا۔ ''ضرب کلیم'' اور ''ارمغان حجاز'' میں فارسی کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔ اس دور میں انہوں نے غزل، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی اور
مختلف موضوعات کو یعنی مناظر قدرت، ظریفانہ وطنزیہ، قومی اور وطنی جذبات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں فنی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کے کلام کو جو شہرت و مقبولیت ملی اس کی وجہہ رفعت تخیل کے ساتھ فنی وادبی خوبیاں ہیں۔ رمزیت، رومانیت، کلاسکیت۔

جدید وقدیم طریقہ تنقید کے ساتھ حسن الفاظ، لب ولہجہ کا رکھ رکھائی، تشبیہ واستعارہ تلمیح وتضمین روانی و برجستگی وغیرہ۔سبھی ان کے کلام میں موجود ہیں۔مذہب اور سیاست اقبال کے یہاں الگ نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام سیاست ہے اور سیاست زندگی کا ایک شعبہ ہے۔ جب سیاست مذہب سے الگ ہوجاتی ہے تو۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہوویں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کی کامیابی یہ ہے کہ غزل کو صدیوں کی قید سے آزاد کر کے وسعت ومعنی کو رہ گزر پر روانہ کردیا۔غزل کی تنگ دامانی کا احساس اقبال کو دوسرے شعراء کی بہ نسبت زیادہ ہوا اور اسی لئے انہوں نے غزل اور نظم کی اصناف کو قریب تر لانے کی کامیاب کوشش کی۔اور بعض غزلوں کو عنوانات دے کر نظم کے خانے میں ڈال دیا۔تا کہ معترضین کا منہ بند کیا جاسکے۔ بانگِ دار اور ضربِ کلیم کی غزلیں قاری کو نئی کائنات کی سیر کرواتی ہیں۔اقبال کے نظریہ حیات اور تصورفن میں حرکت وعمل، جہد مسلسل قوت اور توانائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔جس کا اظہار ان کی غزلوں میں بار ہا ہوتا رہا ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے	خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
نہ تو زمین کے لیے نہ آسماں کے لیے	جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے
جو میں سربسجدہ ہوا تو زمیں سے آنے لگی صدا	تیرا دل تو صنم آشنا ہے تجھے کیا ملے گا نماز میں

بیسویں صدی میں غزل کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔اس عہد میں غزل کے دو رنگ صاف دکھائی دیتے ہیں۔افادی پہلو والے شعراء حالی، اکبر، چکبست اور اقبال دوسرے جس میں جذباتی اور

جنسی پہلو کی عکاسی کی گئی ہے اس دور میں قومی اور ملکی موضوعات اور سماجی اور سیاسی مسائل ادب و شاعری مرکز ومحور رہے۔غزلوں میں حسن وعشق کے سادہ اور فطری جذبات واحساسات کی عکاسی کے ساتھ حیات وکائنات کے فلسفیانہ بیانات اس دور میں بہت زیادہ ملتے ہیں۔پچھلی صدی کے مقابلے میں یہ صدی زیادہ پیچیدہ تھی۔مغربی تعلیم ، سائنسی ایجادات،صنعت وحرفت کی ترقی سے حیات و کائنات سے متعلق نظریات میں تبدیلی آئی۔زندگی کی قدریں بھی بدل گئیں۔آزادیٔ ہند،انگریزوں کی مخالفت ادب وطق، معاشرتی اصلاح قومی ترقی وغیرہ کے سلسلے میں خیالات اس دور میں عام ہوئے۔قدامت وجدت، رجعت پسندی اور

ترقی پسندی، مذہب اور سائنس وغیرہ کی کشمکش اس دور میں محسوس کی گئی۔اس کا اثر ادب وشاعری پر بھی پڑا۔

اس دور کے شعراء نے بیان میں متانت وشائستگی، خیال میں وسعت ورفعت، اسلوب میں جدت کو دیگر خصائص پر مقدم رکھا۔علومِ جدیدہ کی روشنی سے جدید غزل میں تخیل وادا کی جو خوبیاں پیدا ہوگئیں وہ اس اردو غزل کے کسی دور میں عام نہیں تھیں۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں

> **''جنگ عظیم سے پہلے ہماری شاعری ایک خاموش اور پرسکون دریا کی طرح تھی ۔اس کے بعد اس نے طوفان کی تیزی اور بے لہری، تباہی اور غارت گری اور ذرخیزی وزندگی آگئی''۔**

(اردو غزل کا تاریخی ارتقاء۔غلام عباس رشیدی ۲۴۲ء) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔دہلی

بیسویں صدی میں غزل نے پھر ایک بار اپنا رنگ بدلنا شروع کیا اور کچھ ہی عرصے میں غزل میں ایک نیا انداز پیدا ہوا۔دہلی کے رنگ میں رنگی جدید شعراء کی غزلوں میں متانت وشائستگی، خیال میں وسعت ورفعت، اسلوب میں جدت کو دیگر خصائص پر مقدم رکھا۔جدید غزل نے تخیل کی پرواز اس بہترین پر طرز پر رکھی کہ اردو غزل کے کسی دور میں ایسا عروج و پرواز نہیں دیکھا گیا۔جدید غزل کے شعراء میں ان دور میں جنہیں خصوصی

اہمیت حاصل تھی آ یئے ان شعراء کے کلام پر مختصراً تبصرہ کریں۔

☆شاد عظیم آبادی: (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۷ء)

شاد کی ادبی شخصیت کو اہمیت ان کی غزلوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔انہوں نے غزل کو فکر و دین اور عارض و گیسو جیسے روایتی مضامین سے نکال کر کھلی فضا میں پرواز کروایا۔محض جذبات کی تسکین کا ذریعہ،معاملہ بندی، صنائع بدائع تک محدود نہ رکھتے ہوئے واردات قلب اور زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان بنایا۔غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میؔر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی داستانِ سرائی میں میؔر کی سی سادگی اور متانت پائی جاتی ہے۔سہل الفاظ ، چھوٹے چھوٹے فقرے اور سادہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں	کھلونے دے کے بہلایا گیا ہے
اگر مرتے ہوئے لب پر نہ ترا نام آئے گا	تو میں مرنے سے درگذرا میرے کس کام آئے گا
نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینہ اسی کا ہے	ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے
طلب کریں بھی تو کیا شئے طلب کریں اے شاد	ہمیں تو آپ نہیں اپنا مدعا معلوم
خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے	تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے
نازک تھا بہت کچھ دل میرا اے شاد تحمل ہو نہ سکا	اک ٹیس لگی تھی یونہی سی کیا جلد یہ شیشہ ٹوٹ گیا

شاد کی غزلوں میں عشقیہ،فلسفیانہ،اخلاقی وسیاسی ہر طرح کے مضامین ملتے ہیں۔اس طرح دیکھا جائے گا انہوں نے غزل کو صحیح معنوں میں وسعت اور مضامین کو جدت عطا کی ہے۔

ساتھ ہی موضوع کے لیے کبھی انھوں نے اپنی فن کی قربانی نہیں دی۔صداقت فن انہیں ہر حال میں عزیز تھا۔ وہ اشعار جن میں سماجی و سیاسی حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جن کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان میں عصری روح سمٹ آئی ہے۔ان میں بھی غزل کی روایتوں اور فنی صداقتوں کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔شاد شعر کو قلبی واردات کا آئینہ سمجھتے ہیں۔ جذبات کی صداقت ان کے نزدیک بہت اہمیت رکھتی ہے ان کی غزلیں فکری و معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ فنی خوبیوں سے بھی مالا مال ہیں۔زبان کی صفائی و سادگی ان کے اشعار کی نمایاں خوبی ہے۔الفاظ اتنے شیریں اور موزوں استعمال کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوتِ تاثیر سے دل و دماغ کو مسحور کر لیتے ہیں۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اٹھالے، ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا — بنتا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

ہستی دکھا گئی مجھے آئینہ عدم — اپنا تو ابتداء ہی میں انجام ہوگیا

گلی میں یارائے شاد سب مشتاق بیٹھے ہیں — خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئے گا

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی — نہ ابتداء کی خبر نہ انتہا معلوم

ہزار نقشِ قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے — جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی

☆ریاض خیرآبادی: (۱۹۳۴ء - ۱۸۵۳ء)

ریاض خیرآبادی ابتداء میں امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کے کلام میں داغؔ کا رنگ غالب تھا۔ ریاض کی شاعری ایک مخصوص زمانے میں اور مخصوص نفسیات کی محفلوں کی پسندیدہ شاعری تھی۔ ریاض تمام عمر شراب و شباب کی شاعری کرتے رہے لیکن عملاً دونوں اشیاء سے لاتعلق رہے۔ ندرت، بے ساختگی اور سادگی ان کے کلام کا امتیازی وصف ہے۔ کوئی شعر مشکل سے ایسا ملے گا جسمیں جلوہ و جام کا ذکر نہ ہو۔ ریاض کی مذہبی زندگی کا ان کی شاعری پر کوئی اثر نہیں پڑا اور فیصفی میں بھی اسی طرح کی شاعری کرتے رہے۔ خمریات پر جس قدر کثیر تعداد ریاض کے اشعار کی ہے کوئی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔

کم بخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا — واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

اچھی پی لی خراب پی لی — جیسی پائی شراب پی لی

وہ شراب کی باتیں وہ شباب کا رنگ — تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

لیٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے — الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

اتر گئی سر بازار شیخ کی پگڑی — گرہ میں دم نہ ہوں گے ادھار پی ہوگی

صراحی توڑ دوں، مے پھینک دوں مسجد میں جا بیٹھوں — تری خاطر میں اپنا گھر لٹا دوں پارسا ہو کر

فراغ مے ہے یا عرش بریں سے نور آتا ہے — کہ ساغر تاک سے بن کر چراغ طور آتا ہے

پی پی کے اس نے سجدے کیے ہیں تمام رات — اللہ مرے شکل زاہد شب زندہ دار کا

☆عزیزؔ لکھنوی (۱۸۸۲ء - ۱۹۳۵ء)

عزیز نے کلام غالب کا خاص طور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور اپنی شاعری کے لیے اسی کو نمونہ بنایا۔ انہوں نے غالب کے رنگ میں لاتعداد غزلیں کیں جو لکھنؤ میں اصلاحی شاعری کے نقیب رسالہ ''معیار'' میں شائع ہوئیں۔ غزلِ جدید کے مضامین میں وسعت پیدا کرنے اور طرز بیان کو تازہ لطافتوں سے آشنا کرانے میں عزیز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عزیز الفاظ کے استعمال کے معاملے میں بہت آزادخیال تھے۔ وہ نئے نئے الفاظ کثرت سے اپنے شعروں میں نظم کرتے تھے۔

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے	ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہوگئیں
تاثیر جذب عشق کو بدنام کیوں کردوں	سمجھوں محبت ان کو عداوت ہی کیوں نہیں
جسے ہو حسن ظن تم سے کسی سے بدگماں کیوں ہو	تمہارے عہد میں بدنام دورِ آسماں کیوں ہو
حسن شاہد ہے مری رنگینی تحریر کا	اک ادائے شوخ ہے جو رنگ ہے تصویر کا
وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگ جاں ہوگئیں	دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہوگئیں
قفس میں جی نہیں لگتا ہے آہ پھر بھی مرا	یہ جانتا ہوں کہ تنکا بھی آشیاں میں نہیں
صدا یہی جرس کارواں سے آتی ہے	چلے چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں
ہے فنا آموز ہر اک خط تری تحریر کا	رنگ اڑتا کہہ رہا ہے پیکر تصویر کا
رگ رگ میں ذوق بادیہ گردی تھا اس قدر	ہر زرہ میری خاک کا صحرائے گرد تھا

☆اصغرؔ گونڈوی (۱۹۳۶ء-۱۸۸۲ء)

اصغر کے کلام میں تخیل کی گہرائی جوش اور سرمستی پائی جاتی ہے۔ تصوف سے ان کی دلی تعلق تھا۔ اس کا بڑا گہرا اثر ان کے کلام پر پڑا۔ فلسفہ اور تصوف کے مضامین کو انہوں نے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ بقول خواجہ احمد فاروقی :

> **''اصغر غالبؔ کے خوشہ میں ہیں لیکن غالب کے یہاں ایک صحت مند ذہن ہے وہ کارآ گہی جو تجربات کی وادی میں سینے کے بل چلنے سے آتی ہے۔ اصغر کے یہاں رنگینی اور شائستگی اسلوب ہی سب کچھ ہے۔''**

(ذوق جستجو-ص۲۵۲(33)

اصغر کی غزل میں ان کی وجدانی اور روحانی دنیا ہی زیادہ فروزاں ملے۔ جس طرح غالب کا تخیل کہیں کہیں ماورائی تجربات کو نیم حکیمانہ ڈھنگ سے پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے اس میں شائستگی اور شکوہ بیانی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب شگفتگی اور دلکشائی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اصغر کی غزلوں میں یہی چنگاری فروغ پا کر شعلہ بن جاتی ہے۔ ان کی شاعری سے اکثر غالب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ — اسی سے رند رازِ گنبد مینا سمجھتے ہیں

ضوابط دین کامل کے دیئے ہیں ترے ہاتھوں میں — تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

جلوہ ذوق پرستش گرمی حسنِ نیاز — ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بت خانے میں

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ — اسی سے رند رازِ گنبد مینا سمجھتے ہیں

ضوابط دین کامل کے دیئے ہیں ترے ہاتھوں میں — تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

جلوہ ذوق پرستش گرمی حسنِ نیاز — ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بت خانے میں

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں — آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

عارض نازک پہ ان کے رنگ سا اک آ گیا — ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

لو شمع حقیقت کو اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جشن تبسم — اس شوخ کے ہونٹوں پہ اک برق سی لرزاں ہے

زاہد نے میرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا — رخ پہ تری زلفوں کو پریشان نہیں دیکھا

☆فانی بدیوانی

جدید غزل گو شعراء میں فانی کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فانی کے الم پسندی اور مرگ پسندی اور یاسیت پر اس قدر زور دیا گیا کہ ان کی شاعری کے دوسرے پہلو پسِ پشت جا پڑے۔ واقعہ یہ ہیکہ فانی کی غزلیں اپنے دور کے دوسرے غزل گو شعراء کے مقابلے میں زیادہ متنوع ہیں ان کے یہاں حسن و عشق کی مختلف وارداتوں اور کیفیتوں کے علاوہ تصوف کے مسائل

حیات و کائنات کی فلسفیانہ توجیہ بھی ملتی ہے۔ فانی کی غزلوں میں میر کا سوز و گداز اور غالب کا تفکر اور فلسفیانہ گہرائی شامل ہے۔ فانی کے یہاں متوازن حقائق پر مبنی زندگی کے مثبت پہلو کو نمایاں کرنے والے شوخ اور شگفتہ رنگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ فانی کا تخیل مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا محتاج نہیں ہے۔ سادہ الفاظ اور معمولی بندش میں بھی وہ بلند باریک اور نازک معنی رکھ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں جذبات، واردات، مشاہدات، تاثرات سب میں جدت اور لطف و اثر موجود ہے۔

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی	چاک داماں بھی با اندازۂ داماں نکلا
اک برق سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی	دیکھوں تیرے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی	آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہوگیا
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا	بات پہونچی تیری جوانی تک
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی کے امڈ آتا ہے	دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے
ابتدائے عشق ہے لطف شباب آنے کو ہے	صبر رخصت ہورہا ہے اضطراب آنے کو
اجل جو آئے اپنا بھی کام ہوجائے	تمام عمر کا قصہ تمام ہوجائے
آج روز وصال فانی ہے	موت سے ہورہے ہیں راز و نیاز
ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی	زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا
بدلا ہوا ہے آج میرے آنسوؤں کا رن	کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا
زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے	ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا
کیا چھپاتے کسی سے حال اپنا	جی ہی جب ہوگیا نڈھال اپنا

اس طرح فانی کو 'یاسیت کا امام'، 'بیوہ کا غم' یا 'سوز خواں' کا نام دے کر ان کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شاعری میں فکر و فن کا ایسا خوشگوار امتزاج اور دلوں میں اتر جانے والی کیفیت موجود ہے جو ان کے فن کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

☆ **حسرت موہانی** (۱۸۷۸ء-۱۹۵۱ء) فضل الحسن: نام- حسرت: تخلص

غزل کو عام روایات کے مطابق حسرت کی شاعری میں مرکزیت موضوعات حسن و عشق کو حاصل ہے لیکن ان کا عشق قدیم غزل گو شعراء کے عشق سے یکسر مختلف ہے ان کا عشق رسمی یا کسی بیمار

ذہن کا عشق نہیں۔ یہ ایک صحتمند ذہن کا عشق ہے جس کا اظہار غزل کی قدیم روایات کو نبھانے کے لیے نہیں بلکہ زندگی کی ایک حقیقت کے طور پر کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں خارجی بیانات اور حسن کی مختلف کیفیات کی مصوری ہمارے ذہن میں وہ گھٹن نہیں پیدا کرتی جو داغ اور جرات کے شعروں کو پڑھتے ہوئے ہوتی ہے۔ مثلاً :

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن　　آیا مرا خیال تو شرما کہ رہ گئے

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہوجائیے　　بندرہ پرور جائیے اچھا خفا ہوجائیے

سوتے میں جو دیکھا تھا رخ یار کا عالم　　آنکھوں میں یہ خنکی ہے اسی نور سحر ہے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے　　ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

خرد کا نام جنوں پڑگیا جنوں کا نام خرد　　جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز ہے

عرض کرم پہ ترک جفا بھی نہ کیجیے　　ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجیے

☆صفی لکھنوی

صفی لکھنوی بذات خود لکھنوی تہذیب کی آخری نشانیوں میں سے ایک تھے۔ قدیم تہذیب سے نقلیاتی وابستگی کے باوجود صفی نے ہمیشہ ادبی اجتہادات کو مقدم سمجھا۔ صفی کی انگریزی دانی نے ان کے غزلیہ شاعری کے کینوس کو وسیع نہیں کیا۔ اگرچہ ان کی غزل روایتی غزل سے کہیں مختلف تھی۔ اس کی وجہ سے مقدمہ شعروشاعری کے اثرات ہیں۔ ـــ

تو بھی مایوس تمنا مرے انداز میں ہے　　جب تو یہ درد پپیہے تیری آواز میں ہے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا　　زرا عمر رفتہ کو آواز دینا

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ　　کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

بلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہہ دو　　بستر گل پر کوئی خواب گہہ ناز میں ہے

☆آرزو لکھنوی

خالص دیسی زبان جو انہوں نے اپنی غزلوں میں استعمال کی ہے اور جسے ''خالص اردو'' کہا گیا ہے۔ اس سے کلام میں ایک عجیب دلربائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے کلام میں معاملہ بندی اور شوخی

بھی ہے۔ خالص اردو سے مراد یہ ہے کہ فارسی اور عربی کا کوئی لفظ جتنے الفاظ اور محاورے اور ترکیبیں ہوں وہ سب دیسی ہوں۔ فغانِ اردو، بہان اُردو، سریلی بانسری، میزان الحروف اور نظامِ اُردو ان کی تصانیف ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی	جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
اپنی اپنی بات کی ہے، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے	ہم ہیں کہ تلے ہیں مٹنے پر وہ ہیں کہ مٹاتے جاتے ہیں
بے کیف زندگی کا کوئی نتیجہ نہیں	دے اضطراب اب بھی جو خدا انتظار دے
افشائے راز، شانِ وفا، امتحان صبر	آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کیے
[آرزو بے اثر محبت چھوڑ	کیوں کر کے کام جب نہیں ہوتا

☆یگانہ (یاس یگانہ چنگیزی) (۱۸۸۳ - ۱۹۵۶)

یاس نے شاد عظیم آبادی سے اصلاح لی لیکن اپنا راستہ سب سے الگ نکالا۔ بلا کے ذہن مگر بڑے تندمزاج تھے اس لیے لکھنؤ میں کسی سے نہ نبھی اور آخری وقت تک معرکہ آرائیاں رہیں۔ یگانہ کی ذہنی کجروی اور اخلاقی تلخی کی وجہ سے انہیں عرصہ دراز تک نظر انداز کیا گیا۔ لکھنؤ میں یگانہ کے اہل زبان ہونے پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا۔ جس کی صفائی یگانہ کو ان الفاظ میں دینا پڑی۔

"اہل زبان وہ ہے جس کو اپنی زبان سے متعلق یہ یاد نہ ہو کہ کب سیکھی کیونکہ سیکھی کس سے سیکھی یعنی بغیر صرف حاصل کیئے بچپنے سے اسی زبان میں گفتگو کرتا رہا ہوں۔"

(چراغ سخن - یگانہ چنگیزی ص۲)(34)

غالب کی باریکیوں کو جس طرح یگانہ نے سمجھا ہے وہ اقبال کے علاوہ کسی دوسرے شاعر نے نہیں سمجھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہمیشہ غالب کے معترف رہے کبھی براہ راست اقرار کیا کبھی غالب شکنی کر کے اس کی عظمت واضح کی۔ یگانہ کی غالب شکنی اور غالب پرستی دونوں اپنی جگہ اہم ہیں۔ وہ غالب سے نہ صرف گہری ذہنی ہم آہنگی رکھتے ہیں بلکہ اعتراف بھی کرتے ہیں۔

دونوں دیوانے ہیں علی کے طالب	جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں قالب
مذہب میں، شاعری میں، قومیت میں	غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب
صلح کرلو یگانہ غالب سے	تم بھی استاد وہ بھی ایک استاد

یاس کی غزل میں زبان و بیان کا ایسا تخلیقی اور تمثیلی استعمال ہے جو عام شاعرانہ تجربے کو قاری کے لیے اس شخصی اور قیمتی تجربات سے زیادہ شخصی اور قیمتی بنا دیا۔ اسی میں یگانہ کی فنی اور جمالیاتی قدر و قیمت کا راز پوشیدہ ہے۔

نمونۂ کلام ؎

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا	خدا بنے تھے یگانہ مگر بنانا گیا
خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں	خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا
لہو لگا کے شہیدوں میں ہوگئے شامل	ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا
مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں ہوتا	پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں، کیا ہوں	سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

☆ترقی پسند تحریک

۱۹۱۷ء میں روس میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ روس کے محنت کش لینن کی سربراہی میں بادشاہ روز زار کے خلاق اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی اس فتح کو گونج دنیا کے ہر حصے میں سنائی دی۔ دنیا کو پہلی بار یکجہتی کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ محنت کش جنگی تعداد میں ان گنت تھے اور مٹھی بھر سرمایہ داران پر حکومت کرتے تھے۔ انقلاب کے نتیجے ساری دنیا میں یہ احساس عام ہوا کہ شاعر و ادیب جو اپنے سینے میں دردمند دل رکھتا ہے ظالم و مظلوم کی جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے انہیں بھی اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ادیبوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا کے مشہور مصنفین اور شعراء شریک تھے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی سجاد ظہیر اور راج آنند نے کی۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین اور شاعروں کی انجمن کا اجلاس ہوا۔ اس کے اعلان میں یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس کے اندازِ تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، رنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے

کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کونشوونما پانے سے روکیں جوفرقہ پرستی،نسلی تعصب اورانسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔ہم ادب کوعوام کےقریب لانا چاہتے ہیں اوراسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

ترقی پسندتحریک بہت جلد ہندوستان میں مقبول ہوگئی۔اس کے نتائج برآمد ہوئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ادب میں حسن کاری پرتوجہ کم ہوگئی مواداورموضوع پرزوردیا جانے لگا۔یعنی اب نظر اس پرنہیں رہی کہ پیش کش کا انداز کیا ہے بلکہ ساری توجہ اس پرہوگئی کہ کیا کہا گیا ہے۔ابہام شعر کے حسن میں اضافہ کرتا ہے لیکن ترقی پسند ادب تو عوام کے لیے تھا۔اس لیے ضروری ہوا کہ وہ عوام کی زبان میں ہو۔مطلب یہ کہ سادہ وسہل ہواس میں کسی طرح کا ابہام یا پیچیدگی نہ ہو۔

اس ترقی پسندتحریک کی بدولت اردوشعروادب میں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ جہاں پہلے ایک خاص طبقے کی ذہنی تفریح مہیا کرتی تھی اب یہ جمہور کے احساسات کی ترجمان بن گئی۔ پہلے شعراءنوابوں اوررئیسوں کے دست گر تھےاورانہیں خوش کرنے کے لیےشعروشاعری کی محفلیں سجایا کرتے تھےمگراب یہ اس محفل سے باہرنکل آئے ان کی آوازعوام کی آوازتھی۔ان کی نظمیں بڑے طبقے کے دلوں کوگرما رہی تھی۔اردوشعروادب کوزندگی اوراس کے مسائل سےقریب لانے کی پہلی شعوری کوشش تھی۔حقیقت نگاری کوفروغ حاصل ہوا۔ادب کی افادیت پرزوردیا گیا۔موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا۔ ادب عوام کی امنگوں کا ترجمان بنا۔ اب ادب صرف مسرت حاصل کرنے اور وقت گزارنے کا ذریعہ نہ رہا بلکہ زندگی کوسنوارنے اوربہتر بنانے کا ذریعہ بنا۔

دھیرے دھیرے یہ تحریک نعرہ بازی اور پروپگنڈہ بن کے رہ گی۔ادبی اقدارکونظرانداز کرنے پرادب ادب نہ رہ کرکسی پارٹی کے پرچار کا ذریعہ بن گیا جس کی وجہہ سے اس کی دلکشی اور جاذبیت ختم ہوگئی۔اس تحریک نےغزل کوناپسند کیا وہ اس لیے کہ اس میں انہیں پیغام کی گنجائش کم نظر آئی۔ بیشترترقی پسند شعراء کے نزدیک غزل ایک نکمی صنف تھی صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اس سے کچھ لطف لیا جاسکتا تھا۔ترقی سندتحریک انقلاب تبدیلی،عمل آزادی،رجائیت کوہی اصل ترقی مانتی تھی وہ ایسے سبھی خیالات کوردکرتی تھی جس سے روایت کوتقویت ملتی تھی۔وہ عوام میں جوش وخروش اور نئے زمانے کی تشکیل کے لیے ہمت اور جرأت بھردینا چاہتی تھی۔اس کے پیش نظر بھی انہیں غزل ناکارہ صنف لگی۔اس ضمن میں صدیق الرحمٰن قدوائی کا خیال ہے کہ ۔

''غزل کے اسی نظام کی تشکیل جاگیردارانہ عہد کے جس عشق اور تصوف نے کی تھی وہ مجہولیت، گھٹن اور شکست خوردگی کے پروردہ تھے۔ یہ سب چیزیں ترقی پسندی کے منافی تھیں۔''

35 (ترقی پسند ادب- پچاس سالہ سفر-قمر رئیس- عاشورہ کاظمی ۱۹۸۷، ۴۸)

ترقی پسند تحریک نے غزل کے خلاف پھر ایک بار احتجاج کی آواز بلند کی جو اس سے قبل حالی نے شروع کی تھی۔ غزل کی اس مخالفت کے باوجود بھی غزل سے پوری طرح ترقی پسند شعراء اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکے۔ تحریک کی ابتداء ہی سے ہمیں ترقی پسند شاعروں کے یہاں غزل کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تلک کی ترقی پسند غزل کا انتخاب یہ ثابت کرتا ہے کہ بیشتر ترقی پسند شاعروں میں مماثلت ہے۔ ایک اجتماعی آواز کے مختلف پہلو مختلف شاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تنوع نہیں ہے۔ ہندوستان کو آزادی برائے نام ملی ہے۔ آزادی وہ ہے جس میں سارے لوگوں کو برابر حقوق حاصل ہوں اور زندگی کو پھلنے پھولنے کا حق میسر ہو۔ ہمارے یہاں جمہوریت کاغذ پر ہے۔ عمل میں اب بھی ایک طبقہ زیادہ بڑے طبقہ کے حقوق پر قابض ہے۔ پہلے غیر ملکی حکمرانوں کے غلام تھے آج ملکی حکمرانوں کے تشدد کے شکار ہیں۔ لوگوں کو مغالطہ ہوا کہ آزادی مل گئی ہے۔ عوام کے لیے وہی دورِ غلامی اور غربت و ناانصافی کی فضا عام ہے۔ حکمراں طبقے کی ناانصافی کا غصہ اور جدوجہد سے حاصل کی گئی آزادی کی خوشی یہ اکثر اس وقت کے شعراء کے خاص موضوع رہے ہیں۔

آتی ہی رہے ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے، اعلانِ بہاراں ہوتا تھا

مجروحؔ سلطانپوری

کہاں ہے نور کی منزل، کہاں ہے صبح کا ڈیرا
اگر یہی ہے سویرا، تو چیز کیا ہے اندھیرا

منظورؔ عارف

غریب اور ابھی کچھ لہو کے گھونٹ پئیں
ہے انقلابِ غریباں کا انتظار ابھی

احسانؔ دانش

ترقی پسند غزل کے شعراء کو دیگر شعراء سے الگ نہ سمجھا جائے کیوں کہ غزل ایک شعری رویے کا نام ہے۔غزل کی شاعری کے لیے کچھ محدود و مخصوص مضامین طئے نہیں ہیں۔ جب ترقی پسند غزل اور اس سے متاثر ہونے والی شاعری کو غزل سے الگ بیان کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ترقی پسند غزل میں حسن وعشق، شاہد وشراب، لطف ونشاط کے بجائے جوش وانقلاب، عزم وعمل کا اظہار ہوتا ہے۔ترقی پسند غزل انفرادی احساسات کے بجائے ایک طئے شدہ نظریات کے طئے شدہ بیانیہ اسلوب سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ ترقی پسند غزل میں واقفیت، معنی خیز حقیقت نگاری، وضاحت، مارکسی افادیت ضروری ہے۔غزل میں جمالیاتی قدر، انفرادی احساس، اظہار اور شاعرانہ صناعت جو غزل کی روایت کی توسیع کرتے ہوئے نئے تجربات کو ایک انفرادیت کے ساتھ پیش کرسکیں غزل کا ارتقائی کردار بناتے ہیں۔ حالی اور ان کے سلسلے کے کئی شاعروں اور نقادوں نے شعر میں مقصدیت، کو قدر اوّل بتایا اور یہ مقصدیت اخلاق کے تابع ہونی ضروری تھی۔افادی غزل کے بعد اسی کا انتہا پسندانہ اور سیاسی روپ ترقی پسند غزل بن کے ابھرا۔اس مقصدی غزل کے ردعمل کے طور پر خالص غزل کا ایک محدود تصور بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں ابھرا، جو غزل کو صرف داستانِ عشق تک محدود و مخصوص کردیتا ہے۔مثلاً

> **''حسن ومحبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے۔وہ مخصوص ہے اس جذبہ سے جو جنسی کشش اور خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔محبت ماں، بھائی، اولاد اور اعزہ واحباب سے بھی ہوتی ہے لیکن ان میں کوئی غزل کا موضوع نہیں، اس کا تعلق ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں جنسی ہیجان پیدا ہوسکتا ہے۔** 36 (انتقادیات- دوسرا حصہ نیاز فتح پوری، ص۱۱۲)

نیاز فتح پوری کا خیال کہ محبت اور صرف جنسی محبت غزل کا موضوع ہے۔دو انسانوں کی ایسی ذہنی اور رومانی محبت جس میں جنس کا ہیجان نہ ہو غزل کا موضوع ہو ہی نہیں سکتے۔ نیاز کا یہ خیال حقیقت پر مبنی ہو ہی نہیں سکتا۔قدیم اور جدید غزل میں ایسے اچھے اشکار ملیں گے جن کا جنس سے کوئی تعلق نہیں۔ اور ایسے خراب اشعار بھی ملیں گے جو جنس سے بھرپور ہیں مگر اپنی وضاحت پھوہڑ پن سطحیت یا اظہار بیان کی کمزوری کی وجہہ سے کسی شمار میں نہیں آتے۔لہٰذا یہ بیان کہ غزل کا تعلق کسی مخصوص موضوع سے ہے غلط ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ ایک مخصوص شاعرانہ رویہ اور وضاحت کسی بھی موضوع کو غزل بنا سکتا ہے۔

تو نے دیکھی شکست دشمن کی ہو ذرا اپنی فتح سے دو چار
جنگ عالم کا خاتمہ مت پوچھ اک قیامت ہے آندھیوں کا اتار

فراق-زمانہ کانپور-جولائی ۴۷ء

دوسری جنگ عظیم کے بعد اخلاقی اور روحانی قدروں کی جو شکست وریخت پوری دنیا کو برداشت کرنی پڑی ہے اس سے فاتح قومیں بھی دوچار ہیں۔فراق کے یہ اشکار اسی سوجھ بوجھ کا غزلیہ اظہار ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ترقی پسند شعراء انقلابی خیالات اور باغی رجحانات اور سرکشی کے باوجود فنی اظہار میں کلاسیکی تھے۔موضوعات کے لحاظ سے وہ کتنے ہی جدا کیوں نہ ہوں، اشارات و کنایات، الفاظ وتراکیب میں وہ روایتی غزل سے بہت قریب تھے۔ لفظوں کی ترکیب ان کا آہنگ کلاسیکی مزاج ان کی رہبری کررہا تھا۔مجہولیت، فرار، بیزاری، قنوطی کیفیت، مریضانہ بے بسی اب سے پہلے کی غزل کی بنیادی خصوصیات تھی۔ترقی پسند غزل کی صفت رجائیت ہے۔ایسا نہیں کہ اس میں غم اور درد کی کسک نہ ہو۔ مایوسی اور ناکامی نے بھی آج کے شعراء کو افسردہ کردیا ہے۔اس کا سینہ بھی درد سے پر ہے۔آنکھ سے آنسو بھی بہہ نکلتے ہیں مگر وہ زندگی سے بیزار نہیں۔اس کا غم ایک صحت مند انسان کا فطری غم ہے۔ وہ موت کی آرزو نہیں کرتا اسے اپنے او پر اعتماد ہے اسے پوری امید ہے کہ خیر وشر کی جنگ میں آخر کار خیر کی فتح ہوگی۔ترقی پسند شاعروں کو انسانی عظمت کا عرفان مارکسی نظریات تاریخی مطالعے اور جمہوری قوتوں کے سارے عالم میں فتح یاب ہونے سے حاصل ہوا۔سونے پہ سہاگہ تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت ایسے موضوعات ہیں جن سے اس دور کا شاعری شاید ہی اپنے آپ کو بچا سکا ہو۔غزل گو شاعروں نے ان موضوعات اور ان سے متعلقہ دوسرے موضوعات کی عکاسی بڑے دلفریب انداز میں کی ہے۔

قفس توڑ کر مطمئن نہ ہو بلبل
قفس صورت آشیاں اور بھی ہیں

جگر

خزاں کے بعد گلشن میں بہار آئی تو ہے لیکن
اڑا جاتا ہے کیوں اہل چمن کا رنگ کیا کہیے

روش صدیقی

سنتے ہیں کہ کانٹوں سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں
(مجروحؔ)

افراتفری اور انتشار کے دور میں جذبات پر قابو نہیں رہ پاتا۔اور شاعر وادیب کا ردعمل فوری ہوتا ہے۔اس دور کی غزلیں طویل میں اور مسلسل خیالات کی ترجماتی کرتی ہیں۔پھر ۱۹۴۹ء کے منشور سے ترقی پسند تحریک میں جو انتہا پسندی داخل ہوئی اس سے اس دور کی تمام غزلوں میں یکسانیت آ گئی۔ غزلیں ایجاز واختصار کا نمونہ ہونے کی جگہ طویل اور سپاٹ ہوگئیں۔ان میں غزل کی ایمائیت اور رمزیت کم تھی۔خارجیت،خطابت اور موضوعات کی تکرار زیادہ تھی۔تخلیق کے اعلیٰ نمونے اس دور کی غزلوں میں کم ملتے ہیں۔

ترقی پسند غزلوں میں ذاتی احساسات وجذبات کی کمی ہے اور شعراء کی انفرادیت کا پتہ نہیں چلتا۔موزوں ارطرز بیان میں یکسانیت کی وجہہ سے ترقی پسند غزل بھی جلد ہی رسمی ہوگی۔شعراء نے غزل کے موضوعات اور تصورات کو بے پناہ وسعت دی مگر ساتھ ہی انہوں نے زبان وبیاں کے مروجہ سانچے کو بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی یہی اس تحریک کی خامی رہی ہے۔

☆**فیض احمد فیض** (۱۹۱۲ء - ۱۹۸۴ء)

ترقی پسندوں میں دوبارہ غزل کو مقبول عام بنانے کا سہرا عام طور رلوگ فیض کے سرباندھتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ غزل میں سیاسی اور سماجی مسائل کو غزل کی مخصوص علامات کے ساتھ پیش کرنے میں فیض کو اولیت حاصل ہے۔

قمر رئیس کی رائے ہے کہ

" آزادی کے بعد برصغیر ہندوپاک میں غزل کو جو حیات بنو ملی ہے اور اس کی مقبولیت میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں فیض کی غزل کا نمایاں حصہ رہا ہے۔"

اردو غزل-مرتبہ کامل قریشی:ص ۲۶۸

فیض کی غزلوں میں زندگی اور اس کی کشمکش کا بیان مختلف انداز میں ملتا ہے کہیں کہیں یہ کشمکش اتنی شدید ہوگئی ہے کہ حسن وعشق کے موضوعات ان کے بیانات کے پس منظر میں چلے گئے ہیں لیکن وہ غزل کی روایات اور رمزیت اور علامتوں کے ذریعہ ان سنگین حقیقتوں کو غزل میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کہیں غزل کا فرز مجروح نہیں ہوتا۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

جنوں میں جتنی بھی گذری بکار گذری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم بھی مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

واعظ ہے نہ زاہد ہے ناصح یا نہ قاتل
اب شہر میں یاروں کس طرح بسر ہوگی

چاند دیکھا تیری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

در قفس پر اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

واعظ ہے نہ زاہد ہے ناصح ہے نہ قاتل
اب شہر میں یاروں کس طرح بسر ہوگی

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

در قفس پر اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

فیض ایک ایک لفظ کا استعمال غور و فکر کے بعد کرتے۔ شعروں میں تراش خراش کا عمل مسلسل جاری رکھتے اور تمام شعری وسائل کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے شعروں میں دلکشی، ترنم، پیکر تراشی، پرلطف تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ غالب و میر کے ہم پلہ نہ سہی مگر اس دور کے نامور شعراء میں گنے جاتے ہیں۔

غزل کی سحر کاری اور جادوگری کو جس طرح فیض نے محسوس کیا اور سمجھا ہے وہ انداز کسی اور ترقی پسند شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ ان کی غزلوں میں دلکشی اور سرشار کر دینے والی کیفیت ہے۔ فیض وہ شاعر ہیں جنھوں نے ترقی پسندوں کی غزل مخالف تحریک کا جواب اپنی غزلوں سے دے کر ان کی نعرے بازی اور کھوکھلے پن کا بھرم کھول کر رکھ دیا۔ ان پر ترقی پسند نہ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا مگر انہوں نے اپنی روش ترک نہ کی۔ فیض نے کلاسیکی اور فرسودہ علامت کو نئی معنویت سے روشناس کروایا۔ ان کی علامتی نظام کی تشریح محمد حسن اس طرح کرتے ہیں۔

"فیض کی غزلیں احساس کی طرح داری اور اظہار کی قدرت سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کی غزل کا نیا لہجہ قید و بند کی دین ہے۔ زبان اور حکم پر پابندی لگی تو اظہار کے علامتی

پیرائے اختیار کیئے جانے لگے اور محبوب رقیت اور محتسب کی فرسودہ علامتوں میں نئی معنویت پیدا ہونے لگی۔ ان غزلوں میں اداسی اور احتجاج ظلم اور تاب مقاومت کی ایسی دھوپ چھاؤں ہے جو اُن کی غزل کو دوسرے غزل گویوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیوں کہ محض تخیل سے نہیں بلکہ عملی تجربے کے دکھ سے ابھری ہے اور آپ بیتی میں جگ بیتی سے زیادہ تاثیر ہوتی ہے اور دکھ بھی۔ 37 (معاثر ادب کے پیش رو-۶۴ م ڈاکٹر محمد حسن- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ۱۹۸۲ء)

فیض کی شاعری تجرباتی شاعری ہے انہوں نے زندگی کے تجربات میں قلبی سوز گداز شامل کر کے اس امتزاج سے اپنی غزلوں کا خمیر تیار کیا۔ علامت نگاری میں اپنا ایک علاحدہ مقام انہوں نے بنایا۔

''نقش فریادی'' ۱۹۴۱ء سے ''میرے دل میرے مسافر'' ۱۹۸۱ء تک فیض کے کل سات مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان میں غزلوں کی تعداد چوراسی ہے اس تعداد میں وہ مقبولیت حاصل کر پانا عام شاعر کے باس میں نہیں۔ پروفیسر قمر رئیس اس بے پناہ مقبولیت کے زیراثر لکھتے ہیں

''سچ تو یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی شاعر نے تعداد میں اتنی کم غزلیں کہہ کر ایسی بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہو اور اپنے رنگ سخن سے ہم عصر شاعروں کو اس درجہ متاثر کیا ہو۔'' 38 (اردو غزل- مرتبہ: کامل قریشی، ص۲۹۰)

بعض ناقدین فیض کی شاعری کو رومانی شاعری کا نام دیتے ہیں لیکن ان کی رومانیت سماجی حقیقت پسندی کی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ مظلوم انسانیت کے دکھ درد کو اپنا درد سمجھتے ہیں اور ان کے روشن مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر و خیال احساس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں.

وہ بات سارے فسانے میں جس کا نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے، سو ہم کرتے رہیں گے

ہاں تلخی ایام ابھی اور بھی ہیں
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے ہیں

☆مجروح سلطانپوری (۱۹۱۸ء)

مجروح غزل کے شاعر ہیں اور ترقی پسند تحریک نے غزل کو اس لیے اہمیت نہیں دی کہ غزل اس طرح پیغامبری نہیں کر سکتی جس طرح نظم کر سکتی ہے۔ غزل نے آخر کار اپنی توانائی کا لوہا منوالیا۔ غزل اشارے اشارے میں ہر بات کہہ جاتی ہے اور اس طرح کہ دل پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مجروح کی غزل زمانے کے تقاضے سے منہ نہیں موڑتی۔ علاوہ ازیں ان کی غزل میں ناسازگاری زمانہ کا احساس ہے مگر اس کے آگے سپر ڈال دینے کا رویہ نہیں۔ اس سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہے۔ یہ زندگی کا ترقی پسند رویہ ہے اور انہیں ان شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے جنہوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور مظلوموں کی حمایت کی لیے سینہ سپر ہو گئے۔ مجروح غزل کے شاعر ضرور ہیں مگر روایتی غزل کے نہیں۔ انہوں نے غزل کو ایک نیا انداز دیا۔ انہوں نے غزل کی مریضانہ ذہنیت کو دور کیا۔ ان کا لہجہ بے باک اور بلند آہنگ تھا۔ ان کی غزل میں عہدِ حاضر کے سارے کرب، پوری کشمکش، حالات بند استعار اور کبھی کبھی غزل مسلسل کا سہارا لیتے ہیں۔ مجروح نے یہ بے حد مشکل کام کر دکھایا کہ عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے باوجود ان کی غزل غزل رہی۔ اس کی دلکشی نہ صرف باقی رہی بلکہ بڑھ گئی۔ وہ زیادہ گوئی کے قائل نہیں کم کہتے مگر خوب کہتے۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے	ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر	لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
مجروح وہ لکھ رہے اہلِ وفا کا نام	ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح
کچھ بھی ہوں پھر بھی دکھے دل کی صدا ہوں ناداں	میری باتوں کو سمجھ تلخی تقریر نہ دیکھ
ڈرا کے موج طلاطم سے ہم نشینوں کو	یہی تو ہے جو ڈبویا کئے سفینوں کو
دشمن کی دوستی ہے اب اہل وطن کے ساتھ	ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

ترقی پسند غزل کے بارے میں مجروح کہتے ہیں...

"..ترقی پسند غزل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عصری احساس کا غزل کی روایت میں سمو کر اظہار کیا جائے۔"

39 (اردو غزل کا تاریخی ارتقاء- غلام آسی رشیدی- موڈرن پبلیکشن ہاؤس، دہلی ص ۲۶۰) (2004)

موضوعات کے لحاظ سے مجروح نے مارکسی نظریات سے متعلق اہم خیالات کو اپنی غزلوں میں برت کر دکھایا۔ مثلاً تاریخ کی مادی تشریح، محنت کش طبقہ کی اہمیت، طبقاتی کشمکش، انقلابی جوش، رجعت پسندی اور سرمایہ داری کے خلاف جنگ یہ امید کہ فتح محنت کش طبقہ کی ہوگی۔ اس جنگ میں ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہونا ان تمام باتوں کو مجروح نے اپنی غزل میں سمویا اور موضوعاتِ غزل میں وسعت پیدا کی۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

مجروح ترقی پسند غزل کی تمام خصوصیات پر کھرے اترنے والے جدید شعراء میں سے ایک ہیں جنھوں نے غزل کو نیا آہنگ، تازگی اور رجائیت سے ہم آہنگ کیا۔ پروفیسر محمد حسن نے اس لئے مجروح سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا۔

''مجروح پہلے جدید غزل گو شاعر ہیں جس نے عہد جدید کو امیجری اور آراستگی بیان کے کلاسیکی رچاؤ کے امتزاج سے ایک نیا مرکب تیار کرنے کی کوشش کی۔''

40 (جدید اردو ادب- محمد حسن- صفحہ ۱۶۹)

☆**معین احسن جذبی**: (آمد ۱۹۱۲ - ۲۰۰۵ء وفات)

معین کی شخصیت میں سوز و گداز، غم کی آگ میں ڈوبی ایک فطری افسردگی کی کیفیت تھی۔ اور میر و غالب کی غزل کی روایت آپ کے سامنے تھی یہی وجہہ ہے کہ ترقی پسند نوجوان شعراء میں اکیلے ہی ایسے شاعر تھے جو غزل کو اس کی پوری معنویت کے ساتھ برت سکے۔ ان کی غزل میں نیا نکھار نیا انقلاب تھا وہ سماجی و سیاسی مسائل کا تذکرہ اس خوبی سے کر جاتے کہ معنوں ان کے خاص موضوع ہوں۔

اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو
آج اسی عقاب کے بال اِدھر ہیں پر اُدھر

شکست و فتح نصیبوں سے اب نہیں جذبیؔ
کہ آج ہے دل ہر ناتواں میں عظیم و یقین

جب کشتی ثابت سالم تھی ساحل کی تمنا کون کرے
اب ایسی شکستہ کشتی پر، ساحل کی تمنا کون کرے

اس طرح ہوگی تکمیل جستجو کی
ہر سمت دیکھتا ہوں تصویر آرزو کی

جذبی غزل کی مخالفت کے زمانے میں بھی اس کی حمایت کرتے رہے۔ جذبی نے اپنے احساسات کی سادگی سے غزل میں ندرت اور دلکشی پیدا اس کی وہ غزل میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے جن الفاظ تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتے ہیں وہ اپنے اندر منفرد خصوصیت رکھتے ہیں۔ جذبی نے زندگی کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور تجربات حاصل کیے اور تجربات کی جو دولت جذبی کے ہاتھ لگی انہوں نے بہت ایمانداری کے اور سلیقے سے انہیں شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔ لب ولہجہ منفرد طرز احساس کے ساتھ رسم ورواج کی پرواہ کئے بغیر چلنے والے معین احسن جذبی پر کئی طرح کے اعتراضات بھی کئے گئے۔ ان پر دباؤ بھی ڈالا گیا مگر وہ اپنے فیصلہ اور طرز راہ پر ڈٹے رہے۔ ''فروزاں'' کے دیباچہ میں انہوں نے اپنے اوپر اٹھے اعتراض کا جواب اس طرح دیا۔

''سیاست مصلحت کو بہت کچھ دخل ہے لیکن مصلحت پر شعر کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ مصلحت میں جزوی صداقت ہوتی ہے شاعری کامل صداقت چاہتی ہے۔''

جذبی آخر تک اسی اصول پر اور یقین پر کاربند رہے۔ ''آج کل'' کے مدیر رہے۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں استاد رہے۔ فروزاں، سخن مختصر اور گداز شب ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ جدید غزلیں اس توازن اور ضبط کے ساتھ کہیں کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن ''جذبی کا آرٹ ضبط وتوازن کا آرٹ ہے۔'' نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

جب بھی محبت کا نام سنتا ہوں ہائے کتنا ملال ہوتا ہے
مری عرض شوق بے معنی ہے ان کے واسطے ان کی خاموشی بھی ایک پیغام ہے میرے لئے

جب بھی محبت کا نام سنتا ہوں　　ہائے کتنا ملال ہوتا ہے
مری عرضِ شوق بے معنی ہے ان کے واسطے　　ان کی خاموشی بھی ایک پیغام ہے میرے لئے

☆اسرارالحق مجاز

مجاز کی غزلوں میں مصنوعی جذبات کی جگہ حقیقت کی عکاسی نظر آتی ہے۔فکر و فلسفہ اور مسائل تصوف کا بیان، لذت پرستی، مریضانہ کیفیت سے پرے یاسیت اور قنوطیت کے منفی رجحانات سے اپنے آپ کو اپنی غزلوں کو بچائے رکھا۔

ان کی غزلیں ایک صحت مند انسان کی وارداتِ قلبیہ اور فطری جذبات کی عکاس ہیں۔ نشاطیہ آہنگ، مزاج کی رومانیت اور غنائی لب و لہجہ کی بنیاد پر وہ لوگوں کے چہیتے شاعر بن گئے۔

تم ہی تو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچالو کہ ڈوبتا ہوں میں

ترقی پسند تحریک سے وابستہ مجاز کو انسانی جذبات کی عکاسی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ شخصیت کی تعمیر میں معاشی مسائل کارفرما ہو یا جذبۂ عشق، وہ اس کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ ہر زاویے سے اسے پرکھتے ہیں اور پورے فنی آداب کے ساتھ اسے شعر کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں انہوں نے تحریک کے پرچار کے ساتھ ساتھ شاعری کے فنی تقاضوں کی طرف زیادہ توجہ دی۔ ہنگامی موضوعات اور وقتی مسائل سے ہٹ کر دیرپا موضوعات کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا۔غزل کے مقابلے ان کی نظمیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں کھولی بھی نہ تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

مٹتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رو نہ دیں مجاز	آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں
سب کا مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا نہ کر سکے	سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے
بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی	بارہا مستی میں لب پر ان کا نام ہی آ گیا
کیوں مجاز آپ نے ساغر توڑا	آج یہ شہر میں چرچا کیا تھا
بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا	تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

پھر مری آنکھ ہوگئی نمناک	پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے
تم مجاز دیوانے، مصلحت سے بیگانے	ورنہ ہم بھی بنا لیتے تم کو رازداں اپنا
ہنس دیئے وہ مرے رونے پر مگر	ان کے ہنس دینے میں بھی اک راز ہے

بقول عزیز احمد :

''مجاز کی شاعری انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج ہے۔''

42 (ترقی پسند ادب-عزیز احمد ص ۱۳۰)

☆غلام ربانی تاباں

تاباں کے مزاج کی نفاست، خواص پسندی اور حسن پرستی نے انہیں خاص سطح سے نیچے اترنے نہیں دیا۔ وہ جنسی لذت پرستی اور ابتذال سے ہمیشہ دور رہے۔ ترقی پسند شاعر تھے لیکن ترقی پسندوں کی دہشت پسندی اور واشگاف بیان اور خطیبانہ انداز سے ہٹ کر ہی غزلیں کہیں۔ کلاسیکی غزل سے بھر پور استفادہ حاصل کیا رسمی موضوعات اور معنوی جذبات کا سہارا لینے کی انہیں ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

کسے خبر تھی کہ یہ دن بھی دیکھنا ہوگا
میں آج بچ کے تری رہ گذر سے گذرا ہوں

تاباں نے اشترا کی نظریات کا ساتھ دیا۔ مگر جہاں تک ان کی شاعری کا سوال ہے۔ خاص طور پر غزلیہ شاعری کا اس میں وہ اس نئے دور کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔ جو ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد شروع ہوا اس اعتبار سے وہ اپنے بہت سے ادبی ہمسفروں کے ساتھ چلتے ہیں ان کی غزل مختصر ہے ان کی فکر جدیدیت کی طرف مائل ہے مگر زیادہ بہتر صورت میں وہ اس عبوری دور کی نمائندگی کرتے ہیں جب تو کلاسکیت، جدیدیت کی طرح شعوری طور پر آگے بڑھ رہی ہے۔

آج کسی نے باتوں باتوں میں جب ان کا نام لیا	دل نے جیسے ٹھوکر کھائی درد نے بڑھ کے تھام لیا
اک حادثہ شوق کہ دل بھول چلا تھا	آیا ہے کبھی یاد تو ہر زخم ہرا تھا
کس کو ملتا ہے غم زیست سے دنیا میں فراغ	ہاں کبھی تیری جفاؤں میں اماں پائی ہے
بہانہ ڈھونڈ لیا تجھ سے بات کرنے کا	کچھ اور مقصد عرض ہنر نہیں اے دوست

☆مخدوم محی الدین

ترقی پسند شاعر ہونے کی حیثیت سے مخدوم کی سوچ دل آویز اور اشعار فکر انگیز ہیں۔ مخدوم نے مزدور تحریکوں سے عملی طور سے واسطہ رکھا لیکن اس کے باوجود بھی ان کی شاعری میں وقت کا پیدا کردہ کھردہ پن کبھی داخل نہیں ہوا۔ ان کی غزلیں رومانوی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید افکار و خیالات سے آراستہ ہیں۔ جس میں پیکر تراشی کا عمل بھی شریک ہے۔ ایجاز و اختصار سے آپ کی غزل میں خوبصورتی پیدا ہوگئی جسے نگاہ انتخاب کی دین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی	رات ہے یا برات پھولوں کی
آپ کی یاد آتی رہی رات بھر	چشم نم مسکراتی رہی رات بھر
دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا	اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات
اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے	قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں
تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے	الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

عشق ک مخدوم کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ ان کے عشق میں روایتی عشق کی گھٹن اور انفعالیت کے برعکس ایک سرشاری اور سرمستی کا احساس ملتا ہے۔ مخدوم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن وقفے کے بعد جب انہوں نے دوبارہ شعر گوئی کی تو غزل کی طرف خصوصی توجہ دی۔ وارث کرمانی مخدوم کی نظم سے غزل کی طرف راغب ہونے کے عمل کو اس طرح دیکھتے ہیں۔

> **''مخدوم کے یہاں غزل گوئی تھک کر آرام کرنے کا کام دیتی ہے۔ مخدوم کی زندگی مجاہدانہ گزری جس میں ان کی شاعری رجز بن کر دوسروں کو اور خود ان کے عزائم کو گرماتی رہی انہوں نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں اکثر اچھی غزلیں کیں جس میں صحت مند عشق کی تازگی و صباحت پائی جاتی ہے۔''**

43 (اردو ادب آزادی کے بعد- مرتب خورشید الاسلام ۱۳۳)

مخدوم کی غزلوں کی خاصیت اس کی کلاسیکی رچاؤ، سوز گداز سے بھرپور شاعری جس میں نہ تو کوئی فکر ہے اور نہ فلسفہ، لیکن حسن و عشق ان کے لیے زندگی کے اندھیروں میں اجالا کرتا ہے۔ انہیں عزم اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔ رجائیت سے بھرپور لہجہ مخدوم کی غزل کو منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخر شب

چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیِ ایام بھی ہے

☆سردار جعفری

ترقی پسند تحریک ادیبوں اور شاعروں سے صناعی، پیچیدگی اور ابہام کے بجائے واشگاف لفظوں میں مظلوم محنت کشوں کی حمایت اور ظالم سرمایہ داروں کے خلاف کھلی جنگ کا مطالبہ کرتی تھی۔ اردو کے بلند پایہ مقرروں میں جعفری کا ~~شمار ہوتا ہے۔ ترقی~~ پسند غزلوں میں نہ صرف یہ کہ خیال کا تسلسل ملتا ہے بلکہ اس دور میں نقادوں نے ریزہ خیالی اور انتشار کی سخت مخالفت کی اور قدیم عشقیہ یا متصوفانہ غزلوں میں پائی جانے والے ریزہ خیالی کا تجزیہ اپنے خاص عقائد اور نظریات کی روشنی میں کیا گیا۔

آزادی کے بعد ملک میں حالات بدل گئے۔ظلم وستم ،قید و بند کی لمبی رات کے جو صبح نمودار ہوئی وہ امید افزا نہیں تھی۔ ملک تقسیم ہوگیا۔نقل مکانی، فرقہ وارانہ فسادات، آگ اور خون کی ہولی جس سے انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا۔ بہت سارے لوگ مارے گئے، بے گھر ہوگئے، یتیم ہوگئے، عورتیں بیوہ ہوئیں اس کا کوئی حساب نہیں۔نفرت تعصب کی آندھی میں سب کچھ برباد ہوگیا۔اقرار پامال ہوئیں۔تنگ نظری بڑھی مذہب اور ادب بھی متاثر ہوئے ہر طرف مفاد پرستی اور کرپشن عام ہوگیا۔ان حالات کا اثر غزل گو شعراء پر پڑا انہیں سردار جعفری پیش پیش تھے۔

فریب دے کر حیاتِ نو کا، حیات ہی چھین لی ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے، اگر یہی ہے نیا زمانہ

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر ہجوم رنج و محن وہی ہے

بدل گئے ہیں اگر چہ قاتل، نظام دار و رسن وہی ہے

سردار کی شاعری میں صاف گفتاری، بیانیہ انداز اور خطابت کا جوش بھرا نظر آتا ہے ان کی شاعری میں توانائی کا احساس ہوتا ہے مگر زندگی کی دھڑکن کم ہی سنائی دیتی ہے۔ وہ دلوں کو گرماتی ہے مگر روح کو جمالیاتی خوشی نہیں دے پاتی۔ یہاں تک کہ سیاسی واقعات اور اخبارات کی سرخیوں پر شعر کہنا سردار کا مشغلہ بن گیا تھا۔ ترقی پسند ادب فن کے مخصوص پیرائے میں بندھے ٹکے موضوعات کی وجہ سے ان کی شاعری میں یکسانیت اور تکرار پیدا ہوگئی تھی۔ ان کی غزلوں میں بھی نظم کا انداز حاوی نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی قادرالکلامی اور تنقیدی شعر کی بدولت بہت سارے غزل کے بہترین اشعار مل جاتے ہیں۔

دیکھتے رہیے کہ ہوجائے نہ کم شان جنون	آئینہ بن کے خود اپنے ہی مقابل رہیے
کتنی فرسودہ ہے یہ جرم و سزا کی دنیا	سرکش دل کو نیا ذوق گنہگاری دے
زبان تیغ میں کرتے ہیں پرسشِ احوال	اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کیجیے
تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاید	بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

☆احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء)

بنیادی طور پر احمد ندیم قاسمی ترقی پسند خیالات کے ترجمان کی حیثیت سے معروف و مقبول ہوئے۔ یوں مزاج کے اعتبار سے ان کی شخصیت میں نرمی اور رومانیت ہے اسی لیے ان کی اولین شعری کاوشوں میں جذبے کی فراوانی اور معصومیت ملتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد ان کے یہاں فکر کا عنصر نمایاں ہوجاتا ہے۔ مگر جب جب ندیم ذاتی کرب و احساس کو فکر و جذبے میں ڈبو کر غزل کہتے ہیں تو بہترین اشعار جنم لیتے ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہے جس میں حسن و عشق کے معاملات کو ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے مسائل اور انسانی عظمت کا احساس عکاسی ملتی ہے۔ ندیم کی شاعری میں حقیقت پسندی ضرور ملے گی۔ آزادی کے بعد کے حالات اور فسادات نے

ندیم کو بری طرح متاثر کیا۔تنہائی، حیران، بے بسی اور احساس کی شکست کی جھلک بھی ان کی غزلوں میں دکھائی دیتی ہے۔تو وہی عشقیہ اشار میں بھی نئی تازگی ملتی ہے۔ان کی غزلوں میں رسمی محبت کے آداب نہیں بلکہ واقفیت اور حقیقت تجربات کا عکس نظر آتا ہے۔ساتھ ہی ذاتی کرب و احساس کی جھلک اور جدت فکر اور ندرت اظہار سے غزلوں میں نیا جوش اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا	میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
تو نے کب مجھ کو دیئے ہیں میرے حقوق	میں ترا فرض کیا ادا کیا کرتا
اے ذوق پرواز اب ضبط کیسا	اٹھتی رہے گی زنداں کی دیوار
اتنا مانوس ہوں سناٹے سے	کوئی بولے تو برا لگتا ہے
جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے	مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا
چاند جب دور افق میں ڈوبا	تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی
اے خدا اب ترے فردوس پر میرا حق ہے	تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے
انداز ہو بہو تری آواز پا کا تھا	دیکھا نکل کے گھر سے جھونکا ہوا کا تھا
کس قدر تاریکیوں میں آگئے	ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
اک روز اس طرح مرے بازؤں میں آ	میرے ادب کو تیری حیا کو خبر نہ ہو
ہر بشر کو جو خدا پاس بلالیتا ہے	وہ خدا بھی تو کسی روز بشر تک پہنچے

احمد ندیم قاسمی ہمارے معروف ادب نگاروں میں ہے۔خوش فکر ادیب، بلند پایہ افسانہ نگار اور ایک معروف صحافی۔ان کی غزلوں جدیدیت سے قریب آتی ہوئی نظر آتی ہے۔اور اس معنی میں ان کی شاعری کا ایک سرا کلاسکیت سے ملا ہے تو دوسرا جدید شعری حیثیت سے جدید غزلوں کے جو نمونے ان کے یہاں ملے ہیں ان کو ساحر شعراء کے اثر و تاثیر سے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔

☆احمد فراز (۱۹۳۱ء)

احمد فراز ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔انہیں جدید شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔احمد فراز اپنے دلکش انداز، نفاست، سلیقگی اور مدھم آہنگ کی وجہہ سے کافی مقبول ہوئے۔روایتی غزل کو جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا اہم فریضہ انجام دیا۔فیض کی طرح سیاسی مضامین کو کلاسیکیت

کے سانچے میں ڈھالنے کا کام بھی کیا۔لیکن فراز کے یہاں عصر دراز کی پیچیدگیاں، بے اعتدالیاں، تضاد اور نفسیاتی کشمکش کو بھی انہوں نے موضوع سخن بنایا جب کہ فیض ان مراحل کو نظر انداز کر لیا کرتے تھے۔عشق و محبت کے موضوعات کے بعد جب وہ سیاسی اور سماجی مسائل کی طرف رخ کرتے ہیں اس وقت بھی وہ ٹھوس مسائل کے منطقی بیان سے گریز کرتے ہیں۔فکری شاعری کی جذبہ و کیفیت میں تبدیل کر کے دلکش بناتے۔رومانیت سے سیاسی حقیقت پسندی کا سفر طے کرتے ہوئے کہیں بھی اپنی شاعری کی ادبی قدر و قیمت میں کمی نہیں آنے دی۔ان کے یہاں خیال میں کوئی پیچیدگی یا الجھاؤ نہیں اس لئے انداز بیان میں بھی بے ساختگی اور سادہ پن ملتا ہے۔

ستم کے بعد میں چپ چاپ جی رہاں فراز	سو دوسروں کی طرح باضمیر میں بھی نہ تھا
میرے دامن کے مقدر میں ہے خالی اپنا	آپ شرمندہ نہ ہوں دست کرم سے اپنے
ہوا ہے تجھ سے بچھڑے کے بعد یہ معلوم	کہ تو نہیں تھا ترے اک دنیا تھی
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم	تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ
تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں	میں زخم زخم ہوں پھر تجھے دکھائی نہ دوں
وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھر کر آنکھیں	گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح
منصف ہو اگر تم تک کب انصاف کرو گے	مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

ترقی پسند تحریک سے وابستہ مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ تقریباً اس عہد کے دیگر شعراء میں ظہیر کاشمیری، محمد علی تاج، کیف بھوپالی شاد عارفی، پرویز شاہدی، منیب الرحمٰن، عزیز احمد، قتیل شفائی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ان میں چند شعراء کا یہاں مختصراً تذکرہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔ظہیر کاشمیری ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے۔انہوں نے عصری تقاضوں اور ترقی پسندانہ خیالات کو اپنی غزل کا حصہ بنایا۔ظہیر کاشمیری نے یہ احساس کرایا کہ غزل کا دامن بہت وسیع ہے وہ کہتے ہیں۔

غنچہ غنچہ میں ابھی تک ہے قفس کا شیدہ
برگ گل میں کف صیاد ابھی باقی ہے

سماجی مقصدیت کو اپنی غزلوں کا موضوع بنانے والے محمد علی تاج نے غزل کی روح سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی وہ قدیم روایتی غزل سے وابستہ رہے ان کا خیال تھا کہ سماجی مقصدیت کے ساتھ ان کی غزلوں میں وہ تمام فنی اور جمالیاتی خوبیاں موجود ہیں جو کسی بھی غزل کی پہچان ہوتی ہیں۔ حسن و عشق کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی طور پر ترقی پسند خیالات کی طرز بھی مائل ہیں۔ ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

درد سے چہرے کی تابانی بڑھی
گھر جلا تو آسمان روشن ہوا

تم اتنا حسن لے کر کیا کروگے
رے کچھ تو خدا کے نام کردو

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک اور شاعر کیف بھوپالی نے ہر موضوع کو اپنے غزلوں میں جگہ دی اور اسکے ساتھ ہی غزل کی روایت کی پاسداری بھی کی ان کی زبان کی دلکشی اور واقعات کی سرمستی نے ان کی شاعری کو زندہ و جاوید کر دیا وہ کہتے ہیں ؎

کچھ بیتے دنوں کی یادیں ہیں اور چار طرف تنہائی سی
مہماں ہیں کہ آئے جاتے ہیں محفل ہے کہ اجڑی جاتی ہے

ترقی پسند تحریک ایک ایسی تحریک ہے جس پر عوام کا ایک بڑا طبقہ عمل پیرا تھا۔ اس تحریک نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور معاشرہ میں آنے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور بہت جلد ادب میں انسانیت، جمہوریت، عصری و صحت مند خیالات کی ترویج و اشاعت کی حصہ دار بن کر مقبول عام ہوئی۔ ایک لہر تھی جو ہر طرف پورے جوش و خروش سے بہہ رہی تھی۔ ایک آواز پر پورا زمانہ لبیک کہنے پر آمادہ تھا۔ اسی دور میں کچھ ترقی پسندوں نے غزل کی مخالفت کی کہ یہ ناکارہ صنف ہے جس سے معاشرے کی اصلاح کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسے تنگ دامن مانا یا گیا جو فرد کے ذاتی خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ لیکن ان کے دوسرے خیالات کی طرح غزل کی مخالفت کا ارادہ بھی کھوکھلا نا ثابت ہوا۔ چند ایک شعراء کو چھوڑ کر ہر ترقی پسند شاعر نے غزل میں طبع آزمائی کی اور نئے نئے تجربات کر کے غزل کو اپنی شاعری کے حصار سے آزاد کروایا۔

ترقی پسند شعراء میں انجم رومانی، منیب الرحمٰن، نور مغلم، نیاز حیدر، سلیمان اریب، ابن انشاء، حسن بشیر، راہی معصوم رضا، مصطفیٰ زیدی، جیلانی، کامران وغیرہ نے کافی شہرت و مقبولیت حاسل

کی۔ان میں سے ہر ایک شاعر کا انداز الگ تھا جو اس دور کی غزل کی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔اس عہد کے شعراء نے کلاسیکی آداب کے ساتھ رمزیت کا دامن نہیں چھوڑا جس کی وجہ سے غزل اپنی تمام تر جولہ سامانیوں کے ساتھ بام عروج تک پہنچی۔

آزادی کے بعد یہ تحریک بے مقصد ہوکر زوال پذیر ہوتی گئی۔تقسیم ملک کے بعد شعراء بھی تقسیم ہو گئے۔لیکن غزل اپنے نئے روپ رنگ و آہنگ کے ساتھ روز بروز نکھرتی گئی۔دیگر عصری زبان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا گیا اور اس طرح ایک تحریک جو معاشرے کی اصلاح کے لیے وجود میں آئی اس نے معاشرے سے زیادہ ادب پر اپنے اثرات چھوڑے۔خصوصاً صنف غزل کے اس پہلو کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔جس سے ادیب اور عوام دونوں ہی ناواقف تھے۔ترقی پسند دور میں غزل نے معاشرے کی اصلاح کے ساتھ ہی بلند مقام حاصل کیا۔

آزادی کے بعد کی غزل کو مجموعی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک ترقی پسند غزل اور دوسری جدید غزل۔ترقی پسند تحریک میں مقصدیت کو اہمیت حاصل تھی۔رفتہ رفتہ اس ماحول میں تبدیلی آئی۔اجتماعی مقاصد کی جگہ فرد کے خیالات، احساسات اور تجربات ادب میں اہمیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔جب شعراء نے غزل کے ماضی کی طرف دیکھا تو وہ انہیں تابناک نظر آیا۔بہت سے شعراء اس دور میں میؔر کی پیروی کرتے نظر آئے۔

۱۹۵۶ء کے آس پاس ابن انشاء کا مجموعہ ''چاندنگر''، ناصر کاظمی کا ''برگ نے'' اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا ''کاغذی پیرہن'' منظر عام پر آیا۔ان شعری مجموعوں میں تازگی اور نئی بہار کی آمد کی دستک محسوس ہوتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ اردو غزل ایک اور نیا لباس زیب تن کر رہی ہے۔جدید اردو غزل کے ابتدائی رجحان کے سلسلے میں بہت سے ادیبوں نے مضمون لکھے جنہوں نے نئی فضا کی تشکیل میں مدد دی۔اور ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت شعراء میں تیزی سے مقبول ہوئی۔اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔اور آہستہ آہستہ جدیدیت نے ایک جامع شعری رجحان کی شکل اختیار کر لی۔یہ رجحان ترقی پسند تحریک کا ردعمل تھا۔غزل نے نئی روش اختیار کر لی اور جدیدت کے نام پر غزل میں ہر طرح کی بے اعتدالیوں کو جگہ مل گئی۔ہر سکہ کے دو رخ ہوتے ہیں ایک طرف جہاں اردو غزل آزادانہ فضا میں سانس لے رہی تھی اور غزل

میں زندگی کی کشمکش انتشار، تردد وغیرہ کو موضوع بنایا گیا تھا وہیں دوسری طرف جدیدیت کے نام پر بے اعتدالیوں کو بڑھاوا دینے والے شعراء نے ذات کے بحران کے مسئلے کو آج کے انسان کا

بنیادی مسئلہ بنادیا۔

نئ شعری روایت کی تشکیل آسان نہیں تھی۔صرف غزل میں نئے خیالات ور جحانات کو پیش کردیا بلکہ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ خیالات کا اظہار کس طرح کیا جائے۔تا کہ جدید غزل روایت کے بالکل خلاف نہ ہو۔ بلکہ روایت سے اس کا تعلق یقینی ہوجائے۔نئ غزل نے غزل کے طئے شدہ ڈھانچے کو توڑ دیا۔لیکن کچھ شعراء خوش اسلوبی سے یہ کام جدیدیت سے قبل انجام دے چکے تھے۔جن میں شاد عارفی، یگانہ اور فراق ایسے شعراء تھے جن کی آواز دور سے پہچانی جاسکتی تھی۔شاد عارفی نے پہلی بار غزل گوئی میں وہ انداز اپنایا جو حقیقت کے بہت قریب تھا۔ایسے موضوعات جن کو غزل میں پیش کرنے کا شعرا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔شاد عارفی نے ان موضوعات کو نہ صرف اپنی غزل میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا بلکہ انہیں خصوصیات کی وجہ سے غزل بلندی پر پہنچے۔کسی بھی نئے رجحان یا تحریک میں مختلف نظریات ہوتے ہیں اس طرح نئ غزل میں ابتداء ہی سے دوطرح کے رجحانات نمایاں رہے ہیں۔اس میں ایک رجحان کے شعراء وہ ہیں جو جدید میں لچک کی گنجائش کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ان کے مطابق انسان بے بس ہے وہ ایسے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے جو زوال پذیر ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس دنیا میں وہ تنہا ہے اس کا کوئی پرسان حال نہیں وہ مایوسی اور ناامیدی کی بدولت زندگی کی خوبصورتی اور وسعت سے نظر چرا کر صرف اپنی ذات میں قید ہوکر رہ جاتا ہے۔اس کی وجہہ سے انسان کے لہجہ میں کرختگی اور روکھا پن آجاتا ہے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پاتا۔اس لیے اس کے یہاں الہام اور الجھاؤ ہے زبان کی صفائی نہ ہونے کے برابر ہے۔یہی وجہہ ہے کہ ایسے شعراء کے یہاں ذاتی قسم کے علامات ملتی ہیں۔

جدید اردو غزل کا دوسرا رجحان وسیع معنی رکھتا ہے ان کے مطابق جدیدیت کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ کسی خاص تحریک یا فلسفہ کے اصول وضوابط کی پابندی اپنے اوپر مسلط نہیں کرتے۔ان کے مطابق نئے غزل گو کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہے اور بنا کسی قید و بند کے آزاد ہوکر سوچ سکتا ہے۔اطراف کا ماحول، انسانی جذبات واحساسات کا اظہار مکمل کرکر سکتے ہیں۔اس لیے ان کی غزلوں میں مختلف امنگ وآہنگ ملتے ہیں۔ مایوسی کے گھنے کہرے میں بھی یہ شعراء امید کی کرن تلاش کرلیتے ہیں۔علامتی بیان کے ساتھ ابلاغ، ترسیل کے بھی قائل ہیں۔اسی لیے تہہ داری کے باوجود بھی ان شعراء کی غزلیں باوجود بے معنی نہیں ہوتیں۔

جدید غزل کا پہلا رجحان رکھنے والے غزل گوشعراء یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غزل سے دلکشی، تہہ داری اور رنگا رنگی سرے سے غائب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تہہ کے آس پاس یہ رجحان جس تیزی سے مقبول ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں اس رجحان کے کمزور پہلو سامنے آئے۔ غزل کے دوسرے رجحان سے متعلق شعرا نے رمزیت کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ ان شعراء کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ پاکستان کے غزل گو شعرا میں ناصر کاظمی، مجید امجد، احمد مشتاق، شہزاد احمد، ظفر اقبال، منیر نیازی، ساقی، فاروقی، وزیر آغا، پروین شاکر اہم ہیں۔ ہندوستان میں ان کے ہم عصر شعراء میں خورشید احمد جامی، خلیل الرحمٰن، مظفر حنفی، شہر یار، محمود علوی، ندا فاضلی، زہیب غوری، بانی، بشیر بدر، حسن نعیم، فضا ابن فیضی، مخمور سعیدی، شاذ تمکنت وغیرہ اہم ہیں۔

غزل اپنی خصوصیت ایجاز واختصار کے لیے جانی جاتی ہے۔ اس خوبی کو قائم رکھنے کے لیے غزل نے رموز وعلائم، تشبیہات واستعارات وغیرہ سے کام لیا اور جب جدیدیت کے زیر اثر علامت نگاری کا رجحان بڑھا تو اس کا سب سے زیادہ اثر غزل نے قبول کیا۔ غزل ایسی صنف ہے جو ہر دور میں زندگی کے ساتھ قدم بہ قدم چلتی رہی اور جب غزل میں نئ علامتیں استعمال ہونے لگیں تو اس کا تعلق زندگی سے اور گہرا ہوتا گیا۔ غزل میں جو علامتیں استعمال کی گئیں وہ آس پاس کے ماحول اور اشیائے فطرت سے حاصل کی گئی تھیں۔ اور جب غزل نے معاشرے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو اپنے نزدیکی ماحول سے اخذ کیئے عناصر کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ غیر ملکی عناصر سے غزل نے اپنا دامن بچا کر غزل پر فارسیت زندگی کا الزام تھا اس سے وہ دور ہو گی۔

باب سوّم

جدید اُردو غزل میں سماجی و سیاسی مسائل

☆جدید اُردو غزل میں سماجی و سیاسی مسائل

غلام ہندوستان اور آزاد ہندوستان کے مسائل میں فرق ضرور ہے۔لیکن دیکھنا یہ بھی ہے کہ آزاد ہندوستان کے مسائل کتنے پیچیدہ ہیں۔مختلف مسئلوں کو نئے شعراء کس طرح دیکھ رہے ہیں۔آج جب کہ کل کے شعراء خاموش ہیں نئے شعراء کیا کچھ کررہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ کل شاعروں پر جتنی ذمہ داری نہ تھی اتنی ذمہ داری آج ہے۔ایسی صورت میں مختلف مسئلوں اور سماجی کشمکش کی کیسی جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں۔شعراء نعروں سے کام نہیں لے کر شاعری کی زبان اور اسلوب کی اہمیت کو کہاں تک سمجھ رہے ہیں۔جذبہ اور فکر، رومان اور حقیقت کا جائزہ کبھی اور کسی صورت میں جدید شاعروں کی اعلیٰ تخلیقات کی پردہ پوشی نہیں کرے گا۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے بعض بنیادی مسائل ایک ہیں۔لیکن مختلف سیاسی حالات کا گہرا اثر دونوں ملکوں کی شاعری پر موجود ہے۔نئے سیاسی شعور کی بناء پر طرزِ فکر اور ہیت میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔نئی علامتوں اور نئی تشبیہوں سے اسلوب کو سنوارنے کی کوشش ہوتی ہے۔دونوں ملکوں میں نئے شاعروں کے یہاں کہاں کرختگی اور سپاٹ پن ہے اور کہاں جمالیاتی تاثر اور آنچ اور اچھوتا پن ہے۔کہاں فکر کا فقدان اور موضوع کا پھسپھسا پن ہے اور کہاں صرف سٹائل کی شعبدہ بازی نظر آتی ہے۔ان تمام باتوں کا تجزیہ ضروری ہے۔

نئی زندگی کے مسائل کی جھلکیاں جابجا موجود ہیں۔فن کی نزاکتوں کا احساس زیادہ ہے۔ہم عصر شاعروں کی شاعری کے بھی گہرے نقوش ہیں۔شدت احساس، جنس کی بھینی بھنی خوشبو، ہندوستانی روایات کی تصویریں، نفسیات کی باریکیاں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ان شاعروں کا مزاج رومانی ہے۔یہاں کوئی مریضِ رومانیت نہیں بلکہ وہ رومانیت ہے جو ہر جذبہ کو اس کی انتہائی صورت میں پسند کرتی ہے۔جذبات اور وجدان کی ایک نئی تصویر سامنے آتی ہے۔ان شاعروں کا تخیل بلاشبہ ارضی ہے۔ماورائی نہیں، نئے اسلوب اور نئے فارم کی تلاش بھی رہی ہے اور نفسیاتی تجزیئے بھی پیش کئے گئے ہیں۔شاعروں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ان کے کلام سے فوراً ہو جاتا ہے۔بجھی بجھی طبیعت بھی ہے اور بیقراری بھی، چیخ بھی ہے اور صبر بھی، موجودزندگی کی کشمکش کی تصویر زیادہ اچھی طرح نمایاں ہے۔جدید شاعری اور اپنی زندگی کا سکون سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔وہی نئی غزل قدروں کے زوال کی نوحہ گر اور صداقت خیال کی پیرو ہے۔جس آئینے میں اسے خوابوں کے آراستہ نگار خانوں کے بجائے

کھردری حقیقتوں کے پیکر دکھائی دیتے ہیں۔نئی غزل کسی لازمے کا جبر قبول نہیں ہے۔وہ قطرے میں دجلہ کی تلاش کرتی ہے۔اور درد میں فنا ہوکر عشرت کے حصول پر آمادہ نہیں ہوتی۔وہ عظمت کے بجائے حقیقت کا استعارہ بننا چاہتی ہے اور اپنے ذاتی تنظر کو کسی بھی تہذیبی ، مذہبی ،نظریاتی ،فکری اور اخلاقی تناظر پر قربان کرنے سے دامن بچاتی ہے۔نئی غزل کے اچھے نمونے اور برے نمونے ہر عہد کے فکری یا فنی مسلک کے پابند شاعری میں عام ہے۔نئی غزل نے چونکہ حقیقتوں کو دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کا زاویہ بدلا ہے اس لئے اظہار کی راہیں بھی تبدیل ہوئی ہیں۔

ہماری تہذیب کی پاسبان اردو غزل کی ابتداء تو عرب کے قصائد سے ہو چکی تھی۔جس کی تشبیب میں غزل شامل تھی۔عرب کے صحراؤں سے گذرتی اور ایران کے درباروں کی شان وشوکت اور عظمت کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی غزل ہندوستان پہنچی۔ ہندوستان کی سرزمین غزل کے مزاج کے مطابق تھی۔ یہاں کی آب وہوا غزل کو بہت راس آئی۔جس کی دلیل ہندوستان میں موجود غزل کی طویل روایت ہے۔

لیکن میرے مقالے کے اس باب کا موضوع ''جدید اردو غزل میں سماجی وسیاسی مسائل'' ہے اس لیے میں اس باب میں ہندوستان کی آزادی کے بعد کی اردو غزل کا ذکر کروں گی۔

ہم آزادی کے بعد کی غزل کو مجموعی طور پر دوحصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک ترقی پسند غزل اور دوسری جدید غزل۔ترقی پسند غزل وہ غزل ہے جو ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ترقی پسند تحریک نے مقصدیت کو اہمیت دی۔اس تحریک کا مقصد تھا کہ'ادب برائے ادب' نہ ہو کر'ادب برائے زندگی' ہونا چاہیے۔ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جس میں فرد کی بات نہ کر کے اجتماعیت کی ضرورتوں،محرومیوں اور پریشانیوں کا اظہار کیا گیا ہو نیز ادب کے ذریعے ایسی باتیں کی جائیں جو معاشرہ کے لیے مفید ہوں۔

غزل کی راویت کے مطابق غزل میں ہر بات اشاروں اور کنایوں میں بیان کی جاتی تھی۔ براہ راست کوئی بات اب تک غزل میں نہ کہی گئی تھی۔اس لیے ترقی پسند تحریک کی ضرورت کے مطابق غزل اپنی ہیئت کی وجہ سے اس دور میں ناکارہ قرار دے دی گئی۔جس میں انقلاب، جوش اور ضرورت زمانہ کو بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس لیے غزل کو روایتی صنف سخن کہا گیا اور جاگیردارانہ دور کی نشانی سمجھ کر نظر انداز کیا گیا۔لیکن جن شعراء نے اس عہد میں ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی غزل کی شاعری کی۔ انہوں نے غزل کے اسلوب یا ہیئت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔غزل کے روایتی رموز وعلائم

کا استعمال کیا۔ ہاں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے اردو غزل کو نئے معانی و مفاہیم سے روشناس کرایا۔ ترقی پسند تحریک ادب میں اہم مقام رکھتی ہے جس نے ادب کی ہر صنف کو متاثر کیا خاص کر صنف غزل اس تحریک سے بہت حد تک متاثر ہوئی۔ اس کے باوجود ترقی پسندوں نے اردو غزل میں کسی بڑی تبدیلی کے لیے کوئی راہ منتخب نہیں کی۔

یہ بات ہم اس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ جس طرح علامہ اقبال نے غزل میں مروج علائم کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نئے علائم اپنی غزلوں میں استعمال کئے۔ اس طرح کی کوشش ترقی پسند شعراء نے نہیں کی۔ عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ترقی پسند شعراء نے غزل گو شعرا انجام دے چکے تھے۔ جن میں میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، حالیؔ، چکبستؔ، اقبالؔ اور اکبرؔ قابل ذکر ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں ہیں کہ ابتدا سے ہی ان موضوعات کے لیے غزل کا دامن وسیع تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ترقی پسند تحریک نے عام طور پر ان موضوعات کو اپنا کر اس عہد کا خصوصی رجحان بنادیا۔

آزادی کے بعد جو ادب پروان چڑھا وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھا۔ جس میں مقصدیت کو ہی اہمیت دی گئی۔ دوسری طرف رفتہ رفتہ اس ماحول میں تبدیلی آرہی تھی۔ اجتماعی مقاصد کی جگہ فرد کے خیالات، احساسات اور تجربات ادب میں اہمیت اختیار کرتے جارہے تھے۔ ادب میں غیر معمولی طور پر جو تبدیلی آرہی تھی اس کی وجہ سے آزادی کے بعد معاشرے میں پیدا ہونے والے حالات تھے۔ عوام کا اشتراکیت پر سے بھروسہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اور ترقی پسند تحریک پستی کا شکار ہوگئی۔

جب ترقی پسند تحریک کا آفتاب غروب ہونے لگا تو اس تحریک سے وابستہ شعرا اور ادیب بھی نئے امکانات کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے اور جب شعراء نے غزل کے ماضی کی طرف دیکھا تو وہ انہیں تابناک نظر آیا۔ بہت سے شعرا اس دور میں میر کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک طویل اور لمبی جدو جہد کے بعد ملک آزاد ہو کر تقسیم ہو گیا۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ ان حالات کے مدنظر دونوں ملکوں میں کچھ وقت تک بے راہ روی اور بدنظمی پھیلی۔ خاص کر پاکستان میں جو حکومتیں قائم ہوئیں۔ انہوں نے عوام کے حقوق سلب کر لیے۔ شعرا بھی ان حالات کا سامنا کررہے تھے۔ چونکہ شاعر ایک عام انسان کے مقابلے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی فوجی رمزیت کے خلاف کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا شعرا نے اشاراتی زبان کا استعمال شروع کیا۔

جدید شعراء میں ۱۹۵۶ء کے آس پاس ابن انشاء کا مجموعہ ''چاند نگر''، ناصر کاظمی کا ''برگ نے'' اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا ''کاغذی پیرہن'' منظر عام پر آیا۔ ان شعری مجموعوں میں تازگی اور نئی بہار کی آمد کی دستک محسوس ہوتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ اردو غزل ایک اور نیا لباس زیب تن کر رہی ہے۔ جدید غزل کی فضا تیار کرنے والوں میں چند ترقی پسند شعرا کا اہم کردار ہے۔ یہ وہ شعرا تھے جو ترقی پسند تحریک کی کرختگی، خشکی، سیاسی نظریات اور نعرے بازی سے بیزار ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ اب نئی فضا قائم ہو۔ جامؔی، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، وحید اختر، محمود ایاز، محبّ عارفی، راہی معصوم رضا، محبوب خزاں وغیرہ نے ترقی پسندوں سے اختلاف کیا۔ جدید اردو غزل کے ابتدائی رجحان کے سلسلے میں بہت سے ادیبوں ے مضمون لکھے۔ جنہوں نے نئی فضا کی تشکیل میں مدد دی۔

مغربی ادب سے متاثر کچھ ادیب اور شعرا نے انگریزی شاعری کی روایت کو ہندوستان میں مقبول بنانا چاہا اور شاعری کو اجتماعیت اور انفرادیت کی جانب لانے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی اردو شاعری کو فلسفۂ وجودیت سے روشناس کرایا اور غزل میں روایت کی بنیاد رکھی جس کے تحت انہوں نے مغربی ادب کی شاعری کا اردو میں ترجمہ کیا۔

غزل میں نئی روایت کی بنیاد رکھی گئی اور اسے جدیدیت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ 1960ء کے آس پاس جدیدیت، شعرا میں مقبول ہونے لگی اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ جدید رجحانات ومیلانات کو روایتی قدیم انداز پر ترجیح دینے کو جدیدیت کہا گیا اور آہستہ آہستہ جدیدیت نے ایک جامع شعری رجحان کی شکل اختیار کر لی۔ یہ رجحان ترقی پسند تحریک کا ردعمل تھا۔ غزل نے نئی روش اختیار کر لی اور جدیدیت کے نام پر غزل میں ہر طرح کی بے اعتدالیوں کو جگہ مل گئی۔ ہر تصویر کے دورخ ہوتے ہیں ایک طرف جہاں اردو غزل آزادانہ فضا میں سانس لے رہی تھی اور غزل میں زندگی کی کشمکش انتشار، تردد وغیرہ کو موضوع بنایا گیا تھا وہیں دوسری طرف جدیدیت کے نام پر بے اعتدالیوں کو بڑھاوا دینے والے شعراء نے ذات کے بحران کے مسئلے کو آج کے انسان کا بنیادی مسئلہ بنا دیا۔

جدیدیت کے نام سے نئی شعری روایت کی ابتدا تو ہوگئی لیکن اس کی تشکیل آسان نہیں تھی۔ صرف اتنا کافی نہیں تھا کہ غزل میں نئے خیالات ورجحانات کو پیش کر دیا جائے بلکہ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ خیالات کا اظہار کس طرح کیا جائے۔ تاکہ جدید غزل روایت کے بالکل خلاف نہ ہو۔ بلکہ روایت سے اس کا تعلق یقینی ہو جائے۔ نئی غزل نے، غزل کے طے شدہ ڈھانچہ کو توڑ دیا لیکن یہ

بلکہ روایت سے اس کا تعلق یقینی ہو جائے۔نئی غزل نے ،غزل کے طے شدہ ڈھانچہ کو توڑ دیا لیکن یہ کام جدیدیت سے پہلے کچھ شعرا خوش اسلوبی سے انجام دے چکے تھے۔جن میں شاد عارفؔی ، یگانؔہ اور فراقؔ ایسے شعراء تھے جن کی آواز دور سے پہچانی جا سکتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے عہد کی شاعری سے مختلف شاعری کی ۔غزل میں رائج عام موضوعات کے علاوہ نئے موضوعات سے غزل کو آشنا کیا اور غزل سے ایسے الفاظ کم کرنے کی کوشش کی جو زمانہ کی برق رفتاری کے سبب اپنی معنویت کھو چکے تھے۔شاد عارفؔی نے پہلیبار غزل گوئی میں وہ انداز اپنایا جو حقیقت کے بہت قریب تھا۔ان کے یہاں پہلی بار ایسے عاشق ومعشوق سے واسطہ پڑتا ہے جو ہمارے آس پاس رہتے ہیں اور روز مرہ کے کاموں میں ان کا عمل دخل ہے۔شاد عارفی نے غزل کی پرانی روایت کے مطابق محبوب کو ماوٗرائی شئے نہ بنایا۔انہوں اپنی غزل میں عام بول چال کے الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے برتا اور غزل کے مرجہ الفاظ و علامات کا استعمال وہیں تک کیا جہاں تک انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی ۔ غیر ضروری علامات کے استعمال سے انہوں نے انحراف کیا۔

ایسے موضوعات جن کو غزل میں پیش کرنے کا شعرا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔شاد عارفی نے ان موضوعات کو نہ صرف اپنی غزل میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا بلکہ انہیں خصوصیات کی وجہ سے بلندی پر پہنچے۔شاد کے ہم عصر شاعر یگانؔہ نے غزل کو اپنے اندازِ بیان سے قوت اور توانائی بخشی۔ ان شعرا نے غزل کو غیر ضروی عناصر سے نجات دلائی۔فراقؔ نے دور جدید کی جدوجہد کو غزل میں اپنے انفرادی اسلوب میں پیش کیا۔ یہ وہ شعرا تھے جنہوں نے جدیدیت سے پہلے غزل کو نئی راہ پر ڈال دیا اور اسے معاشرے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے میں مدد کی۔

آج جس شاعری کو ہم جدید غزل کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس کا نقش اولیں ہمیں شاد عارفؔی ، یگانؔہ ،فراقؔ گورکھپوری اور ان کے ہم عصر شعرا میں ملتا ہے۔خاص طور پر شاد عارفؔی کے اثرات نئی غزل پر نمایاں طور پر ملتے ہیں جس کی نشاندہی اکثر نقادوں نے کی ہے۔

کسی بھی نئے رجحان یا تحریک میں مختلف نظریات ہوتے ہیں۔اس طرح نئی غزل میں ابتداء سے ہی دو طرح کے رجحانات نمایاں رہے ہیں۔ اس میں ایک رجحان کے شعرا وہ ہیں جو جدیدیت کو ایک فلسفہ مانتے ہیں جس میں لچک کی کوئی گنجائش نہیں ۔ان کے مطابق انسان مجبور و بے کس ہے اور وہ ایک ایسے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے جو زوال پذیر ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس دنیا میں وہ تنہا ہے۔کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہے۔ایسے حالات میں انسان مایوسی کے اندھیرے

میں کھو جاتا ہے اور اپنے چاروں طرف پھیلی زندگی کی وسعت اور خوبصورتی سے نظر چرا کر صرف اپنی ذات میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں انسان بے چینی، تردد، مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ پر اسے قابو نہیں رہ پاتا اور یہ ساری باتیں مل کر جس ماحول کی تخلیق کرتی ہیں اس کے سبب انسان کے لہجے میں کرختگی اور روکھا پن آ جاتا ہے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پاتا۔ اس لیے اس کے ہاں ابہام اور الجھاؤ ہے اور زبان کی صفائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شعرا کے یہاں ذاتی قسم کے علامات ملتی ہیں۔

جدید غزل کے دوسرے رجحان کی نمائندگی وشعرا کرتے ہیں جو جدیدیت کو وسیع معنوں میں دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق جدیدیت کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کے خیال میں جدیدت کوئی تحریک نہیں ہے۔ بلکہ مختلف نئے ادبی رویوں کے اجتماع کا نام ہے۔ یہ شعرا جدیدیت کو اپنے اوپر مسلط نہیں کرتے اور کسی خاص تحریک یا فلسفہ کے اصول وضوابط سے اپنے آپ کو پابند نہیں مانتے۔ ان کے خیال میں نئے غزل گو کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہے اور بنا کسی قید و بند کے آزاد ہو کر سوچ سکتا ہے۔ غزل کے اس دور کے شعرا اپنے آس پاس گزرتی زندگی اور ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انسانی نفسیات پر ان شعرا کی اچھی پکڑ ہے۔ ان کے یہاں انسانی جذبات واحساسات کے لیے جگہ ہے۔ یہ انسان کے فکری جذبات، فکر، تردد، مایوسی، محرومی، ناکامی یہاں تک کہ بیزاری کا اظہار بھی کھل کر کرتے ہیں مگر یہ ان شعرا کی خوبی ہے کہ وہ میر طرح ان احساسات کو پوری زندگی نہیں مانتے۔ ان میں ڈوب کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان میں زندگی کا صرف ایک حصہ تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی غزلوں میں مختلف رنگ و آہنگ ملتے ہیں، مایوسی کے گھنے کہرے میں بھی یہ شعرا امید کی کرن تلاش کر لیتے ہیں۔ ساتھ ہی علامی پیرایہ بیان کے ساتھ وہ ابلاغ ترسیل کے بھی قائل ہیں۔ اس لیے ان شعرا کی غزلیں تہ داری کے وصف کے باوجود بے معنی نہیں ہوتیں۔

پہلے رجحان سے متاثر غزل گو بہت جگہ یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور غزل بھی اپنی دلکشی کھونے لگتی ہے۔ ان کی غزلوں سے تہہ داری اور رنگارنگی سرے سے غائب ہو جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی یکسانیت اور سپاٹ لہجے سے اکتا کر جن شعرا نے نئی غزل کی علمبرداری کی تھی اور غزل میں نئے رجحانات قائم کیے تھے وہ زیادہ عرصہ اس روش پر قائم نہ رہ سکے اور جن علامتوں کے خلاف انہوں نے آواز بلند کی تھی خود ان کی شاعری میں بھی وہ خصوصیات آنے لگیں یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کے آس

پاس یہ رجحان جس تیزی سے مقبول ہوا تھا اس کے ایک دہائی کے بعد ۱۹۷۰ء میں اس رجحان کے کمزو
ر پہلو سامنے آنے لگے۔

نئی غزل کے جس دوسرے رجحان کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس رجحان سے متعلق شعرا کی
غزلوں میں غزل کی خاص وصف رمزیت کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ پہلے رجحان کی طرح ان شعرا
نے بھی زمینی شاعری کی اور ساتھ ہی غزل کی رایت سے گہرا تعلق رکھا۔ اس لیے اس رجحان سے
وابستہ رہے شعرا کی شہرت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا۔ پاکستان کے غزل گو شعرا میں ناصر کاظمی، مجید
امجد، احمد مشتاق، شہزاد احمد، ظفر اقبال، منیر نیازی، ساقی فاروقی، وزیر آغا، پروین شاکر وغیرہ اہم
ہیں۔ ہندوستان میں ان کے ہم عصر شعرا میں خورشید احمد جامی، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظفر حنفی، شہریار محمود
علوی، ندا فاضلی، ذہیب غوری، بانی، بشیر بدر، حسن نعیم، فضا ابن فیضی، محمود سعیدی، شاذ تمکنت، بشر
نواز وغیرہ شعرا اہم ہیں۔

غزل اپنی خصوصیت، ایجاز و اختصار کے لیے جانی جاتی ہے۔ اس خوبی کو قائم رکھنے کے
لیے غزل نے رموز و علائم، تشبیہات و استعارات وغیرہ سے کام لیا اور جب جدیدیت کے زیر اثر
علامت نگاری کا رجحان بڑھا تو اس کا سب سے زیادہ اثر غزل نے قبول کیا۔ کیوں کہ یہ بات اس کے
مزاج کے مطابق تھی۔ علامتوں کے استعمال نے غزل کی راہ آسان کر دی۔ غزل کو ہر سمت میں پھیلنے
کے مواقع ملے۔ علامتوں کا اثر نظم کے ساتھ ساتھ نثر پر بھی پڑا۔ لیکن یہ پیرایہ بیان نثر کے لیے موزوں
نہیں تھا۔ نثر کا انداز مختلف ہوتا ہے۔

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو ہر دور میں زندگی کے ساتھ قدم بہ قدم چلتی رہی اور جب غزل
میں نئی علامتیں استعمال ہونے لگیں تو اس کا تعلق زندگی سے اور گہرا ہوتا گیا۔ غزل میں جو علامتیں
استعمال کی گئیں وہ آس پاس کے ماحول اور اشیائے فطرت سے حاصل کی گئی تھی اور جب غزل نے
معاشرے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو اپنے نزدیکی ماحول سے اخذ کئے عناصر کو اپنے دامن میں جگہ
دی۔ غیر ملکی عناصر سے غزل نے اپنا دامن بچالیا اور غزل پر جو فارسیت زدگی کا الزام تھا اس سے بھی وہ
بری ہوگئی۔

☆ جدید اردو غزل میں علامت نگاری کا رجحان

جدید غزل میں روایتی تلمیحات و استعارات کا استعمال بھی بہت کم ہوگیا۔ جدید غزل میں
ایک نیا رجحان ہندی الفاظ، تلمیحات اور ہندی تراکیت کے استعمال کا سامنے آیا۔ یہ ایک سچائی ہے کہ
غزل کا دائرہ آج بہت وسیع ہوگیا ہے۔ یہ کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں ہے۔ چند اشعار دیکھیں

نیل گگن میں تیر رہا ہے اجلا اجلا پورا چاند
کن آنکھوں سے دیکھا جائے چنچل چہرے جیسا چاند
ندا فاضلی

عقیل پھوٹنے والا ہے ایک جوالا مکھی
مرے لبوں پہ رکھی ہے مرے کلام کی آگ
عقیل شاداب

یادوں کی اگنی برکھا میں بھٹکتے رہے لمحہ لمحہ
ہم نے اپنا سارا جیون کاٹ دیا انگاروں میں
خلش بڑودی

جدید غزل کی یہ تبدیلی تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح خوشگوار احساس کراتی ہے۔ اردو غزل میں ''ہمالیہ''، ''طور'' اور ''رادھا کنہیا'' نے لیلیٰ مجنوں کی جگہ لے لی۔ صبر ایوب، حسن یوسف، کشتی نوح تلمیحوں کے ساتھ ساتھ رام، راون، سیتا، دیوی دیوتا، کام دیو، سورج، مندر کی گھنٹی، مندر کی مورت وغیرہ کے لیے جدید اردو غزل میں راہ ہموار ہوئی۔ اور شہروں، چیزوں، پرندوں وغیرہ کے لیے بھی اردو غزل میں گنجائش پیدا ہوئی۔

میں شام تک آؤں گا بہلائے ہوئے رکھنا
بچوں کو کھلونوں میں الجھائے ہوئے رکھنا
(والی آسی)

ہنسی معصوم سی کاپی میں بچوں کی عبارت سی
ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے پرندے کی شرارت سی
(بشیر بدر)

میں سانپ بن کے نکلوں گا مٹی کے بطن سے
تنہائی کے کھنڈر میں مرا انتظار دیکھ
(عادل منصوری)

گاؤں کے پرندوں تمہیں کیا پتہ بدیسوں میں
رات ہم اکیلوں کی کس طرح گذرتی ہے
عتیق النظر

ہندوستانی تہذیب گنگا جمنی تہذیب ہے۔ جدید اردو غزل میں ہندوستانی موسموں، درختوں، فصلوں، پھلوں، جانوروں، پرندوں وغیرہ کا ذکر بھی بخوبی ہونے لگا ہے۔ نیم، پیپل، آم، ببول، ناگ پھنی، رات کی رانی، چنبیلی وغیرہ کے ذکر سے نئی غزل اپنی زمین کے زیادہ قریب آ گئی ۔

بے موسم آنکھوں کی بدلی ہم کو نہیں اچھی لگیت ہے
دھواں دھواں گھر ہو جاتا ہے ساون کی گیلی لکڑی سے
بشیر بدر

ہر سال زرد پھولوں کا ایک قافلہ رکا
اس نے جہاں پر دھول اٹے پاؤں دھوئے تھے
بشیر بدر

جنگل میں جاگنے لگی خوشبو خواب کی
جھاڑیاں گلاب تھی کئی کیکر صندل ہوئے
ظفر اقبال

دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح جدید غزل نے اس دور کے ہر موضوع کو اپنے اندر جذب کر لیا اور زندگی کے وسیع معانی اپنے پیرائے بیان میں پیش کیا۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن کی جھلک یہاں کے عقائد، رسم ورواج، تیوہار، راگ راگنیاں، کھیل کود، میلے ٹھیلے سے بھی نئی غزل نے اپنا رشتہ قائم کیا۔

ہمارے یہاں عام بول چال کی زبان اور شاعری کی زبان میں ایک فرق ہوتا ہے۔ جدید دور میں اس فرق کو مٹانے کی زیادہ کوشش کی گئی۔ وہ الفاظ جو روازانہ ہم اپنی ضرورتوں کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کرسی، ٹیبل، پلنگ، کلر، بیڈ روم، بس اسٹاپ وغیرہ۔ اس سلسلے میں محمود علوی نے کہا بھی ہے ۔

کیوں سر کھپا رہے ہو مضامیں کی کھوج میں
کرلو جدید شاعری لفظوں کو جوڑ کے
محمود علوی

جدید غزل میں روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے تجربات اور واقعات کو موضوع شعر بنا دیا جاتا ہے۔ یہ وہ واقعات اور تجربات ہوتے ہیں جو ہر انسان کو پیش آتے ہیں۔مگر لوگ دھیان نہیں دیتے۔

کاوش سلامتی سے وہ موٹر گذر گئی
دلی کے تاجدار کا تانگہ الٹ گیا
کاوش بدری

اس کو اٹھا کے اپنے لبوں سے لگا بھی لو
منہ تک رہی ہے چائے کی پیالی بھری ہوئی
حامد سروش

کچھ کہہ رہی تھی اپنی سہیلی کے کان میں
اسٹاپ کے قریب وہ لڑکی کھڑی ہوئی
حامد سروش

دور جدید میں انسان کو اس کی ضرورتوں کے ساتھ شاعری میں جگہ دی گئی تو یہ رجحان دور جدید کی پہچان بن گیا۔قدیم غزل اور جدید غزل میں اس رویہ پر شاعری کرنے میں بڑا فرق یہ ہے کہ پہلے اس بات کو غزل کے روایتی انداز اور مروجہ علامتوں میں کہا جاتا تھا۔اس لیے ان کی انفرادیت پوری طرح نمایاں نہ ہو پاتی تھی۔ جدید دور کے شعرا انہیں عام بول چال کی زبان میں پیش کر رہے ہیں۔ جو ہر قاری کو سمجھ میں آ جاتا ہے۔جدید غزل کو بام عروج پر پہنچانے اور زندگی سے اس کا رشتہ اور قریب کرنے میں ان غزلوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔اس رجحان میں بیک وقت زندگی کے طرح طرح کے رنگ ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔

نہ جس کا نام ہے کوئی نہ جس کی شکل ہے کوئی
ایک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے
شہریار

کس کی بھابھی کس کی سالی
غریب کا خاندان کیا ہے
مظفر حنفی

ان کے جانے کی تاریخ
دنگل تھا جب گاؤں میں
ندافاضلی

جس پیڑ کی ہم نے کی ہے سیوا
کھایا کسی اور ہی نے میوا
ظفراقبال

تو کون ہے تیرا نام کیا ہے
کیا سچ ہے کہ تیرے ہوگئے ہم
ناصرکاظمی

کوئی فیصلہ اتنی جلدی نہ کرو
ذرا دیر کی جان پہچان میں
بشیربدرا

جدیدغزل میں موجودسیاسی صورت حال اورسماجی مسائل کی بھی عکاسی ملتی ہے۔جدیدغزل گوشعرانے اپنے اردگرد کے ماحول کا بغور مطالعہ کیا اورسیاسی حالات وسماجی مسائل کوانہوں نے صرف دیکھنے پراکتفانہیں کیا بلکہ عملی طور پران میں شامل رہےاوران کی سختیوں کو برداشت بھی کیا۔ جس سےان کی شاعری میں حقیقت کاپرتو ملتاہے۔

خشک شاخیں کبھی ایسے تو نہیں چیختیں
کون آیا ہے پرندوں کو ڈرانے والا
وزیرآغا

ایک شرر سے خرمن خرمن مٹھی مٹھی راکھ
ہربستی نازک ہربستی ہے دوخنجر میں صاف
مظفرحنفی

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے
میں اس کا لگان دے رہا ہوں
سلیم احمد

جمہوریت، سیکولرازم، سائنس اور تعلیم سے انسانی زندگی میں جو تبدیلیاں اور خوشحالی بڑھی ہے اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے انسانی زندگی کو جو آسائش میسر آئی۔ عورتوں کی آزادی سماج کے پچھڑے طبقوں کے لیے سرکار نے جو کام کیے۔ ایسی اور بھی بہت سے باتیں جو معاشرے کی ترقی میں معاون ثابت ہوئیں نئی غزل کسی نہ کسی طور پر ان سے متاثر ہوئی اور اپنی مخصوص زبان اور اسلوب میں اس کا اظہار بھی کیا۔ مثلاً

ظلمت میں بھی اندر سے چراغاں تھا برابر
محراب مقدر کا دیا چونک اٹھا تھا

ہر آنکھ میں تھی ٹوٹے لمحوں کی تشنگی
پر جسم پر تھا وحشت کا سایہ پڑا ہو

شعرا نے محسوس کیا روایتی علامات کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کا پوری طرح اظہار نہیں کر سکتے۔ شعرا اس لیے انہوں نے اپنے گردوپیش کے ماحول سے نئی علامتیں وضع کیں۔ جدید غزل میں ہندوستانی تاریخ سے متعلق موضوعات بھی ملتے ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے جو تہذیب وجود میں آئی اس کی خصوصیت اور نئی غزل میں اس کے عمل ودخل کا ذکر کرتے ہوئے مظفر حنفی لکھتے ہیں۔

"...ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اسلامی شریعت کے پہلو بہ پہلو صوفیائے کرام کی لچک دار وسیع النظری، ہندوستانی آب وہوا کی جاذبیت اور دیگر اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے میل جول نے جو اجتماعی لاشعور تخلیق کیا اس میں ہندوستانی دیومالائی اثرات کو لاشعوری طور پر اپنے فن پاروں میں خوبصورتی کے ساتھ منعکس کرنے لگے۔ نئی غزل تک آتے آتے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ شعرا کے ہاں یہ عمل قدرے شعوری بھی ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے میرے خیال میں یہ ہے کہ نیا شاعر اب غزل میں عجمی لے کر قدرے کم کر کے مقامی سروں کے ذریعہ اپنی دھرتی، اپنے عوام کے نزدیک تر آنا چاہتا ہے"۔ (جدید غزل کا فنی، سیاسی اور سماجی مطالعہ، ڈاکٹر ممتاز الحق، ص ۱۷۴)

یہ بات کیوں کہی تجھ سے سکوت دریا نے
چراغ پانی میں اکثر بہائے جاتے ہیں
بشیر بدر

عمیق چھیڑ غزل غم کی انتہا کب ہے
یہ مالوے کی جنوں خیز آخری شب ہے
عمیق حنفی

یاروں میرے پاگل پن کا سچ مچ کوئی علاج نہیں
نیم نیم پر کویل چاہوں کیکر کیکر جامن ڈھونڈوں
بمل کرشن عشق

ایک پرندہ کہیں چیخ رہا تھا مندر کے مینارے پر
دور کہیں گنگا کے کنارے آس کا سورج ڈھلتا ہے
نور بجنوری

ناقدین نے حالی کے بعد غزل کی مخالفت کو ایک فیشن کی حیثیت سے برتا۔مگر ترقی پسندوں نے مارکسی شعریات کی روزنی میں غزل کی مخالفت کے نئے جواز ڈھونڈ لئے تھے۔ترقی پسند تحریک سے قبل غزل پر جو اعتراض کئے گئے تھے ان میں حدر درجہ یکسانیت تھی لیکن ترقی پسندوں نے غزل کی مخالفت میں نومسلموں کا سا رویہ اپنایا۔غزل کی ریزہ کاری میں مقصدیت کو سمولینا آسان نہ تھا۔ پھر اکثر نوجوان ترقی پسند شعراء نے اپنے شعری سفر کی ابتداء سے گذرے تھے اس لئے فن پر اتنی دسترس نہیں رکھتے تھے کہ غزل کے مزاج کو اپنی سیاسی مزاج سے آہنگ کر سکتے۔اس لئے انہوں نے غزل کی مخالفت میں ہی عافیت سمجھی۔

اردو غزل پر عائد کردہ الزامات میں اکثر الزامات وہی تھے جو حالی یا عظمت اللہ خان نے لگائے تھے۔لیکن ترقی پسندوں کو غزل میں دو خامیاں نظر آئیں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ اجتماعی اور سماجی شعور کی عکاسی کے بجائے فرد اور اس کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ دوسری یہ کہ قدیم عہد میں تصوف ایک فیشن کی طرح سماج پر مسلط تھا اور تصوف کے پاس کوئی طئے شدہ نظریہ حیات نہیں تھا۔اس لئے غزل فرد کے انتشار پسند خیالات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی۔ممتاز حسین نے اپنے مضمون ''صورت و معنی کا رشتہ'' میں اپنے خیال کی تشریح اس طرح کی ہے ....

''یہ انتشار کسی نہ کسی حد تک تمام غزل گو صوفی شعراء کے یہاں مل جاتا ہے اور جو صوفی نہیں ہے ان کے یہاں تقلیدی انتشار ہے۔اس انتشار کے جہاں اور اسباب تھے ایک سبب یہ بھی تھا سماجی شعور

کوعمل میدان میں دریافت کرنے کے بجائے اپنی ذاتی فکر اور خیال کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یوں تو انفرادی شعور، سماجی شعور کو جزو ہے لیکن اس جزو کی صداقت کو بھی سماجی عمل کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔ چونکہ صوفی تفکر کو عمل پر مقدم سمجھتے تھے اس لیے وہ اپنے شعور کو سیاسی عمل کے تابع ہونا ضروری سمجھتے تھے وہ صرف ترویج خیال کے ذریعہ قلب ماہیت کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہمارے ملک میں سماجی شعور کسی منظّم تحریک کی صورت میں پیدا نہ ہوسکا۔غزل کا انتشار ہمارے ذہنوں پر مسلط رہا۔''

(بہترین ادب-۱۹۵۰ شاہداہ دہلی)

اردو غزل کی مخالفت اگرچہ ترقی پسندوں نے بطور فیشن اختیار کرلی تھی لیکن بعض ترقی پسند نقاد ترقی پسندوں کے اس رجحان کو بھی ہدف تنقید بنا رہے تھے۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں ...

''ہم بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عہد حاضر میں عظیم اوراچھی شاعری جس سے آج مکمل ذہنی اور روحانی تسکین ہو غزل کے سانچے میں محدود نہیں کی جاسکتی۔لیکن بعض لوگ جب ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ گذشتہ چندسو سالوں میں فارسی اور اردو غزل کے جو بہترین نمونے ہیں وہ لازمی طور پر عظیم شاعر نہیں ہو سکتے۔ اور یہ کہ غزل ایک صنف کی حیثیت سے بیشتر جاگیری دور کے اغلاط، افراتفری اور انتشار کی عکاری کرتی ہے۔تب میرے خیال میں ہم سخت غلطی کرتے ہیں۔''

(ذکر حافظ - صفحہ۱۲)

پروفیسر آل احمد سرور نے بھی اپنی ادبی وراثت کی اہمیت کو محسوس کیا وہ کہتے ہیں۔

''مغربیت اور جدیدیت پر زور دینے سے مراد یہ نہیں کہ ہم اپنے ماضی کے عظیم الشان کارناموں کو نظر انداز کردیں۔ اپنے ادب کے ہندوستانی اور مشرقی مزاج کو بھول جائیں ۔ نیا ادب . تہذیبی سرمائے اور تمدنی میراث سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

(نئے اور پرانے چراغ-ص۳۸۱)

اردو غزل پر مجنوں گورکھپوری نے بھی ماضی کی روایات سے متعلق انتہا پسندانہ خیالات کی مخالفت کی جو بالواسطہ طور پر غزل کی حمایت میں گئی۔

''میں اس گروہ کی ہاں میں ہاں نہیں ملاسکتا۔ جوادب کو سیاست کی طرح صرف عصری حالات کا آئینہ تصور کرتا ہے اور اس کو وقتی اور عارضی چیز بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ یہ گروہ ماضی کے اکتسابات کی قدر و قیمت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور ان کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتا ہے۔ یہ کم ظرفوں اور سبک سروں کا گروہ ہے۔''

ادب اور زندگی-صفحہ۹۰

اردوغزل کی اہمیت اور غزل کے گرانقدر وراثتی سرمائے سے متعلق ترقی پسندوں کے نظریات مختلف تھے۔لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ ادب کا اجتماعی زندگی سے گہرا رابطہ ہے۔ان کے نزدیک ادب ایک سماجی عمل ہے اورادیب سماج کا ایک باشعور فرد ہے۔اس لئے شاعروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی شاعری کوسماجی مفادات کے لیے استعمال کریں۔

علی سردار جعفری بھی غزل کی روایات پر کچھ اعتراض رکھتے تھے اوران کے اعتراضات کسی حدتک واجب تھے۔وہ لکھتے ہیں۔

''ترقی پسند افسانہ نگاری اور شاعری میں عورت گوشت پوست کی جیتی جاگتی عورت اپنا پورا حسن و جمال لے کر آئی۔وہ ماں بہن بیوی اور محبوبہ بن کر جلوہ گر ہوئی۔ذرا سوچئے جس شاعری میں سبزہ آغاز لونڈا معشوق بن کر حاوی رہا۔جس میں اقبال نے عورت کی اتنی توہین کی ہو جہاں جوش ایسے باغی شاعر نے بھی عورت کوعورت بنا کر پیش کرتے ہوئے اپنی ابتدائی شاعری میں جھجھک محسوس کی ہو۔''

ترقی پسندادب-۲۳۸ء

پروفیسر علی سردار جعفری کہتے ہیں کہ غزل کی مخالفت کا سارا الزام ترقی پسندوں پر تھوپنا مناسب نہیں بلکہ غزل کی مخالفت میں بعض غیر ترقی پسند حضرات بھی شامل ہیں جن میں کلیم الدین احمد صاحب پیش پیش ہیں۔جنہوں نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہہ کر مردود قرار دیا۔لیکن غزل میں ایسے عناصر ضرور موجود تھے جن کی مخالفت بے حد ضروری تھی۔ڈاکٹر یوسف حسین خان نے ''اردو غزل'' میں غزل کی خصوصیات ٹھہرائیں کہ غزل گوشاعر کا حیات وکائنات کا نقطۂ نظر خالص موضوعی اور داخلی ہوتا ہے وہ اپنی ذات میں سب کچھ پالیتا ہے۔سردار جعفری نے یوسف حسین خان کے نقطہ نظر کو داخلیت اورعینیت پرستی قرار دیا ہے۔اور ادب برائے ادب اورعینیت پرستی کا فلسفہ کہا۔چونکہ یہ رجحان سب سے زیادہ شدت کے ساتھ غزل میں ابھر کرآتا ہے اور روایت کے نام پر اپنا جواز تلاش کرتا ہے اس لیے غزل کوزندہ رکھنے اورآگے بڑھانے کے لیے سردار جعفری نے اس فلسفے کی مخالفت پر زور دیا۔

بہرحال غزل کی کشتی اپنی طوفانوں میں آگے بڑھتی رہی۔ترقی پسندی کا مطلب مقصدیت قرار پایا۔بقول ڈاکٹر عتیق اللہ ترقی پسند غزل سودا کی لفظیات سے اپنی شناخت قائم کرتی ہے۔یہ لے

اس وقت ایک فکر انگیز توازن میں ضم ہوجاتی ہے جب اسے اقبال کی دانشورانہ مہم سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ان معنٰی میں اقبال کا شعری ضبط اور غزل کا مفکرانہ اسلوب ترقی پسند غزل کے بلند آہنگ میں معنویت اور تہہ داری پیدا کرتا ہے۔

ہائے اب تک تو کہاں تھا دکھائی نہ دیا
مجھ کو تا حد نظر تک نظر آنے والے
احمد ندیم قاسمی

مجھ کو یہ آرزو کہ وہ اٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضہ کرے کوئی
مجاز

اسی سے تیغ نگہ آب دار ہوتی ہے
تجھے بتاؤں بڑی شئے ہے جرأت انکار
سردار جعفری

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا
احمد ندیم قاسمی

☆تقسیم وطن کے جدید غزل پر اثرات

جدید غزل میں سماجی وسیاسی رنگ اپنے جمال پر تھا۔عشق وعاشقی سے ہٹ کر شاعری ہورہی تھی ۔ترقی پسند شعرا جن کی وابستگی واضح اور وفادار یا غیر مشروط تھیں، کہ غزلوں میں خیال کا ایسا ردعمل نمایاں ہے جو احساس میں ڈھل جاتا ہے اور استعارے کی تخلیقی قوت دو متضاد تجربوں کو ایک ٹھوس مگر ترکیبی پیکر میں بدل دیتی ہے۔ترقی پسندی غزل کے فن کی جمالیاتی قدروں سے انکار کا نام نہیں بلکہ اقرار ہے۔

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ
احمد ندیم

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ
احمد ندیم

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
فیض

سنبھالئے غزل اپنی بیان غالب سے
زبان میرؔ میں بھی ہاں کبھو کبھو کہئے
سردار جعفر

بیان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
جگرؔ

جمہوریت کا نام ہے، جمہوریت کہاں
فسطائیت حقیقت عریاں ہے آج کل
جگرؔ

ترقی پسند تحریک کا جادو اس طرح سر چڑھ کر بول رہا تھا کہ جگر جیسے تغزل مزاج اور غیر ترقی پسند شاعر بھی، جو سیاست اور محبت میں بعد المشرقین سمجھتے تھے۔

اردو ادب کیلئے تقسیم وطن، ہندو مسلم فسادات ہماری تاریخ کا وہ حصہ ہے جس نے ادب کو بری طرح متاثر کیا اور جھنجھوڑ کر چھوڑا۔ اردو شعراء نے نہ صرف فسادات کو دیکھا بلکہ کئی معروف شعراء اور ادیبوں کو اس ہولناک تجربے سے گزرنا پڑا۔ سہیل عظیم آبادی کا گھر جلا کر خاک کر دیا۔ تو خلیل الرحمٰن کو بھی اس طرح کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ آزادی تو ملی لیکن ایک فریب کی طرح۔ معاشی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی ادھوری تھی۔

ہندوستان کے سیاسی حالات ابتر تھے۔ جن کا اثر سماج پر نظر آ رہا تھا۔ فسادات کے حادثے ناصر کاظمی کے یہاں ایک ایسا داخلی حادثہ بن کر ابھرے جو خارجی واقعات کا ردعمل تھا۔ ناصر کی شاعری میں اس المیہ نے ظاہر کر ناصر کی انفرادی آواز کی تشکیل میں معاونت کی۔ غیر ترقی پسند شعرا کے یہاں بھی یہ مضامین کسی نہ کسی صورت میں سامنے آئے ۔

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے

پھل تک جتنے گرے پسِ دیوار گرے

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں

مرجھا کے آگرا ہوں مگر سرد گھاس میں

جگر

میں ہوں اور دشت غم کا سناٹا

کوئی آواز دور دور نہیں

جگر

اس دور میں زندگی بشر کی

بیمار کی رات ہوگئی ہے

فراق

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے

پھل تک جتنے گرے پسِ دیوار گرے

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں

مرجھا کے آگرا ہوں مگر سرد گھاس میں

جگر

کس قدر تاریکیوں میں آگئے

ہم گجر بجنے سے دھوکا کھاگئے

احمدندیم قاسمی

گھر تو ایسا کہاں تھا لیکن

دربدر میں تو یاد آتا ہے

فراق

جدید غزل گو شعرا نے اپنے ارد گرد کے ماحول کا بغور مطالعہ کیا اور سیاسی حالات، سماجی حالات وسماجی مسائل کو انھوں نے صرف دیکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عملی طور پر ان میں شامل رہے اور ان کی سختیوں کو برداشت بھی کیا۔ جدید غزل میں سیاسی صورت حال، سماجی مسائل کی عکاسی کو ملاحظہ فرمائیں۔

دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
ناصر کاظمی

دیکھتے دیکھتے مرجھا گئے کمسن پودے
وقت کی دھوپ سے اس باغ کی ہر شاخ جلی
خلیل الرحمٰن اعظمی

ہر گام پہ مسلے ہوئے کچھ پھول ملے ہیں
ایسے تو مرے دوست گلستان نہیں ہوتے
احمد فراز

اب کے ایسی پت جھڑ آئی سوکھ گئی ڈالی ڈالی
ایسے ڈھنگ سے کوئی پودا، کب پوشاک بدلتا ہے
خلیل الرحمٰن اعظمی

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے
کیاریاں پھول سے جلی پائیں
آشیانہ جلا ہوا دیکھا
ناصر کاظمی

دیکھو تو فریب موسم گل
ہر زخم پر پھول کا گماں ہے
باقی صدیقی

بس دیکھ چکی دنیا یہ بزم فروزی بھی
رکھا ہے چراغ ایسا، جلتا ہے نہ بجھتا ہے
نشور واحدی

اترتے ہوئے چہرے پھولوں کے کمسی ہوئی کلیاں، خشک شجر
یہ کیا تھی خبر، ایسی بھی بہار، ایسا بھی گلستاں دیکھیں گے
اثر لکھنوی

نئی صبح پر نظر ہے، مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے
شکیل بدیوانی

یہ برق و باد کی یورش، یہ زہر کی بارش
ملی ہے اہل چمن کو بہار کی سوغات
معین احسن جذبی

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیئے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں
مجروح

کہاں کے لالہ و گل، کیا بہار توبہ شکن
کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن
خلوص شوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن
جگر

کتنی شمعیں جلیں گی اس کے لیے
ختم کب ہوگی غم کی رات نہ پوچھ
جگن ناتھ آزاد

غمناک فضا کے آئینے میں ہر صبح کو یہ محسوس ہوا
اک آنسوؤں کی چادر جیسے ہر منظر کو دھو جاتی ہے
فراق

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس
جانے کیا ڈر سا گیا دل میں
زندگی کو ہے زندگی سے ہراس
فراق

تہذیب اڑی ہے دھواں بن کر
صدیوں کی سعی ٹھکانے لگی ہے
بھرے دل میں بڑا مار پڑا ہے
مگر یہ بے طرح لوٹا گیا ہے
فراق

کیسی بہار، کیسا چمن، کیسا میکدہ
میرا لہو بھی پی کے یہ دنیا جواں نہیں
خلیل الرحمٰن اعظمی

ڈرا کے موج تلاطم سے ہم نشینوں کو
یہی تو ہیں جو ڈبویا کئے سفینوں کو
شکیل بدیوانی

آنے والے کسی طوفان کا رونا روکر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا
حفیظ جالندھری

اس میں چمن کا رنگ، نہ اس میں چمن کا روپ
ہم بوئے گل سے آج پریشان سے رہے
جذبی

ابھی سموم نے مانی کہاں سیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں
جذبی

اے وطن پیارے وطن، وہ بھی تجھے دیدیں گے
بچ گیا جو لہو اب فسادات کے بعد
سردار جعفری

بہت ہی سرگراں ہیں شعلہ ہائے شمع آزادی
روش اب دامن ہندوستان کی آزمائش ہے
روش صدیقی

ان تمام اشعار میں آزادی کے بعد کے سماج کی اور اس کے پس پشت اسباب وعلل کا جو جال ہے، نظر آتا ہے۔ ہمارا دور سیاسی رنگ میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ گویا ہماری روحانی اور جبلی خواہشوں کی تکمیل بھی اب ہماری ذات سے وابستہ نہیں رہی ہے۔ بلکہ اس کا فیصلہ بھی سیاسی اداروں، جماعتوں اور منصوبوں کے تحت ہوتا ہے۔ وارث علوی نے اپنے مضمون ''فسادات اور فن کار'' میں لکھا ہے۔

''یہ انسان کی المنا کی ہے کہ اس صحیح ٹھوس اور پائیدار انسانی رشتوں کو سیاسی تصوارت اور آدرشوں کی موہوم تجریدی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ انسان کو گوشت اور پوست کا بھرپور انسان سمجھنے کی بجائے اسے ایک سیاسی اکائی اور اسے ایک تجریدی تصور سمجھا گیا۔ مائی لائی اور احمد آباد میں جو کچھ ہوا اس میں ایک انسان نے دوسرے انسان کو نہیں مارا بلکہ ایک ابھرتی ہوئی سیاسی تجرید نے ایک بھرے پرے انسان کو مارا اور مارتے وقت یہی سمجھا کہ وہ انسان کو نہیں مار رہا بلکہ ایک مجرد تصور سمجھ کر مار رہا ہے۔'' (تیسرے درجے کا مسافر ص:۲۳۰))

ہندوستان کے بڑھتے ہوئے فسادات نے ان جدید شعراء کو بھی متاثر کیا جو بظاہر شاعری اور ادب میں افادیت کے فارمولے سے انکار کرتے ہیں۔ مشہور جدید شاعر محمد علوی کی غزل ''احمد آباد کے فساد سے متاثر ہو کر'' درج ہے۔

اوروں کے گھر جلا کے قیامت نہ کرسکا
گھر جل گیا مگر میں شکایت نہ کرسکا
میں نے بھی اپنی موت کو دیکھا قریب سے
اور اس کے بعد جینے کی حسرت نہ کرسکا
اس نے مجھے تباہ کیا اس کے باوجود

دو چار دن بھی اس سے میں نفرت نہ کرسکا
اپنے سے بڑھ کر تجھ پہ مجھے اعتماد تھا
افسوس تو بھی میری حفاظت نہ کرسکا
مسجد شہید ہونے کا غم تو کیا مگر
اک بار بھی میں اس میں عبادت نہ کرسکا

آزاد ہندوستان میں فسادات صرف ہندوستان کا ہی داخلی مسئلہ نہ تھے بلکہ پاکستان میں سندھی مہاجر فسادات اور شیعہ سنی فسادات، بنگلہ دیش کے قیام سے قبل ڈھاکہ کے بہاری بنگالی فسادات بھی غزل کا موضوع بنے۔

ایک دوسرے کی زد میں ہیں مہرے کچھ اس طرح
ڈر ہے الٹ نہ جائے کہیں یہ بساط بھی
حمایت علی شاعر

واسطے جتنے تھے سب وہم ویقیں نے چھوڑے
آسماں سر سے ہٹا، پاؤں زمیں نے چھوڑے
''انقلاب آنے کو ہے'' سنبھلو لکھا تھا جن پر
ہاں فضاؤں میں وہ غبارے ہمیں نے چھوڑے
ظہور نظر

کچھ بھی ہوتا، پر نہ ہوتے پارہ پارہ جسم و جاں
راہزن ہوتے اگر ان رہنماؤں کی جگہ
حبیب جالب

یوں کھڑا ہوں اس نشیلی دھند میں کھویا ہوا
جیسے مدت سے اسی جنگل میں ہوں بویا ہوا
فارغ بخاری

گلشن کی شاخ شاخ کو ویراں کیا گیا
یوں بھی علاج تنگیٔ داماں کیا گیا
یوسف ظفر

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ
منیر نیازیؔ

وہاں کی روشنی نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت
شکیب جلالی

زمیں ہے مسکن شر، آسمان شراب آلود
ہے سارا عہد سزا میں کسی خطا کے لئے
طوفان ابر باد بلا ساحلوں پہ ہے
دریا کی خامشی میں ڈبونے کا رنگ ہے
منیر نیازی

شہر در شہر جلائے گئے
یوں بھی جشن طرب منائے گئے
منیر نیازی

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا ناصر
زمیں پانی کو سورج کرن کو ترسے گا
کس سے کہوں کوئی نہیں سوگئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میت شہر بے کفن
ناصر کاظمی

☆جدید غزل میں چند خوشگوار تبدیلیاں

غزل میں سماجی و سیاسی مسائل کے اظہار کے درمیان الفاظ جامد حقیقتوں کے مظہر نہیں بنتے بلکہ جذبے کی جدت سے ان حقاؤ کو سیال کر کے احساس کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔نئ غزل فکر اور فن کو زیادہ آزادی عطا کرتی ہے۔گرچہ غلط رو شعرا نے آزادی کو برتنے کے چند فارمولوں کی بنیاد پر اپنے لئے پابندیاں بھی پیدا کر لی ہیں۔نئ غزل کے بہتر تخلیقی جوہر رکھنے والے شعراء کے یہاں فارم کی گرفت کو ہلکا کرنے کے لیے علامتی اظہار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پابندیاں جب تخلیقی عمل کی شوریدگی پر بار ہوتی ہیں تو لسانی توڑ پھوڑ اور مروجہ زبان و بیان کے تمسخر کے خاکے ابھرتے ہیں۔کبھی کبھی اس شوریدگی کے نتائج ایسی مضحک صورتیں بھی پیدا کر دیتے ہیں کہ غزل اور ہزل کے مابین تفریق ناممکن نہیں رہ جاتی۔ بلکہ بسا اوقات اس جسارت کے نتائج غزل کے لہجہ میں چند خوشگوار تبدیلیوں کا سبب بھی بنے ہیں۔ذیل میں نئ غزل کے چند اہم پہلوؤں کی نمائندگی کرنے والے اشعار پیش خدمت ہیں۔

جھجک رہا تھا وہ کہنے سے کوئی بات ایسی میں چپ کھڑا تھا کہ سب کچھ میری نظر میں تھا

بانی

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا

محمود علوی

کوئی ہے جو مجھے دو چار پل کو اپنا لے زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

شہریار

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا

حسن نعیم

آزادی کے بعد جب ترقی پسند تحریک کا سیاسی مقصد ختم ہو گیا تو اس کے سامنے واضح نصب العین نہ رہا اور آہستہ آہستہ اس کا وجود ختم ہو گیا اور اس کی جگہ نئے رجحان نے لینی شروع کر دی۔ جو سراسر فرد کی ذات سے متعلق تھا۔ یہ مایوس کن زندگی کا مرثیہ تھا۔ایک ایسے دور کی داستان،جس پر اندھیرے کی دبیز سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی جہاں ہر شخص ایک غیری یقینی اور بے اعتبار زندگی جی رہا تھا اس معاشرے کا فنکار جو ادب تخلیق کر رہا تھا وہ اس سماج کا آئینہ تھا جسے جدیدیت کے نام سے موسوم کیا

گیا۔ یہ جدیدیت ان خوابوں کا ردِعمل تھی جو شرمندۂ تعبیر ہونے سے پہلے ٹوٹ گئے تھے۔ اس کی تفصیل دیتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے۔

''حصول آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ان نعروں اور نشوں کا اور ان خوابوں اور آدرشوں کا طلسم جس طرح ٹوٹا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس طرف سے آنکھ بند کر لینا کوئی سیاسی مصلحت ہو تو ہو لیکن کسی حساس ادیب یا شاعر کو ان کی شکست کے احساس سے نہیں بچایا جا سکتا خاص طور پر اس نسل کے لیے جو جدید علوم کے زیرِ سایہ رہ کر قدیم مذہبی اور روحانی تصورات سے محروم ہے اس لئے کہ اس سرمایہ کو خود اس کے پیش رووٴں نے از کار سمجھ کر پہلے ہی دفن کر دیا تھا انسان کی مادی ترقیات اور سائنسی فتوحات کے باوجود اس کی ساری نارسائیوں اور نا آسودگیوں کا احساس ایک طرف ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر سیاسی وسماجی آدرشوں کا حشر۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس صورتحال نے بنے بنائے راستوں کو گم کر دیا ہے اور تمام لکیریں بری طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں نیا شاعر جس ذہنی کیفیت سے گذر رہا ہے اور تہذیب کے جس دوراہے پر کھڑا ہے اس نے احساسات کے اعتبار سے اسے اپنے ماضی قریب کے شعراء سے دور اور ماضی بعید کے شعراء سے قریب کر دیا ہے۔''

ہندوستانی تہذیب نے تصوف، مافوق الفطرت عناصر پر یقین اور توہمات سے دامن چھڑا کر خود کو حقیقت کے نئے راستوں پر سپرد کر دیا ہے۔ جدید انسان زندگی کے ریگزار میں تنہا کھڑا سائے کی تلاش کر رہا ہے اور یہی تشنگی اور سائے کی طلب جدیدت کی پہچان ہے۔

ہندوستان میں جدیدیت مغربی ادب کی دین ہے۔ پہلی عالمی جنگ کی ہولنا کی اور اس سے پیدا شدہ معاشی بحران نے پوری دنیا کو ایک عرصے تک متاثر کیا اس جنگ میں سیاسی وسماجی اور ادبی اقدار ایک تنکے کی طرح بہہ گئیں اور باقی رہ گیا عدم تحفظ کا زہریلا اور خوفناک احساس، اقدار کی بے مائیگی کے ساتھ لوگوں کے دلوں سے زندگی کا یقین اٹھ گیا۔ جمہوریت اور انسان دوستی جیسے نعرے اپنی معنویت کھونے لگے۔ مذہبی اقدار اور عقائد تو ترقی پسندوں کے ہاتھوں ختم ہو ہی چکے تھے زندگی کی مثبت اقدار کا تنزل اور مذہبی سہاروں کے چھن جانے کے بعد انسان تنہا رہ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے خود کو ذات کے حصار میں قید کر لیا۔ جس اجتماعیت کو ترقی پسندی نے عام کیا تھا جدیدیت نے اسے انفرادیت میں تبدیل کر دیا انسان نے سماج سے الگ اپنی ایک دنیا

بسائی لہٰذا نیا ادب تنہائی، رنج والم، انفرادی احساسات اور نفسیاتی پیچ وخم کا عکاس ہو گیا۔

جہاں تک ہندوستان میں جدیدیت کی ابتداء اور ارتقا کا تعلق ہے بہ مقابلہ مغرب یہاں اس کی ابتدا کافی تاخیر سے ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کے سامنے ایک نصب العین تھا، اپنے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا لیکن جب ملک آزاد ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے مسائل کھڑے ہوئے۔ صنعتی ترقی نے ایک طرف مادی زندگی کو خوشحال بنایا تو دوسری طرف روح کو بیکراں سناٹے کی تحویل میں دے دیا۔ زندگی کا تبدیل شدہ ڈھانچہ اپنے ساتھ مصائب کا ایک سیل بے پناہ لے کر آیا جسے جدید شعرا نے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

ہندوستان میں جدیدیت کا آغاز ۶۰-۱۹۵۵ء سے ہوا۔ جہاں تک نفسیاتی شاعری کا تعلق ہے اس کی ابتدا آزادی سے قبل ہو چکی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر چند شعراء نے ایک حلقے کی بنیاد ڈالی جسے ''حلقۂ ارباب ذوق'' کے نام سے پکارا گیا۔ اس سے تعلق رکھنے والے شعراء میں میراؔجی، ن-م-راشدؔ، قیوم نظر اور یوسف ظفر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے ادب میں اجتماعیت کے مقابلے میں انفرادیت پر زور دیا جس کی دھندلی سی پرچھائیاں ہمیں ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں ملنی شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کا باقاعدہ آغاز جدیدیت کی تحریک سے ہوا۔ تحریک سے متعلق لوگ دراصل فرائیڈ کے نظریۂ لاشعور سے متاثر تھے۔ جدید شاعری میں فرائیڈ کے اس نظریے نے خاصی اہمیت حاصل کی۔ علم نفس سے واقفیت نے شعراء کو انسانی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی طرف راغب کیا۔ جدیدیت کے تحت اس رجحان کو بہت تیزی سے فروغ حاصل ہوا۔ آج جنسی پریشانیوں اور ذہنی الجھنوں کے لیے شاعری اپنی آغوش وا کر چکی تھی۔ تحلیل نفسی نے جہاں ایک طرف شاعری کو نفسیاتی الجھنوں کے اظہار کے لیے آزاد چھوڑا وہیں دوسری طرف شاعری میں ابہام کی راہیں کھول دیں۔ شاعری میں آنے والے اس تبدل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عقیل احمد رضوی لکھتے ہیں۔

> **''لاشعور کی پنہایوں میں اتر کر تحلیل نفسی کے ذریعے اپنی ذات کی دریافت کی سب سے نمایاں کوشش میراؔجی اور ان کی نسل نے کی ہے۔ یہ نسل فرائیڈ کے جنسی تصورات سے متاثر تھی اور نہ صرف یہ کہ جنسی موضوعات کو شاعری میں جگہ ملی بلکہ جنس کے حوالہ سے شعور اور جبلت کے درمیان کی کشمکش کو بھی ان حضرات نے اپنے تجربے کی آماجگاہ بنایا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ**

میراجی اوران کے ساتھیوں نے جنس کے موضوعات کوزیادہ اہمیت دی جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس عہد کا ایک اہم مسئلہ جنس کے بارے میں سماجی دباؤ سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔"

آزادی کے بعد نشو ونما پانے والے اہم رجحانات میں سے ایک وجودیت کی تحریک ہے جس نے شعراء کو کافی متاثر کیا۔ وجودیت کا آغاز مغرب میں سارتر کے ہاتھوں ہوا۔ دراصل وجودیت کی تحریک نے یورپ کی مشینی زندگی میں انسان کی زندگی کی بے معنویت کو محسوس کیا۔ پھر انسان کی تلاش کا عمل شروع ہوا۔ دراصل وجودیت کے نظریے پر یقین رکھنے والے لوگ عرفان ذات کے قائل ہیں۔ وجودی فلسفہ انسان کو اس کی تلاش کی تلقین کرتا ہے۔ بے چہرگی کے دور میں اپنی تلاش، اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش، اپنی حقیقت جاننے کی سعی، یہی وجودیت ہے۔ مغرب میں مذہب کی قیود سے آزادی نے انسان کی شخصیت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ مشرق میں یہ صورتحال اس لئے پیدا نہیں ہوئی کہ یہاں کا انسان آج بھی اپنے عقائد کی ڈور کو تھامے ہوئے ہے۔ یہاں پرانی اقدار پر ابھی زوال نہیں آیا لیکن شہروں کی بے پناہ بھیڑ میں گم ہوتے ہوئے انسان کی تنہائی کا ذکر جدید شاعری میں شدت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ان شعراء کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں۔

'داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعر کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج پر اظہار کرتی ہے جو جدید صنعتی دور، مشینی میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوشحالی کا عطیہ ہے۔ جدید ادب گرتی ہوئی چھتوں، لڑکھڑاتے سہاروں اور لاتعداد بھول بھلیوں کے خوفناک احساس گم کردگی سے عبارت ہے۔"......

ظاہر ہے کہ ان موضوعات کے لیے عہدِ میؔر و غالبؔ تو کیا دورِ فیضؔ و مجروحؔ کی زبان بھی فرسودہ ہو چکی ہے لہٰذا نئے شعراء کے یہاں جو علائم مقبول عام ہوئے وہ ان کے منفی افکار و احساسات کے مطابق تھے۔ نئی شاعری میں سناٹا، اندھیرا، سیاہی، سمندر، شام، پتھر، تاریکی، پرچھائیاں، سائے، سورج اور ندی جیسے الفاظ علائم بن کر بہ کثرت استعمال ہوئے ایک دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ نئی شاعری اور شاعر نے اپنے کسی مخصوص راستے کا انتخاب نہیں کیا یہ شاعری عالمگیر سطح تک وسعت اختیار کر گئی۔ وہ فنکار جو آج کے انسان کی مشکلات و مصائب کو موضوع شعر بنا رہے

ہیں انہوں نے کسی مخصوص ملک، ذات، مذہب، قبیلے یا انسان کو اپنا محرک نہیں بنایا بلکہ ہر اس انسان یا مسئلے پر بلا امتیاز مذہب و ملک قلم آرائی کی، جو نفسیاتی یا جذباتی طور پر الجھا ہوا تھا اور حیات مسلسل سے بیزاری کا اعلان کر رہا تھا جو اپنی جستجو میں سرگرداں جدید شہروں کی در و دیوار سے سر ٹکرا رہا تھا جو اسے ذات کے خول میں بند رہنے پر مجبور کیے ہوئے تھا اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے حنیف فوق لکھتے ہیں۔

''آج کا شاعرانہ تجربہ ذات کی مضبوط دیوار سے سر ٹکراتا نظر آ رہا ہے جو اندر کی آواز باہر جانے اور باہر کی آواز اندر آنے میں ایک سنگین مانع کی حیثیت رکھتی ہے اس تجربے سے ذہنی تصویر بنتی ہے اس میں زندگی اور وجود کی فانیت کی جگہ بے معنویت کا تصور ملتا ہے۔ جذباتی اداسی کی عزاداری پائی جاتی ہے مظاہر ذات کے حزنے پر مبنی یہ شعری احساس دراصل ایک تہذیب کی پیچیدہ کشمکش اور اس کی متوقع بربادی کے شعور خفی کا مظہر ہے۔ جدید شعری حسیت کا یہ کارنامہ کم نہیں کہ اس دورِ حاضر کی کشمکش اور اس کی بربادی کے عناصر کو ذات کی تہوں میں محسوس کیا لیکن اس احساس سے گذر کر اسے اجتماعی شعور بنانے سے ہی مستقبل کی سمت میں موجود تہذیب کی بہتری و بقا کا سامان مہیا کیا جا سکتا ہے اور اس سے خود ذات کی جہات کو وسعت اور فروغ حاصل ہوتا ہے۔ (متوازی نقوش۔ص ۴۷۴)

آج کا فنکار تیزی سے بدلتی دنیا، اس کی ترقی اور اس ترقی کے نتیجے میں ایک سنگدلانہ سماج کو ابھرتے ہوئے صاف محسوس کر رہا ہے اور آج کی غزل اس دلدوز تبدیلی کا منظر نامہ ہے باوجود اس کے کہ تعلیم کی کرنیں ذہنوں کو منور کر رہی ہیں مگر پھر بھی نسل، لسانی و مذہبی تعصب، اندھے عقائد، تنگ نظری، شکوک و شبہات کے اندھیروں نے ذہنی ارتقاء کے گرد ایک حصار سا بنا رکھا ہے جو آنے والی ہر نئی اور مثبت چیز کو عقل کی حدود میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے کبھی یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے اور کبھی ناکام۔ اس کشمکش میں صرف عام آدمی ہی گرفتار نہیں بلکہ ذہین اور ذی شعور لوگ بھی شامل ہیں۔ جن کی زبانیں، قول و فعل، اصول پرستی کا ذکر کرتے نہیں تھکتیں مگر جن کے اعمال ان کی گفتگو کی نفی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ان حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے وحید اختر لکھتے ہیں۔

''یہاں دنیا کے دور افتادہ گوشوں میں ہونے والی تبدیلیاں، جنگیں، امن کے لیے اٹھنے والی آوازیں کوئی معنی نہیں رکھتیں حالانکہ یہ سب ہمارے دل کی آواز اور ہماری ہی دھڑکنیں ہیں کسی چھوٹے سے غریب ملک میں لوگ اپنی آزادی کے لیے سب کچھ لٹا رہے

ہیں۔کسی نوآزاد دیس میں زندگی از سرِنو تعمیر ہو رہی ہے۔کہیں نفرتیں ملکوں کے درمیان آگ اور خون کی دیواریں کھڑی کر رہی ہیں۔کہیں محبتیں ٹوٹے ہوئے دلوں پر مرہم رکھ رہی ہیں۔ یہ سب کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اور ہمارے دیس میں بھی،اور یہی سب کچھ ہماری زندگی ہمارا مقصد اور ہمارا سرمایہ ہے۔سیار و ثوابت پر کمندیں پھینکی جا رہی ہیں۔فضا کے نارسا مقامات پر جہاں فرشتوں کے پر جلتے اور تخیل کا بھی دم ٹوٹتا ہے اب ہماری رسائی ہے۔فاصلے گھٹ گئے ہیں۔دوریاں سمٹ گئی ہیں۔پھر بھی قیامت ہے جو ہماری آغوش میں رہ کر بھی ہم سے دور ہے اور ہم سے دور ہو کر بھی ہمارے ساتھ ہے۔غربت اور بے کار،بھوک اور بیماری سے جہاد جاری ہے اور ان کی فصلیں بھی اگائی جا رہی ہیں۔سائنس ہمارا مسیحا ہے اور اس کے ہتھیار ہمارے قاتل بھی،عقل ہماری زندگی بھی اور خودکشی بھی،علم ہماری آزادی بھی اور غلامی بھی، آدرش ہمارے مسجود بھی ہیں اور ہمارے مقتول بھی،ماضی ہم سے پیچھے رہ گیا ہے اور ہمارے ساتھ لگا ہوا حال ہماری دسترس میں بھی ہے اور ہماری آنکھوں سے اوجھل بھی،مستقبل ہمارے قدموں میں بھی ہے اور ہم سے ہراساں بھی، زماں و مکاں کی تمام حدیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئی ہیں اور یہ سب کچھ ہمارا ہے اور ہمارا نہیں ہے۔''

ان سماجی وسیاسی حالات کے نتیجہ میں جو شاعری ہمارے سامنے آ رہی ہے اس کے موضوعات کچھ اس طرح ہیں۔

☆ مذہب سے تنفر کے نتیجے میں مایوسانہ حالات میں خلاؤں میں ہاتھ پیر مارنے والی کیفیت جو کلاسیکی شاعری کی
بے عملی کو جدید بے عملی و مایوسی سے الگ کرتی ہے۔

☆ شہری و دیہاتی زندگی کا تقابلی مشاہدہ اور نتیجے میں شہروں سے حد درجہ بیزاری اور گاؤں کی مٹی سے لگاؤ اور محبت کا جذبہ

☆ اپنی جڑوں سے کٹنے کا احساس

☆ عشقیہ غزل میں جنس کا بے باکانہ اظہار اور سماجی بندھنوں سے آزادی کا رجحان

ظاہر ہے یہ تمام سماجی و سیاسی موضوعات غزل کے پرانے سانچوں میں نئے ڈھالے جا سکتے لہٰذا افکار و احساس کی تازگی کے ساتھ نئے علائم بھی جدید غزل کی پہچان بن گئے جن کا ذکر

پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

سمندر سے انسان کا رشتہ شاید اتنا ہی قدیم ہے جتنی یہ دنیا۔ عہد جدید میں سمندر اور اس کے تلازمات جدید کرب و تشنگی بن کر ابھرے ہیں۔

ریت پر ماہی بے آب نے پھیلائے تھے جال
صید ا مواج سراب ایک مچھیرا نکلا
وحید اختر

اس شعر میں ریت، ماہی بے آب، جال، امواجِ سراب اور مچھیرے کی ترکیب سے مجموعی طور پر جو فضا ابھر کر سامنے آئی ہے اس میں ایک ایسے انسان کا تصور ابھرتا ہے جو زندگی کو ایک وسیع و عریض سمندر کی مانند سمجھتا ہے مگر یہ سمندر دراصل نظر کا دھوکہ ہے زندگی جو خود ایک ماہیٔ بے آب کی مانند ہے وہ کسی تشنہ لب کی پیاس کیسے بجھا سکتی ہے۔ خواہشات کے جال میں قید انسان خود نہیں جانتا کہ وہ جو زندگی جی رہا ہے اس میں صرف تشنگی ہے۔ اس تشنگی اور تنہائی کے احساس کا اظہار نئی غزل میں مختلف انداز میں کیا گیا ہے۔

تیرہ و تار سمندر کا سفر تیری طلب
آسماں پر تیری آواز کا تارا نہ رہا
شہاب جعفری

جدھر اندھیرا ہے تنہائی ہے اُداسی ہے
سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی
شہریار

دن ڈھلا پنچھی اُڑے پر تول کے
یار ہوٹل سے اٹھے ہنس بول کے
ناصر شہزاد

☆ جدید اردو غزل میں لاسمتیت و خاموشی ڈیرہ

سماجی مسائل کے پیش نظر چہروں کی بھیڑ میں انسان کی عدم موجودگی آج کا المیہ ہے اور اسی عدم انسانیت نے حساس دلوں کو دشتِ بیکراں میں تبدیل کر دیا ہے جہاں نہ یادوں کے جگنوں ہیں اور

نہ آرزوؤں کے پھول، نہ امید کی خوشی ہے نہ رشتوں کی چھاؤں، مگر پھر بھی جدید انسان لاسمتیت کی جانبِ محوِسفر ہے۔ زندگی کا دوسرا نام سفر ہی ہے چاہے گھڑی بھر کی رفاقت ہو یا تنہائی کا عالم، پھر بھی ایک سوال ایک تشکیک ہے کہ ہم اس لاحصل سفر پر کیوں رواں دواں ہیں یہ استفہامی انداز شہر یار کے یہاں خاص طور پر نظر آتا ہے۔

نہ جس کی شکل ہے کوئی نہ جس کا نام کوئی
اک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے
شہریار

دریا کے پاس دیکھو کب سے کھڑا ہوا ہے
یہ کون تشنہ لب ہے پانی سے ڈر رہا ہے
شہریار

اردو غزل میں شہر یار کے علاوہ دوسرے شعرا نے اپنے فن پاروں میں اس استفہامی انداز کو برقرار رکھا ہے اس کا واضح سبب ہے اور وہ یہ کہ ایک اندھے سفر پر روانہ ہونے والا انسان جب تاریکیوں میں ہاتھ مارتا ہے تو یہ کوشش دراصل منزل کی تلاش یا راستے کی پہچان کے لیے ہوتی ہے کہیں کہیں اسی استفہام میں سوال کا جواب چھپا ہوتا ہے۔

آخری پتھر سے بے سمت ونشاں جانا ہے اب
ہم کھلی آنکھوں سے یہ اندھا سفر کیسے کریں
فرح جعفری

ویران بام و در کی خموشی نے کہہ دیا
کس کو پکارتے ہو یہاں کوئی بھی نہیں
خورشید احمد جامی

خورشید احمد کے شعر میں خاموشی کا ڈیرہ ہے یہ ایک ایسی ویران اور سناٹے سے معمور جگہ ہے جہاں دور در تک تنہائی کا راج ہے۔ بام و در ماضی میں ایک گھر کی نشان دہی کرتے ہیں اور گھر کا جو تصور ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے وہ رونق، گہما گہمی اور انسانوں کی چہل پہل ہے۔ پکارنے والا شخص

یقیناً کوئی ایسا آدمی ہے جو اس کھنڈر سے پہلے جو گھر تھا اور اس کے مکینوں سے واقف تھا۔ وقت نے اس گھر کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ویران بام و در کسی زمانے میں ہنستے بستے خاندان کی علامت تھے جہاں زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ رشتوں کی پاسداری تھی مگر جدید زندگی نے ان گھروں کو تقسیم کر دیا اور اس کے ساتھ خاندان، رشتے ٹوٹ گئے انسان تنہائی کی رہگزر میں بھٹکنے لگا شاعر دراصل اس ماضی کو پکار رہا ہے۔ جہاں رشتوں کا تقدس تھا اور رونقیں تھیں۔ گھر سکون قلب عطا کرتا تھا۔ دنیا کے ہنگاموں اور پریشانیوں بے مہریوں اور تھکان سے ٹوٹا آدمی جب گھر لوٹتا ہے تو اس امید پر کہ ان کلفتوں کو گھر کی پرسکون فضا اور گھر کے مکینوں کی مہربانیاں ہی دھوسکتی ہیں لیکن بام و در کی ویرانی اسے احساس دلاتی ہے کہ یہاں بھی کوئی نہیں جو اس کا رفیق بن کر اسے ذہنی سکون دے سکے۔ جدید غزل کے یہ تمام اشعار فرد کی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں جو پورے سماج پر محیط ہو کر اس میں سانس لینے والے فردواحد کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ سماج اور فرد کے درمیان ہونے والے تصادم کی کہانی پیش کرتی ہے.

> **''نئی شاعری ایک بنیادی چیز ہے اس ماقبل شاعری سے مختلف بناتی ہے کہ ایک ایسے فرد کے کرب کی آگہی کا اظہار ہو جو شخصی سطح پر اپنے عہد کی تہذیبی قدروں کی شکست سے متصادم ہے اس سے بھی بڑھ کر اسے کائناتی سطح پر حیات و کائنات کی پراسراریت کے بارے میں پرانے فلسفیانہ رویوں کی تنسیخ کے نتیجے میں دہشت انگیز آگہی کا سامنا ہے۔ بحر حال نئے شاعر کا ذہنی کرب کائناتی فکر کا زائیدہ ہے اور اس فکر کے لازمی نتیجے میں وہ اپنے عہد سے برگشتہ ہو کر اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا ہے یہ داخلیت پسندی بسیار شیوہ ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ شاعر کبھی اپنی ذات یا امیج کے تحفظ کے لیے حد درجہ متردّد نظر آتا ہے اور کبھی شکست دل کے تماشے میں محو ہو جاتا ہے۔ اجتماعی اداروں سے منحرف ہو کر ذات کے ویرانوں میں گم ہو جانے کا رجحان گہرے طور پر وجودیت پسندوں سارتر اور کامیو کی ادبی تحریروں میں نہیں ملتا ہے۔**

ذات کی حدوں میں سمٹنے سے خوف کا جو احساس فنکار کے ذہن پر چھا جاتا ہے اس کی مختلف صورتیں نئی غزل میں نظر آتی ہیں۔

ساری آوازوں کو سناٹے نگل جائیں گے
کب سے رہ رہ کے یہی خوف ستاتا ہے مجھے
شہریار

بین کرتی ہے دریچوں پہ ہوا
رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں
سلیم احمد

سماجی وسیاسی مسائل میں سناٹے، آوازیں، دریچوں پر نوحہ کرتی ہوا، سیہ پرچھائیوں کا رقص ان علامتوں سے تنہائی، دکھ اور خوف کے ملے جلے احساسات مجموعی طور پر ابھرتے ہیں یہ دراصل آج کے انسان کا المیہ ہے جو معاشرے سے کٹ کر اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش میں مصروف ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ خواہشات اور سنہری خوابوں کی لامعنویت سے بھی واقف ہے۔

مذہب سے لاتعلقی کی وجہ سے موت کا خوف اس پر پوری طرح حاوی ہے۔ گذشتہ عہد کے شعراء موت کو ہی زندگی کی معراج تصور کرتے تھے کیوں کہ تصوف نے انہیں فنا کے بعد بقا کی روشنی دکھائی تھی ان کی لے متصوفانہ تھی جس میں موت ایک خوف نہیں بلکہ وصلِ محبوب (محبوب حقیقی) اور نئی زندگی کا پیغام تھی جدید شاعری میں یہ رویہ بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ آج کا انسان اپنی حالیہ زندگی سے بیزار ہونے کے باوجود اپنی تعقل پسندی کے باعث کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا جس کی بنیادیں محض اعتقاد پر رکھی گئی ہوں یہی وجہ ہے کہ زندگی کی بے رنگی کے باوجود موت کا خوف اس پر غالب ہے۔

جدید غزل میں ذہنی تشکیک نے انسان کو خود کی تلاش پر مجبور کر دیا ہے۔ خود آگہی کا یہ زہر اس کی ذات کو ڈستا رہتا ہے اور بالآخر اس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے نہ خود کو سماج سے جوڑ پاتا ہے اور نہ ہی اس سے الگ رہ پاتا ہے۔ یہ کیفیت اسے خارج سے داخل کی جانب سفر کرنے پر مجبور کرتی ہے اس داخلی سفر کے دوران اس کی ملاقات ایک نئے انسان سے ہوتی وہ انسان جس کا کردار اور شخصیت سماج میں کچھ اور ہے لیکن اصل میں کچھ اور۔ یہاں اس کی اپنی شخصیت کے پردے اسی پر کھلتے ہیں اور ان سے جو انسان برآمد ہوتا ہے وہ ایک شکستہ ٹوٹی ہوئی ہستی ہے۔ دوہری شخصیت کی مثالیں نئے علائم کے ذریعے جدید شاعری میں منفرد پہچان بن کر ابھری ہیں جو کہیں مشتِ خاک سے کہیں ٹوٹا ہوا آئینہ اور کہیں اپنے آپ کو ہی ڈسنے والا سانپ ہے۔

آئینہ توڑ کر چہرہ دیکھوں
عکس کمرے میں تڑپتا دیکھو
باقر مہدی

میں ایک ذرّہ میری حیثیت کیا ہے
ہوا کے ساتھ ہوں اڑتے ہوئے غبار میں ہو
عادل منصوری

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

زندگی کا تحرک اور جدوجہد اس کی بقا کے ضامن ہیں۔ جدید غزل میں اداسی اور سوگواری تو ہے مگر اس اداسی کے ساتھ اس کے تدراک کی کوشش بھی نظر آتی ہے یہی کوشش جدید غزل کو قدیم غزل کی اداسی اور قنوطیت سے ممتاز کرتی ہے۔

انہیں نوک سنگ سے ذرا ہلا کے دیکھ لوں
کہ پانیوں کا یہ سکوت توڑ دینا چاہیے
جعفر شیرازی

☆جدید غزل میں ہجرت کے مسائل

ہمارے یہاں زندگی کے تحرک کی ایک اور علامت ''سفر'' ہے۔جس کا چرچہ غزل میں بہت ہوا ہے۔سفر کے ساتھ اس سے منسلک بہت سی علامتیں غزل کے منظر نامے پر ابھرنے لگی ہیں۔ اس سفر کی مختلف جہات ہیں جو باؔنی کے جدید مجموعے ''شفق شجر'' میں ملتی ہیں۔باؔنی کی شاعرانہ علامت کے سلسلے میں زمین کی مٹی سے آسمان کی وسعتوں تک پھیلے ہوئے ہیں جس میں سفر اور اُڑان کی آرزو ہے، اپنی حدوں سے باہر نکل کر وسعتوں میں پھیلنے کی خواہش ہے اور یہی خواہش جدید غزل کا وہ مثبت پہلو ہے۔جس نے لایعنی اور سوگوار غزل کو ایک شگفتہ تاثر دیا ہے۔ یہ تاثر مختلف علامات مثلاً اڑان پرندہ، آسمان، کھلی فضاؤں کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

اُڑ چلا وہ ایک جدا خاکہ لئے سر میں اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

ڈھانپ دیا سارا آکاش پرندے نے
کیا دلکش منظر تھا پر پھیلانے کا

اردوغزل میں باؔنی کے علاوہ دوسرے شعراء کے یہاں بھی سفر کی علامت دو انداز میں ملتی ہے ایک سفر وہ جو اپنی ہستی کی جانب مسلسل رواں دواں رہنے کی تحریک دیتا ہے جیسے کہ باؔنی کے یہاں ملتا ہے اور دوسرا سفر جو دنیا اور اس کے رنگین مظاہر کے بارے میں جاننے، انہیں دیکھنے کی خواہش بیدار کرتا ہے۔ پانی کی تیز لہریں بھی سفر کا اشارہ ہیں، کہیں مایوسانہ انداز ہے اور کہیں جستجو سفر پر مجبور کرتی ہے۔

پیاس بھٹکاتی ہے یونہی صحراؤں میں ورنہ
جانتے سب ہیں یہاں جھیل کہاں ہے کوئی
بشر نواز

مجھ کو ان دیکھی زمیں کے دیکھنے کا شوق ہے
میں ہواؤں کی امانت ہوں بکھرنے دے مجھے
ریاض مجید

عالم انسانیت میں ہجرت کا المیہ ازل سے بنی نوع انسان کا مقدر رہے۔ نئے سماجی ڈھانچوں اور تیزی اپنے ملک کی حدود سمٹنے لگی ہیں۔ ترقی کی دوڑ میں آسائشوں کی ہوس نے اپنے ملک، اپنی مٹی، اپنے دوست احباب رشتے داروں سے الگ ہوکر دوسرے ممالک میں بسنے پر مجبور کر دیا ہے مگر جس طرح کوئی درخت اپنی زمین سے رشتہ توڑ کر ایک بیگانہ آب و ہوا میں نشو نما نہیں پا سکتا اسی طرح اجنبی تہذیب، اجنبی زبان اور اجنبی لوگوں کے درمیان رہ کر کوئی شخص روحانی اور جذباتی طور پر خوش نہیں رہ سکتا۔

اردوغزل میں اپنا وطن چھوڑ کر روزی روٹی کی تلاش میں غیر ممالک کو آباد کرنے والے لوگوں کے یہاں حب الوطنی، دوریٔ وطن، اپنے گھر کی یاد، مٹی کی سوندھی خوشبو کا احساس آج کی نئی شاعری کی

پہچان ہے۔ وہ لوگ جو ہندوستان اور پاکستان سے ہجرت کر کے دیگر ممالک میں جا کر بس گئے ہیں ان کی شاعری میں یہ جذبہ شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں رہنے والے لوگ اپنی روایات سے منحرف ہو رہے ہیں لیکن وہ لوگ جو اپنی سرزمین چھوڑ کر دور دیس میں بس گئے ہیں ان کے یہاں ابھی تک روایات کی مہک باقی ہے ؎

اندھیارا بھی اپنے گھر کا کتنا پیارا لگتا ہے
اس کے گھر سے تو سورج بھی بیگانہ لگتا ہے
حمیرا رحمان

عذاب ایسا کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
افتخار عارف

شکم کی آگ لیے پھرتی ہے شہروں شہروں
سنگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا
افتخار عارف

¤ مہاجرین سے انصار خوش نہیں ہوتے
تو پھر کہاں کی ہجرت برا ہے بھارت کیا
رؤف خیر

جدید اردو غزل میں ہجرت وطن کے موضوع سے متعلق مثالیں افتخار عارفؔ کے یہاں بہ کثرت پائی جاتی ہیں اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ ان کے یہاں یہ موضوع فیشن کے طور پر نہیں آیا ہے بلکہ ایک ایسا جاں گداز تجربہ ہے جس سے کسی نہ کسی سطح پر نئے عہد کا ہر انسان گزر چکا ہے اسی لیے بے زمینی اور دربدری سے متعلق علائم دل کو اپنی جانب کھینچتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ افتخار عارف کے ''مہر دونیم'' پر تبصرہ کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

''افتخار عارف نے جس درد کی صلیب اٹھائی ہے وہ ہمارا اور ہمارے عہد کا درد ہے سب کا درد ہے لیکن اس میں انفرادی شان انہوں نے اس طرح پیدا کی کہ اس درد کو انہوں نے

بے زمینی کے احساس کے ساتھ قبول کیا ہے اوراس میں بستیوں،شہروں اورزمینوں کی عظمت کے ساتھ ساتھ گھر کی دہلیز کی حرمتوں، دکھ درد فنی خلوص کے ساتھ شامل کر دیا ہے وہ آج کے انسان کا المیہ بیان کرتے ہیں لیکن ان کا یہ اختیار ہے کہ انہوں نے نہ تو نوحہ گری کی ہے نہ رجز خوانی، بس درِدِل رقم کر دیا اوران کا درد ایسی قوت ہے جو باطن کا نور بن کر وجود کو منور کرتا ہے۔ (مہر دونیم ص32-33)

غزل میں بے وطنی کا یہ احساس جدید شاعری کی پہچان بن گیا ہے جس کا براہ راست رشتہ شعور سے جڑتا ہے۔شعور جو انسان کو ایک آگہی سے دوچار کرتا ہے۔ یہ کربنا کی مختلف روپ بدل کر شاعری کی سطح پر جادواں ہوتی ہے۔ یہ احساسِ غم دراصل جذبات کے نشیب وفراز، زیرو بم سے ابھرا ہے اورنئی شاعری خصوصاً غزل کے علائم کے لیے ایک بڑے لفظی انقلاب کا موجب بنا ہے لفظی انقلا کی ایک صورت افتخار عارفؔ کے یہاں دکھائی دیتی ہے جس میں ہجر کی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر گھر ،مٹی، قبیلہ اوربستی جیسے علائم ، وطن کی یاد اوراس کی مٹی سے والہانہ محبت اورقرب کی خواہش کی صورت میں ابھرے ہیں۔

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے

سب لوگ اپنے اپنے قبیلے کے ساتھ تھے
ایک میں ہی تھا کہ کوئی بھی لشکر مرا نہ تھا

ہر نئی نسل کو ایک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

ہندوستان کی آزادی کے بعد تبدیل شدہ زندگی اوراس کے تقاضوں کے پیش نظر دیہاتوں کی ایک بہت بڑی تعداد نوکریوں اور بہتر زندگی کے مواقع تلاش کرنے کے لیے گاؤں کی سرسبز فضا کو چھوڑ کر شہروں کی جانب دوڑنے لگی۔گاؤں ویران ہونے لگے اورمعصوم دیہاتی دولت وزر کی چمک و دمک دیکھ کر شہری وصنعتی زندگی کی بھیڑ میں گم ہونا شروع ہوگئے۔ پرانے زمانوں میں گاؤں کی ایک مخصوص تہذیب تھی۔ جہاں ایک مشترکہ خاندان ہوتا تھا۔ باہمی رشتے محبت کی ڈور کو مضبوط کرتے

تھے۔ کھیت کھلیان اور پگڈنڈیوں پر کھڑے سایہ دار درختوں کی چھاؤں اجنبی مسافروں کے لیے سامانِ راحت فراہم کرتی تھی۔ جہاں سب کے سکھ اور دکھ مشترک ہوتے تھے وہ لوگ جنھوں نے گاؤں چھوڑ کر شہروں کی جانب ہجرت کی ان کی روح میں آج تک گاؤں کی اسی فضا کی کشش باقی ہے۔ جو رہ رہ کر غزلیہ علامتوں کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر ابھرتی ہے۔

اب تو چپ چاپ شام آتی ہے
پہلے چڑیوں کے شور ہوتے تھے
محمد علوی

شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں
بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے شانوں پر
جاں نثار اختر

مندرجہ بالا اشعار میں مظاہر فطرت سے دلچسپی اور پیڑ جنگل اور گاؤں کا ذکر لاشعوری طور پر انسان سے فطرت کے رشتے کی نشان دہی کرتا ہے۔ نئے شہروں کے چونے پتھر کی دیواروں اور پختہ سڑکوں کے بیچ مظاہرِ فطرت کھونے لگتے ہیں۔ درختوں اور جنگلوں کی شادابی دیکھ کر اب آمد بہار کا احساس نہیں ہوتا۔ اونچی عمارتوں کے درمیان سورج نکلتا اور ڈوبتا دکھائی نہیں دیتا۔ آتے جاتے موسموں کی تبدیلی گھر آنگنوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس یکسانیت سے بیزاری کے ردِعمل کے طور پر نئی غزل میں جنگلوں اور کھیتیوں کا ذکر انسان کی فطرت سے محبت کی علامت کی شکل میں ابھرتا ہے۔ جہاں قدم قدم پر گاؤں کی پرسکون زندگی اور سرسبز فضائیں غزلوں میں جھلکتی نظر آتی ہیں۔

اب بھی قدموں کے نشاں ملتے ہیں
گاؤں سے دور پرے جنگل میں
محمد علوی

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو چنچل ہے پروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹہ پھینک گئی دھانوں پر
جاں نثار اختر

ایسا ہنگامہ نہ تھا جنگل میں
شہر میں آئے تو ڈر لگتا تھا

محمد علوی

ہندوستانی ناقدین نے جنگل کو روح کی تنہائی کی علامت کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جدید انسان پتھر کی سخت دیواروں اور شہروں کی گہما گہمی سے گھبرا کر پھر سے مظاہر فطرت میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کیوں کہ فطرت سے اس کا رشتہ ازل سے استوار ہے اور اسی لئے جدید غزل میں اس کے باوجود ایک سبک نرم رو اور خوشگوار احساس ملتا ہے جو دھیمے پن کے ساتھ مل کر مزید نکھر جاتا ہے۔ اس غزل میں مختلف حوالوں کے ساتھ نئی علامتوں کا اتنا زیادہ استعمال کیا گیا ہے کہ یہ غزل ۵۰ تک کی غزل سے بھی قطعی مختلف نظر آتی ہے۔ ۱۹۵۰ء تک غزلیہ شاعری پر فارسی غزل کی گہری چھاپ تھی اس غزل میں معنوی جہات تو ضرور تبدیل ہوئیں اور اسلوب بھی کافی حد تک بدلا لیکن ذخیرۂ علامات میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوسکا۔ البتہ ناصؔر کاظمی، خلیلؔ الرحمٰن اعظمی اور ابنِ انشاء کے یہاں غزل کے بدلتے ہوئے مزاج کے آثار صاف طور پر دکھائی دینے لگے تھے۔ ۶۰ء کے بعد یہ تبدیلی بالکل واضح ہو کر سامنے آئی اور یوں نئی غزل میں بے شمار ایسی علامتیں شامل ہوگئیں جو اب تک غزل کی زبان کے لیے نامانوس تھیں یا غزل کے دائرے سے خارج تھیں یہ علامتیں ہماری روزمرہ کی زندگی سے اس قدر قریب ہیں کہ قاری کے لیے غیر ضروری طور پر بوجھل ثابت نہیں ہوتیں۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

"نئے اثرات کے تحت لکھی جانے والی شاعری اپنے طرزِ فکر اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے پچھلی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ پرانی ادبی اصطلاحوں اور ترکیبوں کی مدد سے اسے نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ سمجھایا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت سے انحراف کی شاعری ہے یا یہ باغیانہ شاعری ہے اس میں ماتمی شاعری کی لے ملتی ہے تو اس شاعری سے انصاف نہ ہوگا واقعہ یہ ہے کہ پرانے تنقیدی لیبل اس پر ٹھیک نہیں بیٹھتے کیوں کہ یہ نہ مقصدیت کی شاعری ہے اور نہ نثری ادبیت کی۔ یہ نہ داخلیت کی آواز ہے نہ خارجیت کی۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی تفہیم بھی یہاں بے کار نظر آتی ہے یہ فرار یا قرار کی شاعری بھی نہیں ہے یہ تو محض انسان کو اپنے اصلی روپ میں دیکھنے کی جستجو ہے یا غم اور

حسرت کو محض غم اور حسرت سے سمجھنے کی کوشش ہے۔'' (نقوش خاص نمبر۔ص ۲۴۶)

اردو غزل میں شعرا نے صرف تنہائی، کرب اور مناظرِ فطرت کو ہی موضوع بنایا مگر ان موضوعات کو برتنے کے لیے کچھ شعراء نے جن علامات کا سہارا لیا وہ قاری کے لیے نا قابل فہم ہوگئیں۔ علامتوں کی رو میں بہہ کر شعراء نے ترسیل وتفہیم کے نکتے کو فراموش کر دیا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جدیدیت کے تحت داخلیت کے رجحان نے فرد کو سماج سے کاٹ دیا۔ ترقی پسند تحریک نے جس اجتماعیت کو اپنا اوّلین مقصد قرار دیا جدیدیت کے علمبرداروں نے اسے یک قلم مسترد کر دیا لہٰذا غزل اور نظم دونوں اصناف میں جہاں ایک طرف ہیئت، اسلوب، زبان، تشبیہات و استعارات کے معاملے میں شاعری کے میدان کو وسعت دی وہیں حد سے بڑھی ہوئی داخلیت نے انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لی۔ انفرادی علامات نے قاری کے لیے افہام وتفہیم کے راستے مسترد کر دئے جس کی جانب ناقدین نے اشارے بھی کئے ہیں۔

''جدید شاعرانہ حسیت نے علامات اور شعری تجسیمات سے بڑا کام لیا ہے اور اظہار کے سرمائے میں ان کے ذریعے اہم اضافہ ہوا ہے لیکن یہ بھی ہوا ہے کہ علامات ذات کے حصار میں مفید رہ جاتی ہیں اور شعری تجسیمات باہمی تناقص ہی نہیں چپقلش کا سماں دکھاتی ہیں پہلے کسی شعر کا دولخت ہو جانا ہی بڑا عیب کہا جاتا تھا اب مفہوم کے پرزے اُڑنے کا تماشہ ہوتا ہے اور لوگ دیکھتے ہیں۔ متعدد صورتوں میں شعری پیکر تراشی لفظی صحت وصداقت اور معنوی گہرائی ایک مجموعی پراگندگی کا شکار ہیں دراصل لفظوں سے وفاداری کی دلیل ہے لیکن یہ وفاداری آ گہی کے بغیر ممکن نہیں۔'' (متوازی نقوش ص۔۳۷۵)

مندرجہ بالا استباق ثابت ہوتا ہے کہ ابہام اگر حد سے گزر جائے تو بجائے حسن کے سقم ہو جاتا ہے۔ غالبؔ، مومنؔ اور ان کے دوسرے ہم عصر شعراء کے یہاں ہمیں ابہام کے نمونے اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن یہ ابہام بلند مضمون کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ شعر کی فکری وحدت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اگر شعر کی یہی خوبی حد سے بڑھ جائے کہ انسانی عقل کی رسائی اس تک نہ ہو سکے تو اسے نہ ہی مضمون آفرینی کا نام دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بلندیٔ فکر کی مثال کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے ایسی تخلیقات قاری اور فنکار کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دیتی ہے جس کو پاٹنا نقاد کے

اختیار میں بھی نہیں ہوتا۔ اچھا ابہام قاری کو تھوڑی دیر کے پس وپیش میں ضرور ڈال سکتا ہے مگر یہ صورت حال دیر پا نہیں ہوتی جیسے جیسے اس پیچیدگی کے پیچ کھلتے جاتے ہیں ویسے ویسے پوری صورتحال قاری پر واضح ہو جاتی ہے اور جب یہ تصویر پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے تو خود قاری بھی اس کی مصنوعیت اور الجھاؤ کی عارضی صورتحال سے محظوظ ہوتا ہے اور پھر ہر فنکار کی خود یہ تمنا ہوتی ہے کہ پڑھنے یا سننے والا اس کے پیغام کو سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ایک عام قاری سے اس بات کی توقع رکھنا فضول ہے کو وہ کسی ایسے تجربے یا مشاہدے کی گرہیں کھولنے کی کوشش کرے جس سے کبھی گزرا ہی نہیں ہے۔

اکثر جدید شعراء نے اس نکتے کہ نظر انداز کیا اور ذاتی وشخصی علامتوں کی رو میں بہہ کر عجیب وغریب علامات استعمال کیں جو مضحکہ خیز حد تک جدید تھیں۔بعض اوقات تو یہ علامات اعتدال کی حد سے بھی گزر گئیں اور انفرادیت کی دھن نے جدید غزل گویوں سے بے تکلف غزل، اینٹی غزل اور آزاد غزل جیسی اصناف کی ایجاد کرائی۔ یہ بات درست ہے کہ ہر چیز ایک معیّنہ مدت کے بعد پرانی ہو کر ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی نئی چیز لے لیتی ہے۔اردو شاعری میں ہیئت کے سلسلے میں جو تجربات کئے گئے ہیں ان کے ساتھ یہی حالات پیش آئے اور ٹیڈی غزل اور عین غین غزل کا رواج ہوا مگر ایسی غزلوں میں چونکہ شاعری کی بنیادی خصوصیت ''غنائیت'' مفقود تھی لہٰذا یہ رجحان بہت جلد ختم ہو گیا۔

نئے پن کی دھن میں شعراء نے نہ صرف ہیئت کے میدان میں بلکہ تراکیت والفاظ کے ضمن میں بھی جدت لانے کی کوشش کی اور ایسے الفاظ وتراکیب اور علائم کا استعمال شروع ہوا جو زبان سے مناسبت نہ رکھنے کی وجہ سے سراسر غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔حنیف فوق لکھتے ہیں۔

''تمام فکری نظاموں کی شکست وریخت بھی آج کے شعوری مزاج کا حصہ ہے اور اس سے بڑھ کر صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ کسی بھی واضح فکر کے بجائے غیر مسلک کیفیتوں یا پرچھائیوں کا ایسا طومار نظر آتا ہے کہ جن سے اخذِ معانی دشوار ہو گیا ہے۔جدید شعری حسیت نے روایتی طرزِ اظہار، بیانیہ خطابت اور معنوی تنظیم سے پیچھا چھڑا لیا ہے اور فنی اظہار کے حدود وسیع کئے ہیں اس میں شک نہیں کہ فوری تجربے کو خود تجربے کی حیثیت سے قابل قبول بنانے میں ذاتی وسائل، مشاہدے نے نئی صورت سازی کی ہی لیکن فنی تخلیق اگر زندگی کی لایعنیت پر مبنی

شاعرانہ تجربے کو پیش کرتے ہوئے خود بھی لایعنیت کا شکار ہوجائے تو یہ عجزِ انسانی اور نافہمی سخن کی دلیل ہے۔''

ان علامات سے جدید شہری زندگی کو نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کا رجحان ملتا ہے لیکن تخلیق کا تعلق موضوع کے ساتھ فن سے بھی ہوتا ہے۔ جدید شعراء نے اس بات کو اکثر مقامات پر نظر انداز کیا ہے۔ نتیجتاً زبان و بیان کی تبدیلی جہاں ایک طرف نئے موڑ کا پیش قیمہ ثابت ہوئی وہیں پیچ در پیچ علامتوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر عام قاری کی پہنچ سے دور ہونے لگی۔ جدید غزلوں میں بے شمار ایسے اشعار ملتے ہیں جن کی علامت فنکار کے اپنے ذہن کی اختراع ہے اس لئے اکثر اوقات فنکار اور قاری کے بیچ ایک ایسا فاصلہ قائم کردیتی ہے جو ادب کے لیے یقیناً خوشگوار نہیں ہوتا۔ مثلاً

لمبی سڑک پر دور تلک کوئی بھی نہ تھا
پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا
محمد علوی

ایسے اشعار کی بہت سی مثالیں جدید غزلوں سے پیش کی جاسکتی ہیں جن کی تفہیم یا تو قاری کے لیے مشکل ہوتی ہے یا ناممکن ہوجاتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایسے اشعار کی توجیہہ خود قاری اپنی پسند اور مرضی کے مطابق کرسکتا ہے مگر اس میں قباحت یہ ہے کہ یہ علامتیں ذکی الفہم لوگوں کے لیے موضوعِ بحث بن کر مزید الجھ جائیں گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا کہ جدید غزل میں پیچیدگی اور الجھاؤ کا یہ اندازہ کہاں سے آیا۔ دراصل شاعری کی یہ پیچیدگی اور الجھاؤ ہوا انداز ذہن کے الجھاؤ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ پرت در پرت زندگی کے دائروں کو توڑنے کی کوشش میں اپنے آپ سے الجھتا یہ انسان جب ان الجھنوں کا اظہار فن کی سطح پر کرتا ہے تو مبہم خیالات الجھی ہوئی شکل میں کاغذ پر پھیلتے جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام پہلوؤں سے قطعِ نظر یہ نکتہ لائق تحسین ہے کہ جدید شاعری نے فرد کو محض سماج کی اکائی کے روپ میں نہیں دیکھا بلکہ بہ حیثیت انسان اس کی شناخت بنانے کی کوشش کی ہے۔

☆ جدید غزل میں عشقیہ مسائل

عشق کی انسانی زندگی میں مرکزیت اور اہمیت سے کسے انکار ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو ازل سے آدم اور اولاد آدم کی سرشت میں شامل ہے مگر عشق کے رویے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ قلی قطب

شاہ سے ولیؔ، میرؔ اور اس کے بعد غالبؔ و داغؔ تک عشق کی روایات میں بہت اہم اور قابل غور تبدیلیاں آئیں جن کا تعلق اپنے عصری سماج سے رہا۔ کبھی اس عشق کا تعلق روح سے جوڑا گیا کبھی جسم کو منتہائے محبت سمجھ کر خواہشِ وصل کے بیان پر اکتفا کیا گیا۔ جس کی مثالوں سے ہمارا کلاسیکی سرمایۂ شاعری بھرا پڑا ہے۔ گذشتہ ادوار میں عاشق اپنی زندگی کا بہترین حصہ وصلِ محبوب کی خواہش میں برباد کیا کرتا تھا اس کے نزدیک محبت کی زندگی کا واحد اوّلین مقصد تھا اور معشوق کا ظالم اور تغافل آشنا ہونا عشقیہ غزلوں کے موضوعات کی پہلی شرط تھی مگر غالبؔ تک پہنچتے پہنچتے اس روایتی عشق کے کردار و اطوار میں تبدیلی کے نشانات ملنے شروع ہوگئے۔ ایک طرف محبت سے بیزاری کے آثار کم ہی سہی مگر عشقیہ غزل میں اپنی جگہ بنانے لگے۔ مثلاً

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
غالبؔ

غزل میں فراقؔ و یگانہؔ تک آتے آتے اس روایت میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ اب ہجر کے صدمے اور جدائی کے کرب میں معشوق بھی عاشق کا برابر کا حصہ دار بن گیا۔ غمزہ و ادا کے پردے سمٹنے لگے اور اس سے برآمد ہونے والا نیا چہرہ ہمارے متوسط طبقے کا مانوس معشوق تھا جو وفا شعار بھی تھا اور حیادار بھی۔ اب غم جاناں کے ساتھ غم دوراں بھی موضوع سخن ہونے لگا بلکہ اکثر تو غم روزگار غمِ عشق پر غالب آ گیا۔ فراقؔ کے ہم عصروں میں فیضؔ کے یہاں اس کی جھلک بار بار دیکھنے کو ملتی ہے اس سے بھی آگے بڑھیں تو یہ تصور عشق مومنؔ اور حسرتؔ کی پاکیزگی محبت کو روندتا ہوا جنس کے دائرے میں داخل ہونے لگتا ہے۔ حسرتؔ وغیرہ کے زمانے میں اخلاقی ضابطے بہت سخت تھے۔ عرت اور مرد کے درمیان گھر کی چاردیواری حائل تھی۔ اس صورت حال میں تصور عشق کی پاکیزگی کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ لیکن آج کی میکانکی زندگی تیزی سے پھیلتے ہوئے شہروں اور بڑھتی ہوئی ضروریاتِ زندگی نے عورت کو بھی مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دونوں جنسوں کے درمیان ان سمٹتے ہوئے فاصلوں نے آداب محبت اور اخلاقی ضابطوں کی اہمیت وافادیت کو برقرار رکھا ہے مگر دھیرے دھیرے اقدار بدلنی شروع ہوگئیں۔ جدید غزلوں کی علامتوں میں عشق کے اس بدلتے ہوئے تصور کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ہندوستان کے ان بدلتے ہوئے عشقیہ رویوں کی پہلی شکل یہ ہے کہ اب عشق زندگی کا حاصل

نہیں بلکہ لمحاتی رفاقت سے عبادت ہے آج کا مصروف انسان انتظارِ محبوب میں عمر کا قیمتی سرمایہ نہیں گنواتا بلکہ چند دن کے بعد زندگی کی دوسری رنگینیوں کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ اب جذبۂ عشق دائمی حیثیت رکھنے کے بجائے وصال یار کے بعد بیماری کی کیفیت میں بدلنے لگا ہے۔ پہلے قربت کی خواہش حاصل حیات تھی اب آرزوئے فرقت موضوع سخن ہے۔ یہ بدلتے ہوئے رجحانات لفظی علامتوں کی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتے بلکہ شعر کا مجموعی تاثر زندگی کے اس تبدل کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

کوئی دن کو جدا ہوجاؤ ہم سے
بہت دن سے یہ دل بے آرزو ہے
شہاب جعفری

سب سے کیا ہے وصل کا وعدہ الگ الگ
کل رات وہ سبھی پہ بڑا مہربان تھا
عادل منصوری

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا
(حسن نعیم)

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے
کچھ دور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن
احمد فراز

جدید رویہ ترقی پسند غزل گویوں کے اس رویے سے قطعی مختلف ہے جو غمِ دوراں کے آگے غمِ جاناں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے یہاں ترکِ عشق کی وہ صورت نہیں جو ان سے پہلی نسل کے شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے نہ ہی ایسا ہے کہ جدید فرد میں جذبہ عشق ناپید ہے یا ختم ہو گیا ہے بلکہ یہ وفاداری اور بے وفائی کے بیچ کی کوئی شئے ہے جس کی کوئی اصطلاح بنانا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ یہ اشعار نئے سماجی ڈھانچے میں آنے والے تغیر کی علامت ہیں۔

عشق کا دوسرا رویہ وہ ہے جسے ہم جسم و روح کے امتزاج سے ابھرنے والے عشق کا نام دے سکتے ہیں۔ ناسخ، جرأت، اور اکثر میر جیسے شاعر کے یہاں جسمانی عشق کا صرف خارجی پہلو دکھائی دیتا ہے یا پھر وہ افلاطونی عشق جس میں لمس کا تصور عشق کی تقدیس کو مجروح کرتا ہے۔ مگر جدید شاعری میں یہ عشق نہ صرف جسمانی وصل ہے اور نہ صرف مجرد احساس، بلکہ ایک حقیقت ہے جہاں محبت بھی دنیاوی اور تقاضے بھی فطری ہیں۔ یہاں ایک ارضی انسان کا تصور ابھرتا ہے جس کے یہاں فرشتوں کا تقدس نہیں انسانی جبلت کی کارفرمائی ہے۔ یہاں خارجیت اور رومانیت کا امتزاج ایک ایسی فضا کی تخلیق کرتا ہے جس میں انسان کھل کر سانس لے سکے جہاں محبت اپنی تمام تر ارضیت کے باوجود ایک صاف ستھرا تاثر پیدا کرتی ہے۔

سپردگی شاخ گل کی وحشت غزال کی ہو
جو اس طرح کی ہو پھر دوستی کمال کی ہو
احمد فراز

وہ رنگ تھا کہ بکھرنے کی آرزو تھی اسے
میں سنگ ہوں کہ مجھے شوق ہے پگھلنے کا
ظفر اقبال

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں
احمد فراز

☆ جدید غزل میں جذبات و احساسات کی عکاسی

جدید اردو غزل حسن و عشق کے یہ بدلتے معیار لاشعوری طور پر انسانی جذبات و احساسات کے نشیب و فراز اور ڈوبتی ابھرتی نفسیاتی پرچھائیوں کے عکاس ہیں۔ زندگی کی معروضیت نے عشق کو دل اور دنیا کے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے جہاں کبھی اپنی ہی محبت بچکانہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ انسانی نفسیات کی یہ پرتیں ہی نئی شاعری کا خاصہ ہے۔

اس سے بچھڑتے وقت رویا تھا خوب سا
یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا
محمد علوی

اس کے ساتھ ہی معاشرے کی بے راہ روی اور عشق کی مرکزیت سے متعلق بہت سے ایسے اشعار ہیں جو نئی زندگی میں محبتوں کی خیانتوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہاں اخلاقیات، مذہب، اصول واقدار فطری جبلتوں کے آگے سپر ڈالتی نظر آتی ہے۔جس میں ایک خودغرضانہ رویہ ابھرتا ہے۔ جس میں پاکیزگی اور عصمت کا کوئی تصور نہیں، جبلی ضرورتوں کی تکمیل کا ہی پیش نظر ہے۔ یہاں لمحۂ موجود ہی زندگی ہے جس کا احساس خود فنکار کو بھی ہے۔

نئی شاعری کے موضوعات اس قدر متنوّع ہے کہ ایک ہی جذبے کے مختلف شیڈس کے لیے فنکار کو ہر بار نئے علائم کی ضرورت پڑتی ہے۔اس لیے پرانے الفاظ اب اپنی معنوی حدوں کو سمیٹ کر نئی غزل سے الگ ہونے لگے ہیں۔ حالانکہ اب بھی اکثر اوقات ان الفاظ کی گونج کہیں کہیں سنائی دے جاتی ہے مگر نئے قاری کے لیے ان میں وہ کشش باقی نہیں رہی جو جدید علامتوں کے لیے مخصوص ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ غزل نئی ذہنی کیفیات اور طرزِ احساس کا آئینہ ہے۔اس لئے یہاں غزل کی ایک نئی فضا ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آج کا انسان اپنے ماحول اور گردوپیش سے پوری طرح مانوس ہے۔اس فضا پر تبصرہ کرتے ہوئے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں۔

> **''نئی شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ نے یقیناً اس کے معنوی امکانات کی حدیں وسیع تر کردی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نئی شاعری میں، شعری الفاظ میں کوئی تخصیص برتی یا حد بندی قائم نہیں کی گئی ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر وہ لفظ خواہ اس کا تعلق روزمرہ سے ہو یا نہ ہو جو معنوی امکانات سے معمور ہے، شعر میں مستعمل ہوسکتا ہے اس رویے نے شعری لفظیات کے مفروضہ اصول پر کاری ضرب لگائی ہے بظاہر معمولی نظر آنے والے الفاظ بھی اپنے اندر زندہ متحرک وتوانا قوت رکھتے ہیں شاعر لفظوں کا سچا پارکھ ہوتا ہے وہ تخلیقی لمس سے الفاظ کے اندر سوئے ہوئے خوابوں خیالوں اور تصوروں کو جگاتا ہے اور ایک نئی شعری لسانیات کی تشکیل کرتا ہے۔''**

جدید شاعری فن کے اس رمز سے بخوبی واقف ہے اس لئے نئی علامتیں موضوعات کی اداسی کے باوجود اپنے نئے پن کے باعث شگفتہ ہیں۔

جدید غزل میں نئی علامتوں کے ساتھ ہی چند قدیم لفظیات کو جدید مفہوم میں استعمال کرنے کی کوشش کی گئی جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ دور ایک پیچیدہ اور کشمکش سے پر دور ہے جہاں کارزارِ

حیات میں نبرد آزما انسان کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بے سروسامانی، اپنوں کی غداری اور حالات کی تپتی دھوپ کے سامنے ہمت و حوصلے سے کھڑے انسان کو آج کے شاعر نے عہدِ قدیم کے سانحۂ کربلا سے مماثل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں مجبوری کا عنصر بھی شامل ہے۔ شاید یہ احساسِ بے چارگی مظلومیت اور زندگی کے صحرا میں منزل کی جستجو سے پیدا ہو رہا ہے۔ ان اشعار میں مایوسی یا فریاد نہیں بلکہ دل پر گزری ہوئی کیفیت کا بے لاگ اظہار ہے بغیر کسی خواہش یا آرزو کے بالکل ایسی جیسے سڑک پر ہونے والے حادثے کو دیکھنے کے لیے کوئی راہگیر ٹھہر جائے۔

اردو شاعری میں حادثۂ کربلا کا ذکر شاہانِ اودھ کے زمانے سے چلا آ رہا ہے لیکن اس وقت تک یہ موضوع رثائی شاعری تک محدود تھا۔ کلاسیکل غزل میں سانحۂ کربلا کو بہ حیثیت استعارہ یا علامت استعمال کے نشانات کسی بھی شاعر کے یہاں نہیں ملتے البتہ مرثیوں میں یہ ذکر بہت موثر انداز میں کیا گیا ہے مگر یہ انداز بھی براہ راست ہے اور مرثیے کا مقصد مذہبی ہے۔ سماجی نقطۂ نظر سے اس میں کسی بھی پہلو کو تلاش کرنا فضول ہوگا۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ بہ حیثیت صنف مرثیے کو اردو ادب میں ایک باوقار مقام حاصل ہے البتہ بعد کے زمانوں میں محمد علی جوہر کے کلام میں اس حادثے کو باغیانہ انداز میں اور سیاسی مفہوم میں استعمال کیا گیا۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید تھا
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
محمد علی جوہر

آزادی کے بعد غزل میں جہاں دوسرے الفاظ اور روزمرہ کی چیزیں علائم بن کر داخل ہوئیں وہیں مرثیے سے استفادہ کرتے ہوئے شعراء نے کربلا اور اس کی انسلاکات کو غزل کے علائم کا اہم حصہ بنایا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ علامت غزل میں بہت موثر انداز میں ابھری اور اپنے عہد کی ایک سچائی کو بے نقاب کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ یہ کیفیت بہت واضح نہیں مگر انفرادی سطح پر کئی شاعروں کے یہاں اس کا جا بجا استعمال ملتا ہے، سید محمد عقیل لکھتے ہیں۔

''ایک ذہنی انتشار، بے یقینی اور دربدری کے احساس کے ساتھ نہ معلوم کہاں واقعہ کربلا کی اشاریت اور مظلومیت بھی تیزی سے داخل ہو رہی ہے۔ میرے لیے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ نئی غزل میں یہ کیفیت دبے پاؤں کہاں سے داخل ہوئی بظاہر تو کوئی بیرونی دباؤ externalDepression

نہیں معلوم ہوتا، نہ اس کیفیت میں تفاخر ہے نہ اعلان، نہ ترقی پسندی کی للکار، حالات میں پستے ہوئے ان لوگوں میں جو کربلا کی اشاریت، قرأت، نوکِ سنان پر سر، اور جوئے خوں کی باتیں ملتی ہیں ان میں ایک طرح کی خودکلامی monolouge ہے جس میں اپنے دل سے باتیں کرنا یا صلاح کرنے کی صورت ہے، مظلومیت ابھرتی ہے نہ کسی مخالفت کے ظلم کا اعلان، نہ انصاف ملنے کی شکایت ہے بس جو کچھ محشرستان شاعر کے ذہن میں موجود ہے اس کا اظہار وہ اپنے اشعار میں کررہا ہے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ ہے یا نہیں اس کی تمنا اس موضوع کو پیش کرنے میں غزل گو کے یہاں واضح نہیں ہے۔"

یہ ضرور ہے کہ ایسے اشعار قاری کے ذہن کو تھوڑی دیر کے لیے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ کربلا سے متعلق علامتیں ہمارے غزل گویوں کے یہاں کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ انفرادی تجربات اور ان سے پیدا ہونے والے احساسِ کرب کی ترجمان ہیں اس لئے ان علامتوں میں بے پناہ اُداسی، تنہائی میں ہونے والی خودکلامی کی کیفیت ہے، جس میں احساس ضطب تو ہے مگر مرثیے کی طرح نوحہ خوانی یا گریہ وزاری کا پرشور انداز نہیں۔

سپاہِ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا
(افتخار عارف

سب تن بریدہ، پاؤں لرزیدہ نڈھال ہیں
اس دشتِ کربلا میں سمندر اتار دے
مظفر حنفی

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سنان پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
افتخار عارف

آج کے شاعر اور نئی غزل کے شاعر کا ایک المیہ ہے ہے کہ وہ ٹوٹے رشتوں کے اس موسم میں سانس لینے پر مجبور ہے۔ شہر در شہر کی صورت اختیار کرتی ہوئی صنعتی وتجارتی آبادیوں میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں وہ دیواروں کے درمیان اور چھتوں کے نیچے گھر کے سے ماحول میں ایک بے حد کم

وسعت پناہ گاہ میں رہ رہا ہے جہاں اس کا اپنا کوئی نہیں اس لیے کچھ رشتے اور رشتے دار تو ہیں لیکن اپنے پن کا رشتہ اب ختم ہو چکا ہے۔

نئی غزل میں وطن اب کوئی علامت نہیں اس کی جگہ وطن میں بے وطنی کے احساس نے لے لی ہے۔ خاندان ٹوٹ رہے ہیں کنبے سمٹ رہے ہیں جیسے کاروباری رشتوں اور طلب منفعت کی خواہشوں کے سوا یہاں کسی کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔

مدتوں میں نے دلوں پر ہی تو دستک دی ہے
اب کہاں جا کے بھلا خود کو پکارا جائے

تنہائی آج کے انسان کا ذہنی مقدر ہے جس نسبت سے شہروں کی بھیڑ بڑھ رہی ہے، انسان کے ایک حساس ذہن کا احساس تنہائی پہلے وہ پر رونق بازاروں اور پرچھائیوں کی طرح گذرتے ہوئے جلوسوں میں تنہا ہوتا تھا اب وہ گھر میں بھی تنہا ہوتا ہے۔

یہاں اب دیواریں گھروں کی تقسیم کی ایک تکلیف دہ علامتیں ہیں۔ وطن کی اب کسی کو یاد ہے تو ذہنی الجھاوؤں کے حوالے سے جہاں رشتے تقسیم ہو چکے ہیں اور قربتیں فاصلوں سے بڑھ کر ہیں۔

رفتہ رفتہ ان سے اڑ جائے گی یک جائی کی بو
آج جو گھر ہیں وہ سب دیوار و در ہو جائیں گے

جدید نئی غزل میں نئی علامتوں نے اپنے گرد نئی فکری جہتوں اور جدید شعری اطراف کا ایک حلقہ بنالیا ہے جو برابر نئی فانوسِ خیال کی طرح گردش میں رہتا ہے اور دیکھنے والی نگاہوں کو محو تماشائے دماغ رکھتا ہے۔

شعر یا پھر ادبی صداقت اس وقت تک اپنی معنویت سے محروم رہتی ہے جب تک وہ متحرک شعری پیکروں اور نئے حسی تجربوں کو جنم نہ دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب شعری تجربے کی بنیاد تخلیقی حسیت پر قائم ہو، یہی حسیت قاری یا سامع کو اس تجربے میں داخلی شرکت اور اس کی بازیافت پر آمادہ کرتی ہے۔

جدید غزل کا شعر خصوصیت کے ساتھ اس داخلی تحریک کے باعث شخصی تجربے اور تجزیے کو

غیر شخصی حدود تک آگے بڑھا دیتا ہے۔''سماج کی سوچ'' اپنی اجتماعیت کے منفرد خدوخال کو انفرادی زاویۂ نگاہ میں تلاش کرتی ہے اور یہی تلاش جونئ غزل کی تحسین میں پر جوش و بے خروش طریقہ پر معاون ہوتی ہے۔نئ غزل کی داد مشاعروں میں بھی ملتی ہے۔احمد فراز، بشیر بدر، وسیم بریلوی کی غزلیں اس کی طرف اشارہ سنج ہیں مگر زیادہ تر نئ غزل خاموش داد کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔

نئ غزل کے مطالعہ کے وقت''توارد'' کا احساس نہیں ہوتا اور دہرانے کے عمل کا قدم قدم پر مشاہدہ ممکن نہیں۔مصرح طرح پر غزلیں لکھنے کا رواج نہیں رہا، ہر نئے غزل گو کی ''طبع اختراع پسند'' اپنے لیے بیشتر نئ زمینوں کو اختیار کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے جانے پہچانے اسلوب اور مانوس انداز کے ساتھ غزل کہنے میں ہر نئے شاعر کو نیم شعوری بلکہ شعوری طور پر''تکلّف'' رہتا ہے۔

حسن مشترک سے تو انکار ممکن نہیں لیکن یہ اشتراک ہم رنگی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے خدوخال ہوتے ہیں اور اس لیے ہوتے ہیں کہ سوچ کا سرچشمہ جداگانہ ہوتا ہے اور ذاتی تجربے سے ہم آہنگ ہو کر فنی خلوص اسلوبیاتی سطح پر خود کو دوسرے تجربہ کی روایت سے الگ کر لیتا ہے۔استادانہ رنگ سخن سے نئے ذہنوں کے''اجتناب'' کو نئ غزل میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

وہ شخص کیا ہوا جو مقابل تھا، سوچیے
بس اتنا کہہ کے آئینے خاموش ہوگئے
راج نرائن رازؔ

گھر ہو محفل ہو یا ہو تنہائی
فاصلے اب کہاں نہیں ہوتے
عفت زرین

جانے میری آنکھوں نے کس کا خواب دیکھا ہے
راستے ہیں پھولوں کے خوشبوؤں کا زینہ ہے
علوی

حدِ جبریل سے آگے ہیں مرے نقش قدم
کیوں دہکتا ہوا سورج مری منزل ٹھیرے
منیر

اتنے شفاف نہ تھے، آئینے دل کے، لیکن
پھر بھی یہ گرد کدورت کبھی ایسی تو نہ تھی
محسن زیدی

انسان کے فکر و خیال میں نئے موڑ آتے ہیں تو پتھر پر لکیریں نہیں حسیاتی لہروں کی نئی تھرتھری سے نیا آہنگ جنم لیتا ہے اور نئی شعری صداقتیں وجود میں آتی ہیں۔

نئی غزل نے ایک روایتی صنف شعر ہوتے ہوئے بھی روایت سے انحراف کیا۔ ''تشبیہات و استعارات'' کا نیا نظام ذہنی سطح پر دید و دریافت کے نئے عمل کا نتیجہ ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بعض نئی علامتیں ہمارے اپنے دور کی ''تصویری کہانی''، بن گئیں۔

زمانے قدیم سے پرندہ ہماری تہذیب اور اس کے تصویر خانے کا ایک حصہ کہنا چاہیے۔ لیکن آج کا شاعر جب پرندے کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس پرندے سے مختلف ہوتا ہے جو نشیمن کے تنکوں اور قفس کی تیلیوں سے وابستہ رہا، شاخِ آشیاں اور برق کا ذکر اسی نسبت سے کم ہو گیا یعنی اس نے اپنی شعری تلازموں کو بدل دیا ہے۔

میں ساحل افتادہ پہ خاموش کھڑا ہوں
دریا میں نہاتے ہیں سر آب پرندے

سلیم احمد کے کچھ دوسرے شعر دیکھیے اور نئی غزل کے فکری المیہ کو محسوس کیجیے

وہ شہر تو چھٹ چکا ہے کب کا
اس عمر کو اب کہاں گنوائیں

اس شور کے باوجود ، دن بھر
کرتا ہے یہ شہر سائیں سائیں

تنہائی کا احساس آج محض، عزلت گزینی یا خلوت نشینی کی تمنا سے وابستہ نہیں، اس کے نفسیاتی سرچشمے بھی دوسرے ہیں یہ خود فراموشی کا عالم، یادشتِ گم شدگی کی سیر بھی نہیں اس کے احساس میں زندگی کی نفی کا جذبہ بھی نہیں ابھرتا۔ یہ پتھروں کے شہر میں اپنے تیشۂ انا کے ساتھ زندہ رہنے کی خواہش اسے جوئے شیر لانے کی کوشش سے ضرور تعبیر کر سکتے ہیں۔

یوں بھی تعبیر کے بغیر کوئی خواب شرمندۂ معنی نہیں ہوتا۔فیض نے تنہائی میں جونظم لکھی ہے وہ اپنے نفیساتی تجزیے کے اعتبار سے ایک نئے مرکز خیال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ اپنی انفرادی اور اجتماعی بازیافت کا مسئلہ بھی ہے جو آج کی شہری اور معاشرتی زندگی کا تجربہ اور قدروں کی شکست وریخت کے باعث نئی فکری جہت اختیار کر چکا ہے یہ انسانیت کے ماضی وموجود کے ملبہ سے ڈھونڈ نکالنے کی سعی ناتمام ہے۔

اجنبی شہر ہے دیکھو گے یہ چہرے کب تک
تم کو اس بھیڑ میں کھو جانے کا خطرہ بھی نہیں
علوی

شاعر مغرب علامہ اقبال نے جہاں فکر ونظر کے ایک مرحلہ میں اپنی سمتِ سفر اور جہت خیال کو بدل دیا تھا۔ان کی غزل نئے فکری پیمانوں کی شعری احساس ہے اور جدید غزل نئے حسیاتی افسانوں کی راگ مالا جہاں تخلیقی تجربہ حسی تجزیے سے نظر آتا ہے۔

اداراتی حلقۂ فکر وخیال ٹوٹ گیا جو روایتی غزل کہنے میں ہمارے شعراء کی بہت حوصلہ افزائی کرتا تھا اور قافیے کی رعایت سے مضمون کی تلاش میں بڑی سہولت ہوتی تھی، ہر شاعر کے یہاں یہی ہو اور ایسا ہی ہو یہ ضروری نہیں لیکن ایسا کچھ ہوتا رہا ہے کہ الفاظ کو پس وپیش اور مضمون کو کم وبیش کر کے کچھ ایسا رکھ دیا ہے کہ جو حق استادی کا ہے وہ ادا ہو گیا ہے۔

آج غزل کے شاعر کے کلام میں نہ کہیں پر آسمان کے زور وستم کی شکایت ہوگی نہ زمین کے ہنگاؤں کا شکوہ، دامن کے چاک اور گریبان کے چاک کی بات پہلے عشقیہ حوالوں کے ساتھ آتی تھی۔ اب عشق ومحبت کی وارفتگیوں کا وہ تصور ہی بدل گیا۔

فیض نے جب کہا تھا، مجھ سے پہلی محبت مرے محبوب نہ مانگ، تو بات سن لی گئی مگر یہ خیال بھی نہ گذرا کہ یہ بات ہمارے شعور وشعر میں کتنے بڑے انقلاب کا باعث بن جائے گی۔

شجر، ہرا پتہ، دریچہ، صلیب، جزیرہ، سمندر، ریت، یہ سب ہماری آج کی علامتیں ہیں۔ان میں پتھر یہ سمجھئے کہ نئی عصری حسیت کاTouch Stone ہے۔

نئی غزل کا لہجہ اس کی اپنی شعری شناخت کا وسیلہ ہے، وہ احساس کی شدت تجزیے کی صحت اور جذبے کی صداقت سے عبارت ہے اس نے نئے جمالیاتی اشاروں، کنایوں اور استعاراتی نظام

میں اس نے اپنے تارحریر دورنگ کی تشکیل کی ہے۔نئ غزل کی اس پیکر تراشی میں خصوصیت کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

منجمد خواب کی صورت ہے شبستانِ وجود
دل کی دھڑکن ہے کہ آشفتہ بیانی مانگے
علوی

میں سچ ہوں شہر کی فٹ پاتھ پر ملوں گا کہیں
مجھے خرید پرانی کتاب والوں سے
ظفؔر گورکھپوری

ایک ہی نقش سے سو عکس نمایاں ہوتے
کچھ سلیقہ تو الفاظ کو برتا ہوتا
راج نرائن رازؔ

ہر سانس لیتی شے پہ تا چادر دھوئیں کی تھی
اب پھول تھے شفق کے نہ پانی کے دائرے
رازؔ

جس طرح شعاعی خطوط کو گنا نہیں جا سکتا آج کی غزل کو شیشہ ساعت کی ریگ شماری سے تشبیہہ تو دی جا سکتی ہے مگر غالب کے الفاظ میں یہ سوچے بغیر چارہ نہیں کہ یہاں اگر ذرّہ صحرا دستگاہ ہے تو قطرہ دریا آشنا۔لیکن نئ غزل میں بعض شعرا کی فکری جہتوں کی پہچان ان کی انفرادی شناخت بھی ہے۔

احمد فراز کے یہاں بدلتی ہوئی انسانی نفسیات ہم ٹوٹتے جڑتے معاشرتی رشتوں کی جذباتی دھوپ چھاؤں میں دیکھ سکتے ہیں۔مخدوم محی الدین کی غزل کو ان کی حسیات جمیل کی خوبصورت امیجری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

چشم نم مسکراتی رہی رات بھر　　آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
رات بھر درد کی شمع جلتی رہی　　غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

خلیل الرحمٰن اعظمی اور ناصر کاظمی نے اپنی عصری حسیت میں ہر کے دل کی دھڑکنوں کی صدائے بازگشت کوسمونے کی کوشش کی، محسن زیدی اور عاشور کاظمی کے کربلا کے فکر انگیز استعارے معنوی توسیع ہوئی۔

کیا یہ لہو کا درد مرے سر پہ ختم ہے　　　کیا دوسروں کے سر پہ یہ خنجر نہ آئیں گے

نامناسب نہ ہوگا کہ بات کوختم کرنے سے پہلے عفت ذرین کے چند شعر اور پیش کردیئے جائیں۔جن کے فکر کی روشن پرچھائیاں غزل کے نئے موڑ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔مختلف سماجی مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔

مدت سے اپنی ذات کے تنہا سفر میں ہوں
خوشبو ہوں دل کی اور ابھی رہ گذر میں ہوں

تنہائیوں کی دھول مرے تن پہ اَٹ گئی
رُت کی طرح میں آئی یہاں اور پلٹ گئی

روح میں یادوں کا موسم رخ پہ اشکوں کی لڑی
زخم تازہ کرگئے پروائیوں کے سلسلے

دل کو یقین کیسے ہو پھولوں کے لمس کا
شیشے کی آرزو سے پتھر قریب ہے

غزل کبھی جمود کا شکار نہیں ہوئی اور اس میں زندہ رہنے کی خداداد صلاحیت ہے۔ ہر دور میں معنوی اور صوری اعتبار سے غزل اپنی توسیع خود کرتی رہی اسی ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے۔

''جدید اردو غزل کا فروغ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ غزل میں زمانے کی ہرنئی کروٹ کو اپنے خاص لہجے میں بیان کرنے کی بڑی صلاحیت ہے اور اپنے رمزیہ اور ایمانی انداز کی مدد سے سامنے کی چیزوں کو بھی اجتماعی تجربے کے اظہار کے لیے استعمال کرنے پر قادر ہے۔''

(اُردو شاعری کا مزاج -ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۷۴ء ص ۲۴۴)

☆ جدید غزل میں سماجی وسیاسی مسائل تذکرہ

یہ حقیقت ہے کہ اردو غزل گذشتہ ڈھائی تین سو برسوں کی اپنی زندگی میں کئی ادوار سے گزری

ہے اور ادبی روایات شعراء کی مخصوص انفرادیت اور روح عصر کے تقاضوں سے کبھی مفاہمت اور کبھی انحراف کرتے ہوئے اپنی عظمتوں کی تلاش میں آگے بڑھتی رہی ہے۔ اگر شاعروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے غزل کے دامن کو مالا مال کیا ہے تو نقادوں سے عظیم سرمایہ کو تاریخی، معاشرتی، نفسیاتی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے جانچ پرکھ کر اس کی اصل حیثیت متعین کی ہے۔ تخلیق و تنقید کا یہ عمل اردو ادب کے لیے فال نیک ثابت ہو سکتا ہے اس سلسلے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے باوجود مقالہ کے حدود کے پیش نظر بقولِ غالب

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

بات جدید شاعری کی ہو تو آیئے جدید شعراء کے یہاں جدید سماجی مسائل اور ان کے جذبات کا اظہار کس طرح شاعری میں کیا گیا پھر سے اس پر ایک نظر شعراء کے نمونۂ کلام سے ۔

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی
ساقیؔ فاروقی

اکیلا چاند آئینے کو ترسے
بھرے تالاب میں کائی پڑی ہے
شاہینؔ غازی پوری

دل بجھنے لگا عارض و رخسار کے ہوتے ہوئے
تنہا نظر آتے ہیں غم یار کے ہوتے
پروین فناؔ

الم نصیب تو رو رو کے سو گئے آخر
مگر ملول ہوَا رات بھر سسکتی رہی
مقبول عامرؔ

وہی چراغ بجھا جس کی لَو قیامت تھی
اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا
افتخار عارفؔ

عجیب خواب تھا تعبیر کیا ہوئی اس کی
کہ ایک دریا ہواؤں کے رُخ پہ بہتا تھا
آشفتہؔ چنگیزی

آج محصور ہیں دیمک زدہ دیواروں میں
ہم جو شامل تھے کبھی شہر کے معماروں میں
پرت پال سنگھ بیتابؔ

اب اس میں کیا ہے پرانی کتابتوں کے سوا
اٹھا کے طاق میں دل کی کتاب بھی رکھ دو
خورشید احمد جامیؔ

اپنی عظمت کی داستاں لے کر
گاؤں میں رہ گیا کھنڈر تنہا
ملک زادہؔ جاوید

عمر بھر مصروف ہیں مرنے کی تیاری میں لوگ
ایک دن کے جشن کا ہوتا ہے کتنا اہتمام
خلیل الرحمٰن اعظمیؔ

خبر نہیں ہے کسی کو بھی خستگی کی مری
مجھے نہ ہاتھ لگاؤ کہ ٹوٹ جاؤں گا
سلیمان اریبؔ

جو بات دل میں ہے کہہ لئے اٹھا نہ کل پہ اسے
بکھرتی ریت کا سمٹا ہوا بدن ہوں میں
لطف الرحمٰن

ڈرتا ہوں مرے سر پہ ستارے نہ آپڑیں
چلتا ہوں آسماں کی طرف دیکھتا ہوا
شہزاد احمد

جس طرف دیکھئے صحرا نظر آتا ہے مجھے
ان گنت صدیوں کا بن باس ڈراتا ہے مجھے
مدحت الاختر

اپنی آواز ہی سے خوف زدہ
شاخ در شاخ کانپتے پتے
کیف احمد صدیقی

کچھ دور پر بگولوں کی افواج ہیں کھڑی
کوئی بھی شہر میں نہیں کس کو خبر یہ دوں
شہریار

ٹپک پڑوں نہ کہیں میں بھی مثل برگ خزاں
ہوا نہ تھی مگر اندیشہ ہوا تو تھا
کرشن کمار طور

بارش کی بوند بوند سے ڈرتا تھا میرا دل
ایک ریت کے مکان کا معمار میں بھی تھا
مخمور سعیدی

کچھ نہ کچھ ساتھ اپنے یہ اندھا سفر لے جائے گا
پاؤں میں زنجیر ڈالوں گا تو سر لے جائے گا
بانی

عجب سپردگی برگ زرد تھی اس میں
وہ شخص کانپ اٹھا تھا ہوا کے چلتے ہی
مصور سبزواری

ہر لمحہ ایک خوف کہ بچنا محال ہے
اتنی بلندیوں کا طلب گار کون تھا
امیرؔ قزلباش

رات تاریک ہے نیچے سمندر ہر سو
اور ہم اڑتے ہیں اک زخمی پرندہ بن کے
قمرؔ اقبال

اب کے موسم میں لٹیرے بادلوں کو بھیج کر
ساری ہریالی زمیں کی آسماں لے جائے گا
شمیمؔ فاروقی

دم بخود تھے لوگ اپنے آپ سے سہمے ہوئے
گھر کے اندر عافیت کا ایک بھی گوشہ نہ تھا
نشترؔ خانقاہی

رہتے ہیں اہل شہر کے سائے سے دور دور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ہوئے
احمد فرازؔ

لرز جاتا تھا باہر جھانکنے سے اس کا تن سارا
سیاہی جانے کن راتوں کی اس کے در پہ رکھی تھی
باؔنی

حادثہ ہے کوئی ہونے والا
دل کی مانند دھڑکتی ہے زمیں
باقیؔ صدیقی

وقت اس طرح بدل ڈالے گا چہرے کے نقوش
اپنے ہی عکس کو دیکھ کے ڈر جاؤں گا
شادابؔ رضی

☆جدید غزل میں علاحدگی پسندی

اگر داخلی رویہ ماحول کی بے نیازی اور منفیت کا پیدا کردہ ہے تو انفعالیت، رہبانیت، یکسانیت، بوریت، بیزاری، اکتاہیٹ، اُبکائی وغیرہ کے رجحانات سامنے آتے ہیں اور فرد علاحدگی پسند ہوجاتا ہے۔نیتجتاًیا علاحدگی میں پناہ تلاش کرتا ہے۔

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے
احمد ندیم قاسمی

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
ناصر کاظمی

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں
ظفر اقبال

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مرگئے
وہ صدا جو ڈھونڈتی تھی جنگلوں میں کھوگئی
پرکاش فکری

جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیہہ
کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم وجد کا
مخمور سعیدی

بجز لاحاصلی کیا اور بام ودر پہ رکھا ہے
دیا بے منظری کا طاق ہر منظر پہ رکھا ہے
فضا ابن فیضی

روح کی دھوپ نہیں جسم کے ویرانوں میں
زندگی ڈھونڈنے نکلے ہیں بیابانوں میں
ارشد نظر

نہ شاخ ہوں نہ شجر جانے کس لیے شب بھر
خزاں کے خواب دکھاتی رہی ہوا مجھ کر
ظفرؔاقبال

گم ہیں سب اپنی صدا کے شور میں
میں جو کہتا ہوں کوئی سنتا نہیں
پریم کارنظرؔ

جُز ہجوم بے کراں کچھ بھی نہ تھا
منظروں کے درمیان کچھ بھی نہ تھا
علیم اللہ حالیؔ

سمندر کو اپنا سمجھتے رہے
مگر ہونٹ رشتوں کے تپتے رہے
خورشیدؔ اکبر

اب نہ وہ شاخ نہ منظر ہے شناسائی کا
اُڑ گیا آنکھ سے طائر مری بینائی کا
سلیم شاہد

اس نے بھی آسمان سے آنکھیں اتار لیں
تو بھی نہ یہ پتنگ اُڑا تیز ہے ہوا
لطف الرحمٰن

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگالیا
اندر و نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہوگئے
احمد فرازؔ

☆ جدید غزل میں داخلی مسائل

سماجی مسائل میں اگر داخلیت کا رویہ جبریت کا پیدا کردہ ہے تو ایسی صورت میں اجنبیت یا بے گانگی (Alienation) کا احساس حاوی ہوتا ہے جس کے نتیجے میں تشکیک گریز، نفی ذات، بے یقینی، بے ترسیلی، بے جڑی، بے وطنی، دیوانگی اور پاگل پن کے میلانات ابھرتے ہیں۔ مثلاً

اب وہ اک موجِ شب تار ہوں ساحل ساحل
راہ میں چھوڑ گیا ہے مرا مہتاب مجھے
شہاب جعفری

ہمیں منزل بہ منزل جاگنا ہے
پلک جھپکی تو پھر رستہ نہ ہوگا
مظہر امام

لبوں پہ جم گئی دیوار و در کی خاموشی
تمام شہر تھا ویراں صدا لگاتے کیا
ممتاز راشد

شہرِ وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے
پروین شاکر

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے
رستوں کے سب نشان اڑا لے گئی ہوا
بشر نواز

کس گھنے جنگل میں جا کر اب چھپیں اہل وطن
آنکھ سی ابھری ہوئی سورج کی پیشانی میں
وزیر آغا

اب تو اپنے آپ کو بھی اجنبی لگتا ہوں میں
کون مجھ سے چھین کر میری نشانی لے گیا
سلطان اختر

زمیں نے مانگ لیا، آسماں نے چھین لیا
ہمارے پاس نہ اب جسم ہے نہ سایا ہے
بشیر بدر

خوشیوں کی دھوپ درد کے سائے کہاں گئے
وہ لوگ جو تھے اپنے پرائے کہاں گئے
مغنی تبسم

بے چہرگی میں ڈھونڈتے ہی رہ گئے مجھے
ایسے بھی آئینوں سے مرا سامنا ہوا
غلام مرتضیٰ راہی

اندھیارا بھی اپنے گھر کا کتنا اپنا لگتا ہے
اس کے گھر سے تو سورج بھی بیگانہ سا لگتا ہے
حمیدالرحمٰن

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے
افتخار عارفؔ

وہ آج تک مری صورت مجھے دکھا نہ سکا
وہ آئینہ جسے تاعمر میں نے صاف کیا
وقار واثقیؔ

گدلے پانی میں نظر آیا نہ چہرا اپنا
روشنی لے گیا آنکھوں کی اندھیرا اپنا
صلاح الدین ندیمؔ

داخلیت، مثبت رویہ رکھتی ہے تو فعالیت وخودارادیت ، انتخاب، ذمہ داری اور فرض کا احساس نمایاں ہوتا ہے جس کے نتیجے میں فرد احتجاج، بغاوت، انقلاب یا شہادت کی راہ اختیار کرتا ہے اور کبھی کسی خارجی ماحول اور داخلی تقاضوں کے زیر اثر غصہ، نفرت، طنز، انتقام اور جرم وغیرہ کی نفسیات سامنے آتی ہے۔ اس مرحلے پر فرد مکمل یکسوئی کے ساتھ فعال اور متحرک نظر آتا ہے۔ فعالیت وعملیت اس کے ذاتی عقائد وایقان کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے جس کو کیا اکیلا پن کہہ سکتے ہیں مثلاً

نہ کوئی راستہ میرا نہ کوئی منزل ہے
توڑ کر بند کواڑوں کو میں باہر آؤں
الم خورشید

بھیڑ سے کٹ کے نہ بیٹھا کرو تنہائی میں
بے خیالی میں کئی شہر اجڑ جاتے ہیں
ندا فاضلی

کبھی کبھی تو مکمل بنا کوئی تصویر
کی زیب کچھ تو رہے ذہن نارسا کے لیے
زیب غوری

کرتے رہے تعاقبِ ایام عمر بھر
اڑتا رہا غبار بہ ہر گام عمر بھر
عزیز تمنائی

اس کی تو داد دے گا ہمارا کوئی رقیب
جب سنگ اٹھا ہے، سر بھی اٹھاتے رہے ہیں ہم
خلیل الرحمٰن اعظمی

ایک بے معنی تجسس، ایک بے معنی خلش
ایک شعلہ سا لپکتا جسم میں اکثر لگے
شاہد ماہلی

مری طرح کوئی اندر سے سنگسار نہ تھا
کوئی بھی شہر میں، مجھ سا گناہ گار نہ تھا
لطف الرحمٰن

لاچار خود ہی تھام لیا دست مدعا
مایوس لوٹ آئے تھے ہر بارگاہ سے
عزیز تمنائی

سبھی کو جان تھی پیاری، سبھی لب بستہ
بس اِک فراز تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا
احمد فراز

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا
پروین شاکر

فیصلہ چھوڑنا جرأت پہ دلوں کی اب کے
مجھ کو زخموں کی قبا اس کے سپر مت لکھنا
لطف الرحمٰن

مجھ کو گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں
جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے
شکیب جلالی

یہ کیوں دوراہے پہ تم رکھ گئے ہو جلتا دیا
اندھیرا اور بھی گہرا دکھائی دیتا ہے
منموہن تلخ

گھر بھی جلا، لہو بھی بہا، پھر یہ حکم ہے
فریاد مت کرو یہ کوئی حادثہ ہوا
وحید اختر

اب تک شریک محفل اغیار کون ہے
ہم بے وفا ہوئے تو خطاوار کون ہے
پروین فنا

آندھی کو اپنی شاخ میں روکے کھڑے رہے
یوں احتجاج کچھ نئے اشجار کر گئے
باقر مہدی

سرکشی اپنی ہوئی کم نہ امیدیں ٹوٹیں
مجھ سے کچھ خوش نہ گیا موسم آلام کبھی
حسن نعیم

جب داخلیت کا ارتقا خاکساری، سادگی، رومانیت، ایثار، ہم زبانی، انبساط ومسرت، انسانیت دوستی، حسن وخیر اور اخلاق وشرافت کی نفسیات کے زیر اثر ہوتا ہے تو اس کی منزل مقصود تخلیق فن یا مذہبیت و روحانیت ہوتی ہے۔ اس منزل پر فرد کی شخصیت داخلی کلیت و وحدت سے ہم کنار ہوجاتی ہے۔

دل میں تنہائی کے زخموں کے کنول کھلتے رہے
اور لمحے خشک پتوں کی طرح اڑتے رہے
آزادگلاٹی

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے
خلیل الرحمٰن اعظمی

شاید اس طرح مرے دل میں کھلیں تازہ گلاب
نئے نشتر مرے پہلو میں اتارے کوئی
اطہر نفیس

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ناصر کاظمی

انجان نگاہوں کی مانوس سی خوشبو ہے
کھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں
اداؔ جعفری

میں ایک ذرّہ مری حیثیت کیا ہے مگر
ہوا کے ساتھ ہوں اڑتے ہوئے غبار میں ہوں
عادلؔ منصوری

شاید مڑ کر دیکھنا بھی اب تیرے بس کی بات نہ ہو
کیوں تجھ کو مشکل میں ڈالوں کیوں آواز بھی دوں
آزاد گلاٹی

تمام شہر ہے دشمن تو کیا ہے میرے لیے
میں جانتا ہوں ترا در کھلا ہے میرے لیے
باتی

میں اس کا آئینہ ہوں، وہ ہے میرا آئینہ
رشتہ بڑا لطیف ہے میرا خدا کے ساتھ
اظہار اثر

☆ جدید غزل کے سماجی مسائل

سماجی اور سیاسی حالات کے بدلنے سے انسان خارجی اور داخلی طور پر متاثر ہوتا ہے جس کی خارجی عکاسی اس کے افعال، اعمال اور چہرے کی ڈوبتی ابھرتی لکیروں سے ہوتی ہے۔ مگر داخلی اثرات اتنے دیر پہ سنجیدہ اور پیچیدہ ہوتے ہیں ذہن و دل نہیں پورا انسانی وجود بے قراری و اضطراب کے ایک کرب ناک مرحلے سے گذرتا رہتا ہے۔ بکھرتی ہوئی روایتیں ٹوٹتے مسلمات اور الٹ پلٹ ہوتی ہوئیں قدریں اسے گھلاتی رہتیں ہیں۔ ہر دور کا عمدہ اور لا زوال شعر و ادب ان تمام داخلی پیچ و تاب تصادم اور عصری حسیت کا مظہر ہوتا ہے۔ کبھی فکر و خیال میں کبھی زبان و اسلوب میں اور کبھی ساخت و ہئیت میں تاریخ ادب اردو میں اس کی وافر مثالیں ملتی ہیں۔

سیاست، نظر حیات، اصلاح معاشرہ اور ارتقاء ملک سے بچھڑ کر شعبدہ بازیوں میں پناہ گزیں ہوتی گئیں۔ کارپوریٹ لائف کی دھمک فرد اور سماج کو الگ کرنے کے درپے ہوئی تو شعر و ادب نئی فکری جہتوں سے آشنا ہوا۔ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے ملک میں بیسویں صدی کے کئی گمبھیر مسائل یا ختم ہو چکے تھے یا روپ بدل چکے تھے۔ صارفیت نے پوری دنیا کو سمیٹ بھی دیا اور ایک بازار بنا دیا جس کے نتیجے میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی قدریں انحطاط پذیر ہوئیں۔ نئے مسائل سر ابھارنے لگے اسی کے ساتھ انتشار ذات کی کرب ناکیاں، احساس تنہائی، بیگانگی، بے چہرگی، لاچاری، اجنبیت، خوف، اکتاہٹ، مایوسی، اضطراب وغیرہ میں شدت آتی گئی لیکن ان احساسات کا مریضانہ

اظہار ختم ہوا۔اظہار میں ابہام اور علامت پسندی کا غلبہ کم سے کم ہوتا گیا۔نئے حالات میں نئے موضوعات بھی سامنے آئے اور اظہار میں بھی ایک رچا ہوا کھلا پن آیا۔حالات کے جبر کا رونا رونے اور سسکنے اور محروم و مجہول بننے سے اجتناب کرتے ہوئے فعالیت اور ضاربیت کی طرف قدم بڑھایا ۔منحرف لہجہ،غصہ،احتجاج ،زہرناک طنز ،بغاوت اور سفا کیت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ترفع ذہنی کے طور پر رومانیت اور ماضی کی بازیافت اس میں شامل ہیں۔

۸۰ کے بعد شعراء نے محبوب کی زلف گرہ گیر سے معشوق تصوری سے رومان خیالی سے سماجی حقیقت نگاری کی تھوپی ہوئی ترجمانی سے پرے سماجی و سیاسی، مذہبی ،اخلاقی غرض یہ کہ ہر قسم کے مسائل کو غزل میں شامل کیا۔جدید غزل میں شعراء نے جن مسائل پر طبع آزمائی کی اور سماج کا آئینہ غزل میں سمو کر قارئین کے سامنے رکھا۔آیئے جدید سیاسی اور سماجی مسائل کی چند جھلکیوں پر نظر ثانی کریں۔

عورتیں جہاں مردوں کے شانہ بہ شانہ ترقی کر رہی ہیں وہیں صنفی امتیاز اس کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔بچپن کی شادی ،بیواؤں کے مسائل ،طلاق شدہ عورتیں،شادی کے لیے اچھے رشتوں کا ملنا،آوارہ بدچلن کہہ کران پر طرح طرح کے ظلم کئے جاتے ہیں راستے کی مصیبتیں بتا کر انہیں ڈرایا جاتا ہے۔

جدید شعراء کس بے باکی کے ساتھ صنفی مسائل بیان کرتے ہیں۔

بہت سنبھال کر رکھا تھا نیک بیوی نے
ہوا چلی تو برادہ بکھر گیا گھر میں
بشیر بدر

تم نے جو مانگا ہے اس سے بھی سوا دے دیں گے ہم
آپ کی بیٹی کو ویرانہ بڑا دے دیں گے ہم
حسیب سوز

ابھی روشن ہوا جاتا ہے رستہ
وہ دیکھو ایک عورت آ رہی ہے
شکیل جمالی

حدوں کو بھول جانا چاہتی ہوں
خلاؤں میں ٹھکانا چاہتی ہوں
یاسمین حمید

یہ شہر کسی آئینہ کردار بدن کو
الزام لگاتے ہوئے ڈرتا بھی نہیں ہے
نوشی گیلانی

وہ میرے رستے میں آگ رکھ کر مجھے سفر سے ڈرا رہا تھا
اب آگ پر ننگے پاؤں چل کر میں اس کو ڈرانا سکھا رہی ہوں
عذرا پروین

ہماری زندگی بیوہ دلہن ، بھیگی ہوئی لکڑی
جلیں گے چپکے چپکے سب، دھوں کوئی نہیں دے گا
ظفر گورکھپوری

صنفی امتیاز میں سب سے بڑا مسئلہ لڑکیوں کی شادی اور جہیز کا ہے۔ جہیز ایک ناسور کی طرح پھیل چکا ہے۔ اس لعنت نے لاکھوں بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان کی معصوم آنکھوں میں بسنے والے رنگین خواب چھین لیے ہیں۔ ان کی آرزؤں تمناؤں اور حسین زندگی کے خوابوں کا گلا گھوٹ دیا ہے۔ انھیں ناامیدی مایوسی اور اندھیروں کی گہری وادیوں میں ڈھکیل دیا ہے جہاں سے اجالے کا سفر ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لعنت نے موجودہ میں ایسے پھن پھیلائے ہیں کہ غریب گھرانوں کے لڑکے بھی اپنے سے زیادہ مال وزر رکھنے والے گھرانوں کا رخ کرنے لگے ہیں جس کی وجہ سے غریب گھروں میں پیدا ہونے والی لڑکیاں شادی سے محروم اپنی چار دیواری میں بیٹھی رہنے پر مجبور ہیں۔ اس کرب کو شعراء کس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

باپ بوجھ ڈھوتا تھا کیا جہیز دے پاتا
اس لیے یہ شہزادی آج تلک کنواری ہے
منظر بھوپالی

دلہن کے ساتھ نہ آیا جہیز تو یہ لگا
کھلائے جیسے کریلا کوئی کھیر کے ساتھ ؔظفر کمالی

جہیز نام ہی سے رنگ اڑ گیا اس کا
غریب باپ کو بیٹی جہاں شناس لگی اجیت سنگھ حسرت

لیلا کے ساتھ کار بھی آجائے جہیز میں
مجنوں یہ کہہ کے ساس سے آگے نکل گئے سرفراز شاہد

جوان بیٹی کو ڈولی نہ دے سکا مفلس
سرہانے قبر کے مہندی کی پتیاں رکھ دے نسیم نکہت

میں جہیز میں تربیت لاؤں گی
تم حق مہر میں عزت دینا ملک احسان

چڑھ جائے نہ جہیز کو سولی اسی لیے
اب اپنی بیٹیوں کوبھی جوڈو سکھایئے چونچ گیاوی

ہاتھوں کو مل کے رہ گئیں مجبور داسیاں
پیلے جو ہاتھ راجکماری کے ہو گئے حسیب سوز

سیرت سے ہٹ کے لڑکی کے پیسے پہ تھی نظر
دولہے جو بکنے والے تھے وہ بے حساب تھے مرزا فاروق چغتائی

نفسیاتی کرب یعنی جب تک دماغ کو پریشانی اور تشویش سے فراغت نہ ہو دل جمعی اور تسکین پوری پوری نہ ہو وہ کم از کم کوئی بھی ایک ایسا معاملہ درپیش ہو جو خدوخال پر اثر پیدا کرنے والا ہو تب تک مکمل جسمانی تندرستی اور حسن کا حصول ناممکن ہے۔ تاہم اگر مکمل صحت چاہتے ہو تو پہلے دماغ میں مثبت خیالات اور سوچ کو جگہ دو افسوس وغم کی جگہ خوشی ومسرت اور طبعی پیدا کرو۔ یہ تمام نفسیاتی اور سماجی مسائل ہیں اور حقیقت بھی یہی ہیکہ ان کے منفی رجحانات ہی دماغی اور ذہنی سکون کے قاتل ٹھہرتے ہیں ۔ذہنی تناؤ دور جدید میں ہر دوسرے شخص کی زندگی کو اجیرن کئے ہوئے ہیں اس کے چیدہ چیدہ مضر اثرات درج ذیل ہیں۔

اس نئے زمانے کے آدمی ادھورے ہیں
صورتیں تو ملتی ہیں سیر تیں نہیں ملتی — منظر بھوپالی

فاصلوں میں خلش نہ راحت ہے قربتوں میں
میں جی رہا ہوں عجیب بے رنگ ساعتوں میں — ممتاز ارشد

سورج کی خودکشی کا بھی منظر عجیب تھا
بکھرا جو دائروں میں تو سمٹا چٹان میں — اطہر عزیز

غم و الم بھی ضروری ہیں زندگی کے لیے
فقط خوشی ہی کو معراج جسم و جاں نہ سمجھ — کلدیپ گوہر

اوروں کا درد بانٹ کر اپنا طواف کر
پرچھائیوں کے بیچ کھڑا سوچتا ہے کیا — اقبال اشیر

فاصلہ نظروں کا دھوکہ بھی تو ہو سکتا ہے
وہ ملے یا نہ ملے ہاتھ بڑھا کر دیکھو — ندا فاضلی

ابر پانی ہوا شجر سایا
میرے حصہ میں کچھ نہیں آیا — احسن یوسف زئی

غرض کہ ٹوٹ چکا ہوں مگر سلامت ہوں
بچا ہوا اسی احساس کی بدولت ہوں — شکیل اعظمی

ایک لمحہ کا سکون بھی کس کو ملتا ہے یہاں
ہر نئی الجھن کی زد میں آج کا انساں ہے — مظفر النساء

سماجی ناانصافی جدید دور کا اہم مسئلہ ہے جو شہروں میں گاؤں میں غربت میں جہالت میں پسماندگی میں ہر جگہ اپنا پھن پھیلائے کھڑا ہے۔ بیویوں پر تشدد بچوں کو ڈانٹ پھٹکار خاوند خود کسی بڑے زمیندار، فیکٹری، اونر یا کمپنی ملازم کی جسمانی اور ذہنی اذیت برداشت کرتا ہے بولتا نہیں احتجاج نہیں کرتا جواب نیں دیتا کیونکہ نوکری سے ہاتھ دھونے کی فکر میں وہ طاقتور کا ظلم سہتا ہے اور اپنے سے کمزور بیوی بچوں پر پریشر منتقل کرتا ہے۔ حقوق اس کے اپنے پاس نہیں ہوتے بیوی بچوں کو کہاں سے

دیگا۔ظلم سہنا ظلم کلچر ہے۔حقوق نسواں ،حقوق مرداں یا حقوق انساں سب معاشی آزادی سے مشروط ہیں۔اپنے مسائل کو جدید شعراء نے اپنی غزل میں کس طرح سمویا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

پیاس کے بیدار ہونے کا کوئی رستہ نہ تھا
اس طرف بادل نہیں تھے اس طرف دریا نہ تھا — اقبال اشہر

چھپے ہوئے ہیں مسائل کی بھیڑ میں سب لوگ
ملے ہیں چہروں پہ لکھے ہوئے سوال مجھے — سرور نگینوی

اک اک کر کے سب پنچھی دم توڑ گئے
بھری بہار میں بھی گلشن ویرانہ تھا — پروین فنا

یہ کہاں کی ریت ہے جاگے کوئی سوئے کوئی
رات سب کو ہے تو سب کو نیند آنی چاہیئے

زلف ورخ کے سائے میں زندگی گزاری ہے
دھوپ بھی ہماری ہے چھاؤں بھی ہماری ہے — منظر بھوپالی

ذلیل کر مجھے لیکن بہت ذلیل نہ کر
یہ زہر میں بھی تو جا کر کہیں نکالتا ہوں — شکیل اعظمی

سوچوں تو بازار بھی چھوٹا لگتا ہے
گھر کے اندر اتنی ضرورت رکھی ہے — پرویز اختر

انسان سماجی نا انصافی سے اس قدر ٹوٹ چکا ہے اسے ذاتی غم ایک مجموعی صورت حال کا استعارہ بن گیا۔تشنگی اور احساس محرومی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔مثلاً

بچھڑ جاؤں تو میرا غم نہ کرنا
ہوا ہر رخ سے بہنا جانتی ہے — شکیل جمالی

پتھر سلگ رہے تھے کوئی نقش پا نہ تھا
ہم جس طرف چلے تھے ادھر راستہ نہ تھا — ممتاز اشہر

غریب بچوں کی ضد بھی نہ کر سکا پوری
تمام عمر کھلونوں کا بھاؤ کرتا رہا حسیب سوز

فاصلہ چاند بنا دیتا ہے ہر پتھر کو
دور کی روشنی نزدیک آنے سے رہی ندافاضلی

محرومیوں کا ذکر مسلسل نہ کیجئے
دل کو اداس نہ کیجئے انتظارنعیم

غم روزگار ہمیشہ سے اردو شاعری کا اہم موضوع رہا ہے البتہ اس کی نوعیت بدلتی جارہی ہے۔غم روزگار میں نئے مسائل پیدا ہورہے ہیں حالت یہ ہیکہ شوہر غیر ملک میں ملازمت کرنے پر مجبور ہے سال دو سال میں دو مہینے کی رخصت پر آتا ہے بیوی بچے گھر والوں کے رحم وکرم پر جیتے ہیں یا الگ رہتے ہیں۔اس صورت حال نے مختلف ذہنی اور جنسی مسائل پیدا کیے ہیں۔

بے روزگاری روز بہ روز ایک خوفناک صورت اختیار کرتی جارہی ہے آج جہاں بھی نظر ڈالی جائے ہر تیسرا پڑھا لکھا شخص روزگار کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اس دوران اس کا واسطہ بہت ساری غیر قانونی اور غیر اخلاقی چیزوں سے پڑتا جارہا ہے عورتیں اور مرد سب اسی دوڑ میں دوڑتے چلے جا رہے ہیں اس دوڑ میں اگر کوئی کچلا بھی جائے تو اس کو اٹھانے کی کسی کے پاس فرصت نہیں۔اصلاح احوال کے لیے حکومتی سطح پر کوئی خاص اقدامات نظر نہیں آرہے ہیں۔روزگار نہ ملنے پر سب سے زیادہ نقصان نوجوانوں کا ہوتا ہے۔جنہوں نے اعلیٰ یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی۔میرٹ، ڈسٹنگشن پر آنے کے باوجود ملازمت حاصل نہ کر پائے تو بعض مایوس ہو کر خودکشی تک کر لیتے ہیں غربت سے تنگ آ کر اپنے بچوں کو مار دیتے ہیں اور خطرناک جرم کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔بے روزگاری کو جدید شعراء اپنے انداز میں یوں بیاں کرتے ہیں۔

پتھر نے سلامت کوئی شیشہ نہیں رکھا
دو وقت کی روٹی نے کہیں کا نہیں رکھا احسن یوسف زئی

سحرا میں کھینچ لایا ہے غم روز گار کا
ہر شخص کو تلاش ہے منزل کی دھوپ کی مہتاب قدیر

احساس ضرورت کا دلاتی ہے مگر
محنت مجھے بھوکا نہیں رہنے دیتی — حافظ کرناٹکی

تمام فصلیں اجڑ چکی ہیں نہ ہل بچا ہے نہ بیل باقی
کسان گروی رکھا ہوا ہے لگان پانی میں بہہ رہا ہے — شکیل اعظمی

مجھے تو سانس بھی آہستگی سے لینا ہے
میں اپنے گھر کا اکیلا کمانے والا ہوں — شکیل جمالی

زمانہ تو ترقی کر رہا ہے
مگر ہم بھوک سے کیوں مر رہے ہیں — عادل اسیر دہلوی

کالج کے سب بچے چپ ہیں کاغذ کی ایک ناؤ لیئے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی بے کاری ہے — راحت اندوری

تلاش رزق کا یہ مرحلہ بھی عجب ہیکہ ہم
گھروں سے دور بھی گھر کے لیے بسے ہوئے ہیں — عارف امام

زیادہ تر شعراء ''تلاش ذات'' ایسا پیچیدہ سفر ہے جو دوریوں کی گرد ابہام کے دھندلکوں میں لپٹا ہوا ہے جس کی کوئی آخری منزل نہیں ہے شعراء الم، مایوسی، پریشانی، کرب ذات، غم کائنات اور احساس زیاں کا اظہار فراوانی سے کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس آواز میں ظلم، ناانصافی، ریاکاری اور بے حسی کے خلاف احتجاج کی دبی دبی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔خودغرضی، مفاد پرستی اور مکاری نے انسان کو محفلوں میں تنہا کر دیا ہے ہر ایک اپنے آپ سے اپنے وجود سے معنوں جنگ کر رہا ہے وجود کے سناٹے کی چند جھلکیاں ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے ہی آپ سے روٹھا ہوں کسی بات پر میں
مجھ کو میری ہی طرح منائے کوئی — شکیل اعظمی

کوئی آواز ابھرے دل کے ویرانے سے اب
چاٹتا جاتا ہے مجھ کو میرے اندر کا سکوت — نعمان شوق

کہیں ملے کوئی اپنا تو پھوٹ کر رو لوں
کئی دنوں سے بہت مسکرا رہا ہوں — ندا فاضلی

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں — سلیم احمد

اتنا تو علم تھا کہ کوئی تشنہ لب رہا
ہم ساگروں کی پیاس پر کیا تبصرہ کریں — مہتاب حیدر

یہ میرے اندر کا آدمی بھی بدلتا رہتا ہے رنگ کتنے
کبھی سمٹنے کا خواب دیکھے کبھی بکھرنے کا مشورہ دے — اقبال اشہر

اندھیرے ، زخم ، مائل ، دھوں ، ہوا ، آنسو
گنواتے ہم بھی کہاں تک وراثتیں تھیں بہت — محمد معین اختر

اب تو دل کے گوشوں سے یوں دھواں سا اٹھتا ہے
جیسے بند کمرے میں خط کسی کے جلتے ہیں — حق کانپوری

بے روزگاری ، غریبی عدم مساوات کے جلتے اپنے وجود کو منوانے کی فراغ میں جدید دور کا انسان دھوکہ ، مکاری ، عیاری ، فیرب کھا کھا کے خود بھی نفرت اور بدلے کی آگ میں جلتا جا رہا ہے ۔ جرم کی جانب اس کے قدم نئے مسائل کو جنم دے رہے ہیں مثلاً

تیرا میرا شیشے کا گھر میں بھی سوچوں تو بھی سوچے
پھر کیوں ہاتھ میں پتھر میں بھی سوچوں تو بھی سوچے — ندا فاضلی

اگر چہ نفرتوں کی آگ نے سب کچھ جلا ڈالا
مگر امید کی ٹھنڈی ہوائیں روز آتی ہیں — منور رانا

شہر میں جرم و حوادث اس قدر ہیں آج کل
اب تو گھر میں بیٹھ کر بھی لوگ گھبرانے لگے — چندر بھان خیال

کسی سے رکھتے کہاں دشمنی کا رشتہ ہم
لہو کو سرد بھی ہونا تھا ایک ابال کے بعد — شکیل اعظمی

کئی پتے بچھڑنا چاہتے ہیں اپنی شاخوں سے
غنیمت ہے کہ ہوا کی سر بھرا ہونا نہیں آتا   اقبال اشہر

جدید سماجی وسیاسی مسائل کے بڑھ جانے سے ناامیدی وناکامی انسان کے جسم کا زیور بن گئی ہے امید کی کرن پھوٹنے کا انتظار کر رہے شعراء کیا بیان کر رہے ہیں۔

دنیا حاصل کرنے والوں سے پوچھو
اس چکر میں کیا کیا کھونا ہوتا ہے   عالم خورشید

مرے عزیز مرے ٹوٹنے طنز نہ کر
ہر ایک اصول غریبی میں ٹوٹ جاتا ہے   حسیب سوز

جس کا عنوان ہے درد محرومی
اس فسانے کا اقتباس ہوں میں   زاہد

کیا خواب تھا کہ پاؤں زمیں پر نہ رہ سکے
کیا خوف تھا کہ چھو نا سکے آسماں   اقبال اشہر

زمیں تو سخت تھی دریا بھی اب آنکھیں دکھاتا ہے
وہی ہے حال دل کا ریت پر جیسے کہ ماہی کا   خان ارمان

عصری زندگی میں پیوست ظلم وستم ناانصافی ریاکاری جھوٹ افراتفری کے خلاف ردعمل کا اظہار ہوا ہے ساتھ ہی عصری زندگی کی پریشانیوں، الجھنوں، بے چینی، بے یقینی اور اس قسم کے ماحول میں عام آدمیوں کی بے بسی اور بے نوائی کا اظہار غزل میں بڑی شدت سے ہوا

حال ہے اپنا وہی جو ہے ہماری قوم کا
چاہتے ہیں سر بلندی ہم مشقت کے بغیر   ظفر کمالی

تمہیں اس دشت میں کس نے پکارا ہے
سرابوں سے تعلق تو ہمارا ہے   قبال اشہر

اتار پھیکو بدن سے پھٹی پرانی قمیص
بدن قمیص سے بڑھ کر کٹا پھٹا دیکھوں — محمد علوی

اس شہر بے چراغ میں جاگا ہوا ہے کون
میں نے آنکھ موندلی تو کیا برا کیا — اقبال اشہر

اک پرندہ لپک کے پہنچا تھا
پھر بھی پیاسا رہا گھٹا کے قریب — شفیع اللہ راز اٹاوی

ایک قیدی کی طرح میری انا بے بس رہی
خواہشیں گھیرے رہی مکڑی کے جالے کی طرح — منور رانا

کہیں یہ بے بسی اور بے نوائی ذہنی کیفیت اور داخلی کرب کے مترادف ہے حالیہ غزل میں ایسے اشعار جن کا مرکز ذاتی غم ہے اور جن میں کہیں کہیں کرب ذات کے وسیلے سے وسیع تر معنوں کے ادراک کی کاوش بھی دیکھی جاسکتی ہے انتشار ذات کی کرب ناکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

کھینچ لی اس نے اچانک میرے پیروں زمیں
دیکھنا یہ ہیکہ سر پہ آسماں کب تک رہے — عزم شاکری

بدنصیبی نے لیے ہیں ایسے ایسے امتحاں
دور کی روشنی نزدیک تو آنے سے رہی — ندا فاضلی

غم گسار چہروں پر اعتبار مت کرنا
شہر میں سیاست کے دوست بھی شکاری ہے — منظر بھوپالی

دشت کی دھوپ بھر گیا مجھ میں
میرا سایہ بکھر گیا مجھ میں — سلیم محی الدین

تمہاری جیت کا مطلب ہے جنگ پھر ہوگی
ہماری ہار کا مطلب ہے انتشار گیا — حسیب سوز

دورحاضر میں مکروفریب، ریاکاری، مصلحت پسندی، خودغرضی نے سچائی، خلوص، بے غرضی اور دیانت داری کا گلا گھونٹ دیا ہے غیبت اور خوشامد کرنے والوں کی کثرت ہے۔ایک زمانہ تھا کہ لوگ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنے کے بجائے سامنے اسکی کمیوں کو بیان کرتے تھے تاکہ اس کی اصلاح ہوسکے۔آج انسان کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زباں پر کچھ لوگ سامنے تعریف اور خوشامد کرتے ہیں اور غیر موجودگی میں برائیاں منافقت اور ریاکاری کی اس روش نے انسان پر سے انسان کا اعتماد ختم کردیا ہے۔مطلب پستی اور خودغرضی کی وجہ سے خاندانوں کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔جذبہ ریاکاری کا بیان شعراء نے اپنی غزلوں میں خوب کیا ہے۔

ایک سے مل کے سب سے مل لیجیئے
آج ہر شخص ہے نقابوں میں — ندافاضلی

تعلقات کا کچھ تو بھرم رکھا ہوتا
زراسی دور چلے اور حساب لکھنے لگے — حسیب سوز

ہمارے واسطے اس بھیڑ میں سب ایک سے ہیں
کوئی کھلا ہوا دشمن کوئی چھپا سا لگے — انتظارنعیم

میں جانتا ہوں خوشامد پسند کتنا ہے
یہ آسماں زمیں سے بلند کتنا ہے — شکیل اعظمی

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیئے — ندافاضلی

ہرآنے جانے والے سے گھر کا رستہ پوچھتے ہو
خودکو دھوکہ دیتے دیتے بے گھر بھی ہوجاؤ گے — رؤف رضا

کسی کے ظاہر و باطن میں امتیاز بھی کر
ہر ایک شخص کو ہمدرد و مہرباں نہ سمجھ — کلدیپ گوہر

میں اس کے ستم کی سرخیاں اخبار میں دیکھوں
وہ ظالم ہے مگر ہر ظلم سے انکار کرتا ہے — حسن رضوی

بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ ایمانداری شرافت اور صداقت کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور بے ایمانی سازش مکر وفریب جھوٹ ریاکاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔انسان نے اپنی خباثتوں سے ابلیس کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے وہ جھوٹ اس سادگی سے بولتا ہے کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے اور وہی سچ کو جھوٹ ثابت کرنا بڑا آسان ہو گیا ہے۔مثلاً

ہے ان کے جھوٹ سارے سرخیوں میں
ہمارا سچ خبر میں کیوں نہیں ہے — سلیمان عمار

جھوٹ سچائی سے شیریں تھا مگر کیا کرتے
ہم کو آتا ہی نہ تھا حق کو چھپائے رکھنا — مہتاب قدر

بڑھا نہ پایا کوئی اپنی شان جھوٹ بول کر
مگر وہ چھو رہا ہے آسمان جھوٹ بول کر — عزم شاکری

تمہارے جھوٹ میں تہذیب کی مٹھاس تو تھی
وگر نہ سچ تو بہت بد زبان ہوتا ہے — فاروق ارگلی

سچی کہانیاں تو اندھیروں میں کھو گئیں
کیسے چمک رہے ہیں فسانوں کے آسماں — ابوالفیض سحر

اتنا سچ بول کے ہونٹوں کا تبسم نہ بجھے
روشنی ختم نہ کر آگے اندھیرا ہوگا — ندافاضلی

جھوٹ میں شک کی کم گنجائش ہو سکتی ہے
سچ کو جب چاہو جھٹلایا جا سکتا ہے — شکیل جمالی

نئی نسل بزرگوں کا احترام نہیں کرتی مطلب پرستی اور خودغرضی نے خاندانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ والدین کی عظمت و رفعت کو بالائے طاق رکھ کر انسان مطلب پرستی اور خودغرضی کو ہی اپنی کامیابی کا زینہ سمجھ رہا ہے۔بوڑھے ماں باپ اولاد کی ہر خواہش کو پورا کرنے میں اپنی دولت،عزت شہرت اور طاقت ختم کر دیتے ہیں اور ان کے حصہ رہ جاتی ہیں سسکتی ہوئی تنہائی اور اکیلا پن آنسوں اور عجیب سا سناٹا۔

ہوکر جواں شہروں میں تقسیم ہوگئے
بوڑھا اکیلا رہ گیا بچوں کو پال کے — حسیب سوز

بزرگوں سے کہو اب رحم کردے
ہماری نسل پر قرضہ بہت ہے — ملک زادہ جاوید

بوڑھے ہوئے یہ سوچ کے تم گھر میں نہ بیٹھو
ماں باپ کو اب بیٹا کمائی نہیں دیتا — انیس دہلوی

وہ گم ہوتا ہے اپنی ذات کی پنہائیوں میں
جو رشتہ فکر کا اپنے بڑوں سے ٹوٹتا ہے — شہباز ندیم ضیائی

وہ جسکو بزرگوں کی روایت نہ رہے یاد
اس شخص کو لوگوں کی پہچان نہیں ہے — ماجد دیوبندی

کبھی کبھی ماضی کی کسک انسان کو جھنجوڑتی ہے اور یہ کسک شاعری کا ایک حصہ ہے جدید شعراء بھی ماضی کے دریچے میں اس طرح سے گزرتے ہیں۔ مثلاً

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ نہ جا
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں — راحت اندوری

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی — مظفر رزمی

یاد جب بھی جھلکتی ہے فکر کے دریچوں سے
کھولتی ہے ذہنوں میں خوشبوؤں کے دروازے — مہتاب حیدر

تنہائی کا احساس رنج والم کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ تنہائی کے ساتھ ساتھ کرب ذات ،تلاش ذات ،انکشاف ذات بھی عصری غزل کے مخصوص اور محبوب موضوعات ہیں ۔اور یہ جدید مسائل شعراء اپنے غزلوں میں کس عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔

تنہائی کا ایک اور مزہ لوٹ رہا ہوں
مہماں میرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں — شجاع خاور

لپٹ لپٹ کے بہت روئی ہم سے تنہائی
جو رات لوٹ کے مدت پہ گھر گئے ہم لوگ — انتظار نعیم

بھیڑ سے کٹ کر نہ بیٹھا کرو تنہائی میں
بے خیالی میں کئی شہر اجڑ جاتے ہیں — ندافاضلی

ہر وقت کا سپنا تجھے برباد نہ کردے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر — محسن نقوی

تنہائی کا زہر تو وہ بھی پیتے ہیں
جن لوگوں کے ساتھ زمانہ ہوتا ہے — عالم خورشید

ایک محفل میں کئی محفلیں ہوتی ہیں شریک
جن کو بھی پاس دیکھو گے اکیلا ہوگا — ندافاضلی

جدید غزل گو شعراء نے ڈر وخوف کو بڑی معروضیت، حساسیت، دردمندی اور کہیں کہیں بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ اکثر نمونوں میں خلوص اور دردمندی کے ساتھ گداز کے ذاتی المیے کی تڑپ کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

زمیں کو تونے ڈرایا ہے سدا مصائب سے
کبھی تجھے بھی ہراساں اے آسماں دیکھوں — پرکاش فکری

سورج چڑھا تو دل کو عجیب وہم سا ہوا
دشمن جو شب کو مارا تھا وہ اٹھ کھڑا ہوا — پریم کمار نظر

ساری آوازوں کو سناٹے نگل جائیں گے
کب سے رہ رہ کے یہی خوف ستاتا ہے مجھے — شہریار

ٹوٹتے لمحوں کو مٹھی میں جکڑنے والوں
کیا ملے گا تمہیں پرچھائی سے لڑنے والوں — سلطان اختر

نہ جانے وقت کی رفتار کیا دکھاتی ہے
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے — کیفی

عجیب خوف میں ہر شخص مبتلا سا لگے
کہ دل بھی سینے میں دھڑکے تو حادثہ سا لگے ‏ انتظار نعیم

جس بستی میں شام اترنے والی ہو
اس بستی کے نام سے ڈرنے والا میں ‏ سلیم محی الدین

عصری شعراء نے خوابوں کے بکھرنے کو جس فنی چابکدستی سے گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے اور اس میں معنوں کی کئی پہلو تلاش کئے ہیں کبھی یہ خواب شکست کی اذیت سے دوچار ہے تو کبھی دکھوں کا مداوا، کبھی حوصلہ اور کبھی مایوسی بن کر ابھرتے ہیں اور کبھی زندگی کے بہترین خواب ٹوٹ کر بکھرتے ہیں تو انسان اس غم سے ابھرنے کی سکت نہیں پاتا ہے۔

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
میرے نقشہ کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے ‏ شہریار

ذہنوں میں جمی برف پگھل جائے تو پوچھوں
آنکھوں میں کوئی خواب نیا ہے کہ نہیں ہے ‏ احسن یوسف زئی

خواب کسی کے جب گویا ہو جاتے ہیں
سناٹے بھی سنجیدہ ہو جاتے ہیں ‏ عزم شاکری

سب امیدوں کے پیچھے مایوسی ہے
توڑو یہ بادام بھی کڑوے نکلیں گے ‏ شکیل جمالی

گئے موسم میں میں نے کیوں نہ کاٹی فصل خوابوں کی
میں اب جاگی ہوں جب پھل کھو چکے ہیں ذائقہ اپنا ‏ بانو وفا

دو چار امیدوں کے دیئے اب بھی ہیں روشن
ماضی کی حویلی ابھی ویران نہیں ہے ‏ ماجد دیوبندی

سائنس نے ہماری زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کی ہیں ایک تیزی اور دوسری آسائش ہماری زندگی کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے جو کام سالوں میں ہوا کرتے تھے اب گھنٹوں اور لمحوں میں

ہو جاتے ہیں۔

سائنس کی اس تصویر کا سیاہ رخ بھی ہے۔ جہاں وہ آزمائش کا منبع بنی ہوئی ہے وہیں ہلاکت آفرینیاں بھی ہیں جن کے بارے میں صرف سوچ کر دل کانپ اٹھتا ہے روح لرز جاتی ہے۔ زہریلے ہتھیار، آتشی بم، بارودی سرنگیں جھلسا دینے والی گیس، جنگی طیارے، میزائل وغیرہ سائنس کی وہ ایجادات ہیں جنہیں دیکھ کر آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور روحانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان تمام تر کرشمات کے باوجود انسان کے ذہن کو سکون میسر نہ ہو سکا۔ اور وہ اپنے عظیم خالق سے بے گانہ ہو گئے۔

رینگتی کاریں ، ابلتی بھیڑ ، بے بس راستے
کل مجھے گھر تک پہنچنے میں زمانے لگ گئے — شکیل جمالی

مشینوں سے بنا لیتے ہیں ہم کیا کیا سپر انسان
مگر ہم آدمی کو آدمی ہونے نہیں دیتے — سرفراز شاہد

آپ تو پچھلے کئی برسوں سے منرل واٹر پیتے ہیں
آپ کا دل بھی گندا ہوگا ایسا ہم نے کب سوچا تھا — حسیب سوز

زرداروں کی صحبت سے نقصان ہوا
لیکن بچے کار چلانا سیکھ گئے — شکیل جمالی

اب تو ہوں میں مشین کا پرزہ
ہے کہاں مجھ کو اپنی ذات کا غم — طارق رشید درویش

بم پھٹنے لگے کہ سمندر اچھل پڑے
کب زندگی پہ بونڈر اچھل پڑے — مینک اوستھی

پوشیدہ بم بھی ہوتے ہیں کچرے کے ڈھیر میں
ہوشیار ہو کے روڈ سے کچرا اٹھائیے — دلاور فگار

فیوز اڑ گئے ہمارے محلے والوں کے
وہ آ گیا تو کوئی بلب جگمگا نہ سکا — عتیق اللہ

انسانی دماغ کی یہ خوبی ہیکہ یہ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات اور ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔سوشل نیٹ ورکنگ اور کمپیوٹر گیمس وقت کا زیاں ہےاور یہ انسانی دماغ کی کارکردگی کو متاثر کرسکتا ہے۔ بچے بڑے ہوکر کبھی بھی نہ تو صحت مند نہ سرگرمی میں حصہ لینے کے قابل ہونگے اور نہ ہی ملک کی ترقی کی راہ میں ان کا کوئی کردار ہوگا۔

دورحاضر کے بچے اور بڑے بھی اپنا زیادہ سے زیادہ وقت سوشل میڈیا پر صرف کرتے نظر آ رہے ہیں۔الیکٹرانک میڈیا بچوں کے معصوم ذہنوں پر بہت ہی مضراثرات مرتب کرر ہا ہے۔وہ اپنی وراثت سے دور ہوتے جار ہے ہیں۔تنہائی پسندی ان کا اہم مشغلہ بن گیا ہے۔ایک دوسرے سے میل جول،محبت،ہمدردی اور خلوص سے دور یہ بچے اپنے ضمیر کی آواز نہیں سن پا رہے ہیں۔اور یہ اس دور کا سب سے گمبھیر مسئلہ بن چکا ہے۔

ہیں فون پر کس کے ساتھ باتیں
اور ذہن کہاں بھٹک رہا ہے — پروین شاکر

اس نے ٹیلی فون کیا ہے اور کسی کے ساتھ
اس کا میرا سمجھوتا ہے کون بڑھائے بات کو — ساقی فاروقی

کرو آف سیل فون کھو جاؤگے
یہ سچ ہے مگر خود سے مل پاؤگے — سلیم محی الدین

فون تو دور وہاں خط بھی نہ پہونچیں گے
اب کے یہ لوگ تمہیں ایسی جگہ بھیجیں گے — ضیاءمزکور

شکوے دور کیے جا سکتے ہیں یاروں سے
اس سنڈے کو فون گھمایا جا سکتا ہے — سوربھ شیکھر

فون پر بات ہوگی فرصت سے
اور ایک اجنبی کو سمجھوں گی — ظہارہ قرار

میں روز فون پر اس کو صدائیں دیتا ہوں
خدا کے ساتھ میرا رابطہ نہیں ہوتا — پروین کمار اشک

گھنٹیاں شور مچاتی ہیں میرے کانوں میں
فون مردہ ہے مگر بستر بے دار کے پاس　　منظور آفاق

خط لکھو یا فون کے ذریعہ پتہ لیتے رہو
ورنہ میں تھوڑے دنوں میں لا پتہ ہو جاؤں گا　　سبودھ لال سکھی

جنگلات کا خاتمہ ماحولیات کا عدم تحفظ جدید غزل کی ایک نا فراموش حقیقت بھی ہے اور معنی خیز علامت بھی اکثر شعراء نے جنگلات کے کٹنے اور اس عظیم ورثے کی بربادی پر اظہار تاسف کیا ہے اور گو کہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ماحولیاتی سائنس سے ہے لیکن اس قسم کے اشعار کا سوز و گداز ان کی شعریت کا ضامن بھی بن گیا ہے اگر ایک طرف جنگل فطرت حسن فیاضی کا استعارہ ہیں تو دوسری طرف جنگلوں کا کٹنا تہذیب حاضر کی مادیت پرستی اور بے حسی کا مظہر ہے اور اس بات کو جدید غزل کے سماجی مسائل میں شعراء نے کس چابکدستی سے بیان کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

فلک سے اترے گا ہم پر تمازتوں کا عذاب
اگر زمیں پہ کہیں سایۂ شجر نہ رہا　　ہیرانند سوز

ہرے بھرے جنگل اب کٹ کر شہر ہوئے
بنجارے کی آنکھوں میں سناٹے ہیں　　انبر بہدا پچی

جب کٹے جنگل تو طائر بھی سبھی
دوسرے جنگل کو ہجرت کر گئے　　ساحل احمد

شور کرتے ہیں پرندے پیڑ کٹتا دیکھ کر
شہر کے دست ہوس میں کون آری دے گیا　　افتخار نسیم

پس پردہ وہ کیسا حاد ثہ تھا
پرندہ شاخ پر سہما ہوا تھا　　عقیل گیاوی

نا جانے کون سی آفت یہاں سے گزرے گی
پرندے چھوڑ کے جاتے ہیں گھونسلہ اپنا　　ملک زادہ جاوید

سوچ رہا ہے جنگل میں یہ دور سیاسی ہے
کھینچ نہ لے ان شاخوں پر دیوار پرندے بھی　　شیوشرن بندھو ہنگامی

☆جدید غزل کے سیاسی مسائل

آزادی کے قریب ۷۰ سال بعد بھی جمہوریت کے باوجود کبھی ہندی پنجابی کا جھگڑا کبھی جنوبی ہندوالوں کا اپنی قومی ہندی کے خلاف دہشت آمیز احتجاج جس میں بسوں، ریل گاڑیوں اور ملک کی سرکاری عمارتوں کا نقصان ،کبھی ہندو مسلم فساد کے نام پر شدید جانی و مالی نقصانات ،الیکشن یا الیکشن کی تیاریوں میں مختلف علاقوں میں چھوٹے بڑے پیمانے پر فسادات ہوتے رہتے ہیں ۔ان فسادات میں نقصان تو سبھی کا ہوتا ہے لیکن اقلیتی فرقہ کو جان و مال کے ساتھ جس روحانی صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا تصور محال ہے ۔غیر محفوظیت اور شدید خوف و ہراس کے ساتھ زندگی کے مثبت عقائد سے ایمان اٹھنے اور تمام ملکی اور وطنی رشتے ناطوں کی ہار جیت کا جو وقتی تجربہ ہوتا ہے اس کا بیان فرقہ وارانہ فسادات کی روشنی میں جدید شعراء کس طرح کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

ساری بستی ہماری جلا دی گئی
بے گناہی کی کیسی سزا دی گئی　　راشد صدیقی

بدل رہے ہیں کئی آدمی درندوں میں
مرض پرانا ہے اس کا نیا علاج بھی ہو　　ندا فاضلی

بدل رہے ہیں کئی آدمی درندوں میں
مرض پرانا ہے اس کا نیا علاج بھی ہو　　ندا فاضلی

زمانہ ہو گیا دنگے میں اس گھر کو جلے لیکن
کسی بچے کے رونے کی صدائیں روز آتی ہیں　　منور رانا

کبھی کبھی کے فسادات بھی ضروری ہیں
کہ جانور تو ہر ایک آدمی میں رہتا ہے　　قاسم امام

دھرم کے نام پہ اب بھی فساد ہوتے ہیں
نہ جانے ذہنوں سے کب یہ فتور نکلے گا　　　اسد رضا

نہ میرے سر پہ داڑھی نہ سر پہ چوٹی تھی
مگر فساد نے پتھر مجھے بھی مارا تھا　　　شکیل اعظمی

آتی نہیں ہے نیند مجھے لیٹنے کے بعد
دہشت کے زیرِ سایہ میں دن رات کیا کروں　　　رشید عبدالسمیع جلیل

فرقہ وارانہ فسادات کا بھیانک اور عبرت ناک منظر دیکھ کر انسان کو جس تاراجی خوں ریزی اور غیر محفوظیت کا تجربہ ہوا اس کے نتیجے میں شدید اضطراب تشکیک عدم اعتماد کا رویہ ابھرا۔ سیاست کی کم مائیگی، بے بصری اور خود غرضی کا تجربہ ہوا اور حساس ذہن نا امید، بے یقینی کے عالم میں اجتماعی تحریکوں اور نظریات کو چھوڑ کر اپنے میں اس طرح سمٹا کہ اس کی شخصیت میں روح عصر مجسم ہوگئی۔ قتل و غارت گری کے اس خوفناک سیاسی منظر کا حال ان اشعار میں دیکھئے۔

یہ بستی فقط پیاسوں کی بستی
یہاں پر ہیں فقط سیراب خنجر　　　جمشید کمال

خشک شاخیں کبھی ایسے تو نہیں چیخنیں
کون آیا ہے پرندوں کو ڈرانے والا　　　وزیر آغا

شہر یانوں میں بہتا نہیں گلیوں میں رواں ہے
یہ سرخ لہو کس کا ہے اے خاک وطن بول　　　میر ہاشم

لمحہ بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحہ بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں　　　کیفی اعظمی

قتل و غارت چوریاں آتش زنی ہے جام ہے
تم کہیں جاؤ وہاں ماحول ہے بگڑا ہوا　　　پرویز

یہاں پر لڑنے والا اپنی اپنی جنگ لڑتا ہے
گئے دن اے وطن جب نام تھا تیرے سپاہی کا　　　خان ارمان

دیکھوگے تو ہر موڑ پر مل جائیگی لاشیں
ڈھونڈوگے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا — ملک زادہ منظور احمد

قتل کے کچھ کیس ہو جائیں گے لے دے کر بری
بے خطا مفلس سزا پا جائے گا دس سال کی — عزیز نجیب

سیاست نے بدل ڈالے سبھی مفہوم لفظوں کے
شرافت اب دغا بازی سے بہتر کیوں نہیں ہوتی — فاروق ارگلی

قتل و غارت گری فرقہ وارانہ فسادات ظلم و جبر کے تاریخ نے وہ دل خراش مناظر و بے بسی کے لمحات دردوغم کے قصے دکھائے ہیں کہ جب سوچتے ہیں تو دل سے درد کی ٹیس آٹھنے لگتی ہے۔ بیان کرنے لگو تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔قلم اٹھائے تو ہاتھ لرز جاتے ہیں سمجھ نہیں آتا جبر وتشدد کی داستان کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔اپنوں کی جفاؤں کا گلہ کیا جائے یا غیروں کے جور وستم کو حدف تنقید بنایا جائے ایسے کئی سوالات ہیں جنہوں نے ہمیں کشمکش میں مبتلہ کر رکھا ہے۔اور یہی مسائل جدید شعراء غزل میں بیان کرتے ہیں۔مثلاً

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادوں
یہ حشر انگیزیاں نا کہ یہ ظلم آرایاں کب تک — شبلی

لے کے پیغام محبت کوئی اٹھے تو سہی
آج بھی ظلم کا ماحول بدل سکتا ہے — عزیز بگھروی

ضروت دن نکلتے ہی نکل پڑتی ہے ڈیوٹی پر
بدن پر شام یہ کہنا ہے اب ہڑتال ہوجائے — حسیب سوز

یہاں انصاف نے آنکھوں پہ پٹی باندھ رکھی ہے
شرافت جیل میں سڑتی ہے غنڈا چھوٹ جاتا ہے — شکیل جمالی

مار دینگے وہ ہمیں انکاؤنٹر میں بے خطا
ان پولس والوں کو ایسا بھی کہاں سمجھا تھا میں — اسرار جامعی

کیا قیامت ہے کہ عیاری ہی فنکاری ہوئی
فتنہ پرور قاتلوں کے نام سرداری ہوئی　　انتظار نعیم

جو سچی فائلیں ہیں ان کا جاگنا فضول ہے
اب افسران دفتروں کی کرسیوں پر سو گئے　　عزم شاکری

جو پیاسے ہو تو اپنے ساتھ رکھو اپنے بادل
یہ دنیا ہے وراثت میں کنواں کوئی نہیں دے گا　　ظفر گورکھپوری

کرپشن یا بدعنوان صرف رشوت اور غبن کا نام نہیں اپنے عہد اور اعتماد کو توڑنا یا مالی اور مادی معاملات کے ضابطوں کی خلاف ورزی بھی بدعنوانی کی شکلیں ہیں ۔ذاتی یا دنیاوی مطلب نکالنے کے لئے کسی مقدس نام کو استعمال کرنا بھی بدعنوانی ہے ۔کرپشن ایسا مرض ہے جو دیمک کی طرح ہمارے معاشرہ کو کھا جاتا ہے اور آج کے دور میں اس کے بغیر کوئی بھی معمولی سا کام نہیں ہو پاتا ہے تو بڑے کام کا اللہ حافظ ہے ۔اس بہترین موضوع کو شعراء کس طرح چھوڑ سکتے ہیں ۔کرپشن کی چند مثالیں۔

ہر طرف رشوت سفارش اور کینہ پروری
کیا یہ آزادی ہے جس کا کل بہت چرچا ہوا　　پرویز

اب سفارش اور رشوت سے الرجک ہم نہیں
اب تو سمجھوتا سا ہم نے کرلیا ہے ان کے ساتھ　　فراز شاہد

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے
میں اس کا لگان دے رہا ہوں　　سلیم احمد

کوئی سر پھوڑنا چاہے تو نہ ایک سنگ ملے
اب تو اس شہر میں شیشہ کا مکاں ہے سب کا　　بانی

وہ دولت مند ہو کر اور بھی پاگل ہو گیا
اسے یہ وہم ہے کہ دنیا بھکاری ہو گئی　　حسیب سوز

اس نے یہ سوچ کر ہمیں الوداع کہہ دیا محسن
یہ غریب لوگ ہیں محبت کے سوا کیا دیں گے — محسن نقوی

تمام فصلیں اجڑ گئی ہیں نہ ہل بچا ہے نہ بیل باقی
کسان گروی رکھا ہوا ہے لگان پانی میں بہہ رہا ہے — شکیل اعظمی

وقت کی دیوار پہ یہ لکھ رہا تھا اک فقیر
لوگ سستے ہو گئے ہر چیز مہنگی ہو گئی — عزم شاکری

فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی عدم مساوات، مذہبی تضادات، لاقانونیت قتل و غارت گری، ظلم جبر و استحصال، بغاوت، ردشوت خوری اور بے ایمانی، مہنگائی، امیری و غریبی کے مسائل اسطرح کے بہت سارے سیاسی مسائل غزل میں پیوست نظر آتے ہیں۔

غرض یہ کہ غزل میں نہ صرف سماجی اور سیاسی بلکہ تہذیبی مذہبی، ثقافتی، معاشی اور دیگر سبھی مضامین کو اپنے اندر سمونے کی طاقت موجود ہے۔ مزید براں یہ بھی کہ غزل میں ترقی کے امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ زمانے قدیم سے لے کر آج تک غزل ہر ماحول میں اپنے لیے سازگار ماحول پیدا کرتی چلی آئی ہے۔ ہر بغاوت کے بعد بھی وہ اپنے وجود کے بقاء کے لیے ڈٹی رہی اور ترقی کرتی گئی ۔اس لیے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف سخن پوری چکا چوند کے ساتھ رہتی دنیا تک قائم و دائم رہنے کی سکت اپنے اندر رکھتی ہے۔

باب چہارم

جدید اُردو غزل کے
نمائندہ شاعروں کا سماجی اور سیاسی مطالعہ

☆جدید اُردو غزل کے شاعروں کا سماجی اور سیاسی مطالعہ

غزل، اردو شاعری کی تمام اصناف میں اس اعتبار سے ایک مختلف اور ممتاز صنفِ سخن ہے کہ غزل کی قدر و قیمت کا تعین صرف اس کے موضوع اور مواد کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ غزل کے علاوہ شاعری کی دوسری اصناف میں موضوع کی مرکزیت اور خیال کے تسلسل کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ ہیئت اور تکنیک کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ غزل کی صنف کا بنیادی انحصار چوں کہ ایک مخصوص اور متعین ہیئت پر ہوتا ہے اس لیے غزل کے شعروں کے موضوعات بھی ہیئت کے تابع ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں کسی خاص فکری رُجحان کی نشاندہی کے معاملے میں غزل کے ساتھ برتاؤ نہیں کیا جا سکتا جو شاعری کی دوسری اصناف، بالخصوص نظم کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔

زبان و بیان کے متنوع طریق کار کے ساتھ ساتھ، غزل کی شاعری میں فکری اور موضوعاتی تنوع کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ تاہم اس تنوع کو ہم کسی مخصوص مقام اور علاقے سے وابستگی کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ غزل، ایران میں بھی کہی گئی اور برصغیر کے دوسرے ادبی مراکز میں بھی۔ مگر فنی اور فکری اعتبار سے غزل کی پوری تاریخ میں ایک ایسا تسلسل ملتا ہے جس سے اس صنف سخن کی تہذیبی اور ثقافتی مرکزیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس پس منظر میں شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ مقامی اور جغرافیائی حوالوں سے غزل کی شاعری کو کوئی جائزہ غزل کے بنیادی مزاج کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس وقت غزل کی شاعری ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دُنیا کے متعدد علاقوں میں کی جا رہی ہے۔ ان علاقوں میں امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک اور مشرق وسطیٰ کے ممالک بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ جغرافیائی اور علاقائی وسعت کے باعث غزل میں کسی اور فکری رجحان کا اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، ہجرت اور غریب الوطنی کے جذباتی حوالے غزل کے اشعار میں کثرت سے آنے لگے ہیں۔ اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جائے تو ہمیں اس سوال کا بھی جواب دینا ہوگا کہ پھر ہندوستان اور پاکستان کی موجودہ غزل میں بھی یہ رجحان کیوں نمایاں ہے؟ اگر اس رجحان کو ایک اور زاویہ نظر سے دیکھیں تو بات زیادہ واضح ہو سکتی ہے کہ آج غریب الوطنی اور ہجرت ہماری اپنی اختیار کردہ ہے۔ اس میں حالات کے جبر کا کوئی دخل نہیں جس کی وجہ سے ہجرت ایک ذہنی اور روحانی تجربے کے طور پر غزل کی روایت کا حصہ رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ غزل میں ہجرت کے موضوع کو مذہبی پس منظر سے عاری دکھلایا گیا ہے اور ہجرت کے پیچھے مادّی ضرورت کی کارفرمائی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غریب الوطن شاعروں کی ہجرت کسی

مخصوص جغرافیائی حوالوں سے بلند ہوکر دیکھنا زیادہ مناسب بھی ہے اور غزل کی صنفی پہچان کے منافی بھی نہیں۔

جدید شاعروں کی وہ نسل جس نے چھٹی اور ساتویں دہائی میں اپنی پہچان متعین کرائی تھی، اس کی غزل گوئی کو بالعموم ہندو پاک کی آزادی اور آزادی سے کہیں زیادہ تقسیم ملک کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ رویے اور وحشت و بربریت کے مظاہرے نے غزل کے شاعر کو ایک ایسا زاویۂ نظر دیا جس کے باعث اقدار کی شکست و ریخت کا احساس عام ہوگیا۔ میر تقی میرؔ کی بازیافت کی کوشش کی گئی اور اپنے عہد کے تسلیم شدہ سماجی اور تہذیبی تصورات پر سوالیہ نشان قائم کیا گیا۔ چوں کہ یہ وہ زمانہ تاریخی اعتبار سے تقسیم ہند کے بعد کا زمانہ تھا اور ادبی اعتبار سے ترقی پسند تحریک کی بالادستی کا، اس لیے اس دور کی غزل میں ایک طرف انسانی رشتوں پر نئے سرے سے غور و غوض کا رجحان نمایاں ہوکر سامنے آیا اور دوسری طرف ترقی پسند شاعری کے برخلاف، براہِ راست بات کہنے کے ردعمل میں استعاراتی اور علامتی اظہار کو اہمیت حاصل ہوئی۔

یہ وہ اندازِ فکر تھا جس کے باعث غزل کے بندھے ٹکے موضوعات میں بھی نئی جہات کا اضافہ ہوا اور ان جہات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جدید شاعروں نے اپنے اسالیب اظہار میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ صورت و معنی کی یہ تبدیلی ایک ایسے رجحان کی شکل اختیار کرنے لگی جسے جدیدیت کے زیر اثر پروان چڑھنے والے رجحان کا نام دیا گیا۔ اب صورت یہ پیدا ہوئی کہ سماجی اور تمدنی ابتری کے نتیجے میں ابھرنے والے شعری تجربے وجودی اندازِ فکر میں ڈھلنے لگے اور پرانے مسلمات اور اقدار سے دست بردار ہونے کے احساس نے بے یقینی، تشکیک، تنہائی اور اداسی کے رویوں کو جنم دیا۔ اب ہم ان رویوں کو اس عہد کے میکانکی طرزِ زندگی کے خلاف ردِ عمل کا نام دیں یا انسانی رشتوں اور اخلاقی قدروں سے محرومی کا، لیکن جدید غزل نے کسی نہ کسی شکل میں ان رویوں کی نمائندگی ضرور کی۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ چھٹی اور ساتویں دہائی میں ابھرنے والے اس وجودی رجحان کا سلسلہ آٹھویں دہائی کے وسط تک قائم رہا۔ اس رجحان کی جھلکیاں مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

نہ جس کا نام ہے کوئی، نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے
شہریارؔ

اس جہاں میں میرے ہونے کی گواہی کون دے
ایک ہجوم اور اس میں چشمِ معتبر کوئی نہیں
خلیل الرحمٰن اعظمی

میں آساں بھی، کٹھن بھی، مگر تم کون میرے
میں آپ اپنا تذبذب بھی خود اپنا فیصلہ میں
بانیؔ

نہ شاخ ہوں نہ شجر جانے کس لیے شب بھر
خزاں کے خواب دکھاتی رہی ہوا مجھ کو
ظفر اقبال

غزل کے ان اشعار میں تنہائی، بے یقینی، ناقدری اور خوف و ہراس کی جس کیفیت سے دو چار ہوتے ہیں اس کیفیت کو شعری زبان کی گرفت میں لینے کے لیے نئی لفظیات کا سہارا بھی لیا گیا ہے اور ان لفظیات کو نئی امیجری کی تخلیق کا وسیلہ بھی بنایا گیا ہے۔ ان شعروں میں ریت، شجر، خزاں، ہجوم اور چشمِ معتبر جیسے الفاظ کو نئے سیاق وسباق میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ، نہ صرف یہ کہ لفظوں کی سطح سے بلند ہو کر استعاروں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ ٹھوس پیکروں کی تخلیق بھی کرتے ہیں۔ جدید غزل میں لفظوں کے اس نئے برتاؤ اور لہجے کی رنگارنگی کے سبب جس نئے ذائقے کا اضافہ ہوا، اس نے روایتی غزل کے مقابلے میں جدید غزل کو لسانی اور اسلوبیاتی سطح پر نئے امکانات کی بشارت دی۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ جدید غزل کے موضوعاتی اور اسلوبیاتی امکانات نے بہت جلد ایک ٹھہری ہوئی روایت کا انداز اختیار کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تشکیک، تلخی، اداسی اور تنہائی جیسے موضوعات کو نئی غزل کی سکہ بند پہچان کی حیثیت حاصل ہوگئی، اور ہر پختہ اور خام کار غزل گو نے ان موضوعات کو کثرت اور تکرار کے ساتھ دہرانا شروع کیا۔ چند مخصوص قسم کے موضوعات اور انداز اظہار کو اتنا فروغ ملا کہ آٹھویں دہائی میں اس یکسانیت سے نجات حاصل کرنا سب سے بڑا ادبی چیلنج بن کر سامنے آیا۔ یکسانیت سے نجات حاصل کرنے کے عمل کو تو شاید ایک شعوری کوشش کا نام دیا جا سکتا تھا مگر اس صورت حال کے ردعمل کو کسی شعوری کوشش سے تعبیر کرنا مشکل تھا جو سماجی اور تہذیبی سطح پر ہندوستان اور پاکستان میں ابھر رہی تھی۔ یعنی یہ کہ امتداد وقت کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں میں تہذیبی

استحکام کا عمل بھی شروع ہوا اور بے یقینی کیبجائے یقین اور عدم تحفظ کے بجائے روحانی تحفظ کا احساس بھی عام ہونے لگا۔ تشکیک سے ایقان اور خوف و ہراس سے روحانی سہارے کی جستجو تک کا یہ سفر آٹھویں دہائی کے اواخر میں غزل کے ایک بالکل نئے انداز و اسلوب کا حصہ بننے لگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زاویۂ نظر اور شعری اسلوب کی یہ تبدیلی صرف نئی نسل کے شاعروں کی غزلوں میں نہیں پیدا ہوئی بلکہ بعض ایسے جدید شاعروں کے کلام میں بھی اس تبدیلی کے آثار پیدا ہوئے جن کی غزلیں چھٹی اور ساتویں دہائی کے وجودی رویے سے پہچانی جاتی تھیں۔ اس تبدیل شدہ رویے کو جدید غزل کے متوازن اسلوب کا بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ اور اس رویے کو سماجی ابتری اور اقداری بحران کے بعد کسی عقیدے، کسی ماورائی قوت یا کسی وجدانی تجربے میں پناہ لینے سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

عادت سی بنالی ہے تم نے تو منیؔر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اُکتائے ہوئے رہنا

منیؔر نیازی

شام کھینچے لیے پھرتے ہیں اس دنیا کے غم
صبح تک فرشِ ندامت پر پڑا رہتا ہوں میں

احمد مشتاقؔ

ہر نئے درد کی پوشاک پہن لی میں نے
جاں مہذب نہ ہوئی میں تھا برہنہ ایسا

ساقیؔ فاروقی

اُتار پھینکو بدن سے پھٹی پرانی قمیص
بدن قمیص سے بڑھ کر کٹا پھٹا دیکھوں

محمد علویؔ

مندرجہ بالا شعروں میں اگر کسی قدر مشترک کی تلاش کی جائے تو اسے اعترافی لہجے کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ وہ اعتراف کی منزل ہے جہاں سے احتساب اور وجدان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک شاعر اپنی حد سے بڑھی ہوئی آگہی اور دانشوری کو انسانی رشتوں کے

درمیان حائل قرار دیتا ہےتو دوسرا اپنی اخلاقی برہنگی کو چھپانے میں اپنے ناکام ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ کسی شاعر کے لیے صبح سے شام تک کی دنیاداری کی قیمت، شام سے صبح تک کی شرمساری سے ادا کرنا سب سے بڑا مسئلہ بن جاتا ہےاور کسی کے یہاں شہر میں جینے کی شرطیں اتنی نا قابلِ قبول ہیں کہ وہ دنیاداری کا حصہ بننے سے انکار کر دیتا ہے---ان شعروں میں نہ تو اقدار اور عقائد سے محرومی کا انداز ہے اور نہ تشکیک کی کیفیت۔ان میں احتساب یا اعتراف کا وہ لہجہ ملتا ہے جس کی مدد سے مادّی سہاروں کے بجائے روحانی رشتوں کی بازیافت آسان ہوجاتی ہے۔ بات اگر صرف ان شعروں تک محدود رہتی تو اسے مفروضہ بھی قرار دیا جا سکتا تھا،مگر جب ہماری نگاہ سے جدید شاعروں کی اسی نسل کے مندرجہ ذیل اشعار گزرتے ہیں تو ہم آسانی سے اسے مفروضہ قرار دے کر آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لیے کہ ان اشعار میں اقدار کی بازیافت کی کوشش بھی نمایاں ہے اور کسی ماورائی قوت کے وجود کا احساس بھی۔

منؔیر اس شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ گردش تیز تر ہے، اور سفر آہستہ آہستہ
منؔیر نیازی

میں کہ خوش ہوتا تھا دریا کی روانی دیکھ کر
کانپ اٹھا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر
شہزؔاد احمد

شاید کوئی چھپا ہوا سایہ نکل پڑے
اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگایئے
عادؔل منصوری

گئے تھے لوگ تو دیوارِ قہقہہ کی طرف
مگر یہ شورِ مسلسل ہے کیسا رونے کا
شہریؔار

گلاب ٹہنی سے ٹوٹا زمین پر نہ گرا
کرشمے تیز ہوا کے سمجھ سے باہر ہیں
شہریؔار

یہ شعر صرف بدلا ہوا طرزِ احساس ہی نہیں بتاتے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہیکہ عقائد و اقدار سے محروم، غزل کے جدید لہجے نے ایک ایسی کروٹ لی ہے جسے روحانی تجسس کے آہنگ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ اشعار ان شاعروں کے ہیں جن کی غزل کا غالب رجحان ان کے وجودی رویّوں سے تشکیل یافتہ رہا ہے۔ ان اشعار میں پرانی قدروں کی بازیافت، تیز ہوا کے کرشمے میں جذباتی قوت کی بالادستی کا اعتراف اور موجودہ انسان میں زمانۂ قدیم کے انسان کی موجودگی کا احساس جدید شاعروں کی نسل کے رویے میں تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ تبدیلی دراصل ذاتی حوالوں سے کائنات کو دیکھنے کی انتہا پسندی ے ردِ عمل میں پیدا ہوئی ہے۔ اب یہی شاعر محولہ بالا اشعار میں کائنات کو روحانی حوالوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان شاعروں کو پہلے خوف، اُداسی اور تشکیک کے عناصر سے پہچانا جاتا تھا۔ اب ہم ان کی بعد کی غزلوں میں یقین اور عقیدے کی لے کو بہت نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے انداز ہوتا ہے کہ گذشتہ دس پندرہ برسوں میں جدیدیت کے زیر اثر پروان چڑھنے والے شاعروں کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی ہے اور ان کے انداز بیان میں بھی استقامت اور استحکام پیدا ہوا ہے۔ ظفر اقبال کے شعر میں پرانے پتوں کا جو استعاراتی پیکر بنتا ہے وہ پرانی اقدار اور ان اقدار سے وابستہ اشخاص کی تصویر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ ان قدروں کے حوالے سے روحانی اور اخلاقی سہارے پر ان کے اعتماد کی مراجعت کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ منیؔر نیازی، ظفر اقبال اور شہر یار ہوں یا شہزاد اور زیب غوری ان سب نے اپنے نسبتاً بعد کے زمانے کی غزلوں میں مادّی اور دنیاوی بیساکھیوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے اور اپنی شاعری کی موضوعاتی اور لسانی سطحوں پر ایک ایسے جدید تر لہجے سے ہم آہنگ ہے جس کی شمولیت سے بعد کی نسل کے شعراء کی غزل میں ایک نئے رجحان کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس رجحان کے بکھرے ہوئے نقوش ابھی ہم ان شاعروں کے یہاں دیکھ چکے ہیں جو بنیادی طور پر جدیدیت کے زیر اثر پروان چڑھنے والے وجودی رویوں کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آٹھویں اور نویں دہائی میں سامنے آنے والے شاعروں کے یہاں اعتبار، یقین، عقیدے اور اقدار کی شکست کا رجحان نہیں ملتا۔ ان کی غزلوں کے اشعار کسی ایسے وجدانی تجربے کا حصہ معلوم ہوتے ہیں جس میں اقدار کے حوالے سے ماضی کی طرف مراجعت اور روحانی رشتوں کی بازیافت کی کوشش نمایاں ہے۔ غزل گوئی کی پوری روایت کے پس منظر میں ماضی کی طرف مراجعت اور روحانی سہارے کی اس ضرورت کو ایک طرف کے صوفیانہ رویے سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ماضی اور روحانیت کی بازیافت کے اس صوفیانہ رویے کی تشکیل میں تاریخ کے وسیلے سے تلمیحات اور مذہبی

واقعات کی مدد سے قدروں کی بازآفرینی نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس لیے زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ روحانی وجدانی تجربے کی مختلف جہات کونظر انداز کئے بغیر معاصر غزل کا مطالعہ کیا جائے۔موجودہ غزل میں روحانی اور وجدانی تجربے کا جو یہ رجحان گذشتہ برسوں میں عام ہو چکا ہے اس میں مذہب سے مخصوص تقدس کے پس منظر میں آج کی ہجرت کی قدر و قیمت متعین کرنے، کربلا کے تلازمات کو آج کی صورتِ حال سے ہم آہنگ کر کے دیکھنے اور انسان کو امکانی ابعاد کے تناظر کا حصہ ہی نہیں، بلکہ زمانی تسلسل کا تعین کرنے والی مخلوق تسلیم کرنے، جیسے رجحانات کو بھی بہت واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ان اشعار پر نظر کرنے سے حقائق معلوم ہونگے۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے
افتخار عارف

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا
افتخار عارف

خیال آتا ہے رہ رہ کے لوٹ جانے کا
سفر سے پہلے ہمیں اپنے گھر جلانے تھے
آشفتہ چنگیزی

اپنے دیہات میں اب گزارہ مشکل
اور ترے شہر کے آتے نہیں آداب مجھے
شریف منوّر

پانی سے الجھتے ہوئے انسان کا یہ شور
اس پار بھی ہوگا مگر اس پار بہت ہے
فرحت احساس

یہاں ماضی اور حال ایک تسلسل کا حصہ بن گئے ہیں۔اور آج کے انسانوں کا رشتہ ماقبل

تاریخ تک کے عہد سے قائم ہوتا نظر آتا ہے۔اس اندازِ فکر کو اس لیے بھی بہت اہمیت حاصل ہے کہ ماضی سے کٹ کر انسان کی حقیقت کو تو کیا اس کی حرکات وسکنات کی نوعیت کو بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ موجودہ غزل میں ماضی اور تاریخ کے حوالے سے آج کے انسان کو سمجھنے کی کوشش عرفان اور وجدان کے تجربے کا انداز لیے ہوئے ہے۔موجودہ غزل میں ماضی کی بازیافت کسی مجرد حقیقت کے طور پر نہیں، بلکہ ماضی کے وسیلے سے اقدار وعقائد کے احیاء کا رویہ ملتا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار میں ماضی کا ذکر بعض جگہ براہِ راست انداز میں بھی ہوا ہے۔لیکن بیش تر اشعار میں ماضی کی مدد سے اخلاقی اقدار کی شرکت کی مذہبی اور روحانی بنیادوں پر مستحکم دکھلایا گیا ہے۔

مجھ میں اب کیا رہ گیا میرے ماضی کے سوا
ویسے ماضی کے سوا، میں کچھ کبھی تھا بھی نہیں
محبّ فاروقی

وہ نمازیں کہ ادا ہو نہ سکیں
اب بھی صحرا میں وضو بولتا ہے
نسیم صدیقی

اے زمیں مجھ کو یہ ازبر ہے کہ میرے اجداد
چھوڑ کر تیرے لیے کوچۂ دلدار
سلیم کوثر

آئیے اس مسئلے کو جدید تر یا مابعد جدید غزل کے چند شعروں کی مدد سے سمجھیں جسمیں بڑھتی ہوئی مادیت اور اخلاقی بحران کا پتہ چلتا ہے۔

کسی نے بے سروپائی کے باوجود مجھے
زمین پر سجدہ و ارض قیام پر رکھا
احمد جاوید

دنیا کے طریقے ہمیں اچھے نہیں لگتے
نادان اگر ہم ہیں تو نادان رہیں گے
مہتاب حیدر نقوی

جدا کرتے ہیں مجھ کو آسماں اور ماں سے
یہ کیسے سلسلے گندم کے دانوں میں بنے ہیں
محمد اظہار الحق

وجود پر انحصار میں نے نہیں کیا تھا
کہ خاک کا اعتبار میں نے نہیں کیا تھا
محمد اظہار الحق

جدید تر غزل کے لہجے میں یہ انداز ایک تو جدیدیت کے زیر اثر سامنے آنے والی غزل کی تجرباتی انتہا پسندی کے ردعمل میں پیدا ہوا اور دوسرے یہ کہ گذشتہ برسوں میں تشکیک کے بجائے ایقان، خوف کے بجائے اعتماد اور مادی صداقتوں کے بجائے روحانی سہاروں کی تلاش وجستجو کے موضوعات نے بھی معاصر غزل کے لہجے اور آہنگ میں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور استحکام پیدا کیا۔اب یہ دیکھیں گے کہ آج کی غزل میں کائنات کی مختلف حقیقتیں ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہوگئیں ہیں۔

جانے کس مسجد کی صورت بن رہی ہے خواب میں
جانے کن سجدوں کی آہٹ میری پیشانی میں ہے
فرحت احساس

تمام وسعت صحرائے تشنگی میری
تمام سلسلہ دجلہ و فرات مرا
عشرت ظفر

آتے ہیں برگ و بار درختوں کے جسم پر
تم بھی اٹھاؤ ہاتھ کہ موسم دعا کا ہے
اسعد بدیوانی

اندھیروں کی طرف بڑھتے قدم کو کیوں نہیں زنجیر کر دیتا
خدا ہر سمت روشن ہے تو میری گمرہی کا کیا سبب آخر
عالم خورشید

کسی سحاب نے پوچھا نہ تشنگی کا مزاج
گھٹا کے روپ میں برسی مری دعا مجھ پر
عشرت ظفر

ان اشعار میں عقیدت کی بازیافت کے رویے اور دعا اور التجا کے لہجے کو مشترک قدر کی حیثیت حاصل ہے۔تمام شعروں میں مذہبی استعاروں سے متحرک پیکر بھی تراشے گئے ہیں اور وجدانی فضا بھی تیار کی گئی ہے۔ان دعاعیہ لہجوں میں عقیدے کی ضرورت کے احساس کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ عقیدے کی ضرورت کا وہی احساس ہے جس سے محرومی نے جدید غزل میں مادّی رشتوں سے اکتاہٹ اور قدروں کے انتشار کی کیفیت پیدا کی تھی۔ان اشعار کی روحانی فضا میں محض مذہبی تصورات کی کارفرمائی نہیں ملتی بلکہ ایک نیا صوفیانہ آہنگ بھی ملتا ہے۔اس لیے اگر غزل کے جدید تر منظر نامے کو مذہبی حسیت،صوفیانہ آہنگ اور ماضی کے حوالے سے کھوئے ہوئے روحانی رشتوں کی بازیافت پر مبنی قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔موجودہ غزل کے اس منظر نامے کی تشکیل میں نسبتاً پرانی نسل کے جدید شاعروں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا گزشتہ دس پندرہ برسوں میں سامنے آنے والے نوجوان شعراء کا۔ یہ بات البتہ اپنی جگہ اب بھی درست ہے کہ موجودہ غزل کے موضوعات اور لہجوں میں مذہبی حسیت کے علاوہ بھی بعض رجحانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے،لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ مذہبی حسیت کے نتیجے میں ابھرنے والا صوفیانہ آہنگ آج کی غزل میں غالب ترین رجحان بن کر نمودار ہوا ہے۔

اردو غزل میں مقبول عام روایتوں کا بار کم ہوتا ہے اور برس ہا برس کے استعمال سے مضمحل لفظی اور حسی پیکروں میں نئے خون اور معنویت کی گردش کا احساس ہوتا ہے۔انتشار، بے ترتیبی اور اصوات والفاظ واحساسات کی سطح پر بے ربط تاثر پیدا کرنے والی غزلیہ شاعری کی جگہ اب ان کے غزلوں میں ایک مکمل، مترتب اور مرتکز ذہنی ماحول کی حدیں قائم ہوتی ہیں ۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

قفسِ رنگ سے نکلی تو ٹھکانہ نہ ملا
بوئے گل جب سے اڑی اور بھی بے حال رہی

زندگی تیرے لیے سب کو خفا ہم نے کیا
اپنی قسمت ہے کہ اب تو بھی خفا ہم سے ہوئی

سر اٹھانے کا بھلا اور کسے یارا تھا
بس ترے شہر میں یہ رسم ادا ہم سے ہوئی

بارِ ہستی تو اٹھا، اٹھ نہ سکا دستِ سوال
مرتے مرتے نہ کبھی کوئی دعا ہم سے ہوئی

کچھ دنوں ساتھ لگی تھی ہمیں تنہا پاکر
کتنی شرمندہ مگر موج بلا ہم سے ہوئی

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

ٹھنڈی ٹھنڈی سی، مگر غم سے ہے بھرپور ہوا
کئی بادل مری آنکھوں سے پرے اور بھی ہیں

شب گذشتہ بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تمہیں صدا دیتے

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے

بارہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں
بارہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا

زندگی چھوڑنے آئی مجھے دروازے تک
رات کے پچھلے پہر میں جو کبھی گھر آیا

تیری دیوار کا سایہ نہ خفا ہو مجھ سے
راہ چلتے یوں ہی کچھ دیر کو آ بیٹھا تھا

اے شبِ غم مجھے خوابوں میں سہی، دکھلاؤ
میرا سورج تری وادی میں کہیں ڈوبا تھا

میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خود نما ہوں میں

اب نیند آ گئی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

اے عمر رفتہ! میں تجھے پہچانتا نہیں
اب مجھ کو بھول جا کہ بہت بے وفا ہوں میں

سوتے سوتے چونک پڑے ہم، خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود کو ہم کو ڈھونڈ رہا ہو ایسا اک رستہ دیکھا

دور سے اک پرچھائیں دیکھی، اپنے ملتی جلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرا دیکھا

رات وہی پھر بات ہوئی نا، ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے میں شور سا اک اٹھتا دیکھا

ابلتی دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبح زرنگار مجھے

عمر بھر مصروف ہیں مرنے کی تیاری میں لوگ
ایک دن کے جشن کا ہوتا ہے کتنا اہتمام

وہ لوگ اب کہاں ہیں وہ چہرے کدھر گئے
اے شہرِ حسن کس کی تجھے بددعا لگی

سائے سے کچھ قریب سے ہو کر گذر گئے
پچھلے پہر کو آنکھ ابھی تھی ذرا لگی

بس ایک حسین کا نہیں ملتا کہیں سراغ
یوں ہر زمیں یہاں کی ہمیں کربلا لگی

یہ وہ اشعار ہیں جس میں خلاقانہ جسارت اور باغیانہ حوصلہ مندی کا وہ انداز نہیں ملتا جو اینٹی غزل کا طرہ امتیاز ہے۔ ان میں وہ شعری کرتب اور لسانی داؤں پیچ بھی بروئے کار نہیں لائے گئے ہیں

جن کا حوالہ بعض لوگوں کے نزدیک نئی غزل کے ساتھ ضروری ہے۔ دھواں، آسیب، کھنڈر دشت، ریت، سایہ، ہوا، شہر، جنگل، پیاس، بادل جیسے الفاظ جنہیں مقلدانہ نئی شاعری میں ناگزیر لفظی ومعنوی علائم کی حیثیت حاصل ہے۔ متذکرہ اشعار میں اپنے مخصوص متعین اصطلاحی معنوں میں کہیں استعمال نہیں ہوئے۔ ان کا مجموعی آہنگ اچھی غزل کے مروجہ آہنگ کے ساتھ بے جوڑ نہیں دکھائی دیتا لیکن ان سے احساس وادراک کی جو شعاعیں پھوٹتی ہیں اور اجتماعی زندگی کے ردعمل کی شکل میں ابھرنے والے جن وجودی تجربوں کی فضا خلق ہوتی ہے وہ ہمارے عہد کی فضا ہے۔ انسانی تہذیب کے ارتقاء کی ابتدائی منزلوں سے اب تک کوئی بھی عہد فنون لطیفہ کی شکل میں یکسر نئے موضوعات کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ موضوع کی اہمیت، ان کا درجہ اور تناسب، ان کی اپیل اور ان کے آئینے میں منعکس ہونے والی ذہنی، جذباتی، عقلی اور وجدانی رویے انہیں رنگارنگی اور تازگی عطا کرتے ہیں۔ مختلف سیاسی، تہذیبی، مادی اور معاشی حالات کے تحت جو صداقتیں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں وہ مجرد ہیئت کے ساتھ ادب یا فن کے دائروں میں جگہ نہیں پاتیں۔ اس کے لیے انہیں فنکار کے شعور سے اس کے جذبے تک اور پھر جذبے کی وساطت سے احساس کی اس منزل تک جہاں اس کی ذات اور احساس کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو، پہنچنا پڑتا ہے۔ اسی منزل پر خون جگر معجزہ فن کی نمود کا وسیلہ بنتا ہے۔ اوپر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عام شعری روایت کس طرح ایک انفرادی تخلیقی تجربے کا جزو بنتی ہے۔ ان اشعار میں رفتگاں کی آوازوں کا سراغ ملتا ہے لیکن لحہ بہ لحہ معدوم ہوتا ہوا۔ ناصر کاظمی، احمد مشتاق، شہزاد احمد، ابن انشاء، سلیم احمد، ظفر اقبال، منیر نیازی اور ان کے بعد شہر یار، ساقی فاروقی، شکیب جلالی سے لے کر عدیم ہاشمی تک کے یہاں ماضی کے فنی تصورات، غزل کی مجبوریوں میں گھری ہوئی آزادی کے مانوس مظاہر اور غزل کے مروجہ زبان میں صرف اپنی بات کہنے کا انداز ملتا ہے۔ کبھی کبھی روایت کی لے اتنی تیز بھی ہو جاتی ہے کہ نئے غزل کا لہجہ دبتا ہوا محسوس ہوتا ہے چاہے وہ سیاسی انداز ہو یا سماجی مسائل ہوں۔

وہ دوستی تو خیر اب نصیب دشمناں ہوئی   وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا
ناصر کاظمی

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر   آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا
احمد فراز

ظلم کرتے ہو مگر اف نہیں کرنے دیتے تم سے اچھے کہ تڑپنے تو دیا کرتے تھے
شہزاداحمد

کبھی حرم میں ہے کافر تو دیر میں مومن نہ جانے کیا! دلِ دیوانہ تیرا مذہب ہے
عمیق حنفی

گھر اپنا تو بھولی ہی تھی آشفتگئ دل خوت رفتہ کو اب در بھی ترا یاد نہیں ہے
وحیداختر

مثال ایسی ہے اس دورِ خرد کے ہوشمندوں کی نہ ہو دامن میں ذرّہ اور صحرا نام ہو جائے
شکیب جلالی

کچھ تو سراغ مل سکے موسم درد ہجر کا سنگ جمال یار پر نقش کوئی بنائیے
احمدمشتاق

پھر صبا سوئے چمن آنے لگی بوئے گل زنجیر پہنانے لگی
محمدعلوی

دامنِ یار پہ حق اپنا جتایا نہ کبھی اشک اڈے بھی تو پلکوں میں چھپائے ہم نے
سلیمان اریب

پہلوئے طرب میں کوئی نشتر رکھ دے آج تک یاد ہے تیری نگہِ یاس مجھے
شاذتمکنت

راہِ وفا دشوار بہت تھی، تم کیوں میرے ساتھ آئے پھول سا چہرہ کمھلایا اور رنگِ حنا پامال ہوا
اطہرنفیس

خوشی کلی نہ بنی غم میں بے کلی نہ رہی کبھی کبھی تو کہیں روشنی نہ رہی
ندافاضلی

عادل کسی کی چشم غزالیں میں اشکِ غم یوں لگ رہا ہے جیسے قیامت ہی آئی ہے
عادل منصوری

اب چراغوں کی ضرورت بھی نہیں چاند اس دل میں چھپا ہو جیسے
بشیربدر

ان اشعار میں لفظوں، مرکبات، علائم، استعاروں اور کنایوں سے قطع نظر خیال اور جذبے کی بھی وہی بنیادیں اور سطحیں ملتی ہیں جو اردو غزل کی روایت میں عام ہیں۔ ان میں کہیں کہیں شاعر کی انفرادیت روایتی آب و رنگ پر اس طرح غالب آ گئی ہے کہ اس کا ذاتی احساس لفظوں اور علائم کی فرسودگی کی باوجود اپنی زمین میں جذب نہیں ہوسکا ہے لیکن بیشتر اشعار اپنی روایت کی سطح سے بلند ہوتے ہوئے نہیں دکھائی دیتے۔ تغیر پذیر فکری اور فنی میلانات کی فضا میں سرتا پا مختلف آہنگ اور احساس کی تعمیر ممکن بھی نہیں۔ اور جن شعراء کے حوالے دیے گئے ان میں سے بیشتر نے آگے چل کر اپنی روایت اور ذاتی تخلیقی عمل کے درمیان ایک فاصلے کا احساس دلایا اور ایسے شعر بھی کہے جو خود ان کے ابتدائی شعری مزاج سے بہت زیادہ مطابقت نہیں رکھتے۔ ایسا ہونا بھی بالکل فطری ہے کیوں کہ جیسے جیسے نئے محرکات اور نامانوس حقائق تجربے کا معمول بنتے جاتے ہیں ان کے انوکھے پن کے ردعمل سے ابھرنے والی استعجابی کیفیت کم ہوتی جاتی ہے۔ آج غزل کی خارجی اور داخلی ہیئت میں ایسی تبدیلیاں آ چکی ہیں کہ ماضی بعید کی روایت کا کوئی سرا کبھی کبھی اس سے وابستہ ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نسبتاً کم عمر شعرا نے ظفر اقبال، شکیب جلالی یا احمد مشتاق کے جن معیاروں کو اپنے لیے نمونہ بنایا وہ تجربوں کی ایک طویل شاہراہ سے گذر کر ایک توانا اور مستحکم معیار کی حیثیت اختیار کر سکے تھے۔ خام اور ناپختہ اذہان نے تہ بیت اور ریاضیت کی ایک لازمی حد کو عبور کیے بغیر تقلید کی جس روش کو اختیار کیا ہے اس کے نتائج بظاہر تو دلچسپ، شگفتہ اور غیر رسمی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس موقع پر مارسل پروست کے یہ جملے بھی یاد رکھنے کی چیز ہیں۔

> **"اگر ہمارے بارے میں ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ ایسے ذہین لوگ کبھی پیدا نہیں ہوئے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اندازِ بیان کے کچھ ایسے طرز ہیں جو متعدد ہیں اور جنہیں ایک صحافی، جس میں ذرا بھی صلاحیت ہے، چند سال میں سیکھ سکتا ہے، بالکل ایسے جیسے کسبی اپنے پیشے کو سیکھ لیتا ہے۔"** (ترجمہ جمیل جالبی، نیا دور، کراچی، شمارہ ۱۱، ص ۵۵)

غزل کی روایت نئی ہو یا پرانی مشرقی شاعری کے چند ناگزیر فنی تقاضوں سے الگ کر کے قائم نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کی ساخت اور اختصار اس کا عیب بھی ہے اور حسن بھی۔ میر سے لے کر ظفر اقبال تک نے اسے جب تک اس کی مخصوص اور منفرد ہیئت، مزاج اور اس کے ناگزیر فنی مطالبات کے ساتھ اختیار کیا، یہ ہر عہد میں اس عہد کے تہذیبی رمز اور تخلیقی معنویت کا استعارہ بنتی رہی۔ گلا فتاب

کے ساتھ ظفر اقبال نے ''اردو مستقبل کا جو خواب نامہ'' مرتب کیا ہے وہ اس وقت تک بجائے خود ایک سوال بنا رہے گا جب تک غزل اس کی تعبیر بن کر بھی اپنی سرخ روئی کو برقرار نہ رکھ سکے۔

اردو غزل چونکہ ایک زمانے تک بندھے ٹکے فنی سانچوں اور تہذیبی قدروں کے ایک مخصوص تصور کی بنیاد پر چند منتخب موضوعات کے دائرے سے باہر نہ جا سکی اس لیے ذاتی امتیازات کے باوجود کلاسیکی غزل کی اچھی مثالوں میں زمانی فاصلوں کے ہوتے ہوئے بھی، مضامین اور پیکروں کی تکرار بہت عام ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزل چونکہ متضاد کیفیتوں کے بیان پر بھی قادر رہی ہے اور اشاروں کنایوں میں تجربوں کی طویل کہانیوں کا احاطہ کرنے کا سلیقہ بھی رکھتی ہے،اس لیے ہر اچھے غزل گو کے یہاں،خواہ وہ کسی بھی عہد کی غزل گوئی کو اپنا معیار بنائے،ایسی مثالیں مل سکتی ہیں جو مختلف ادوار کے فکری مطالبات سے مطابقت رکھتی ہوں۔یہاں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ نو کلاسکیت کو میں کوئی منفی رویہ نہیں سمجھتی۔کلاسیکی شاعری ہمارا ماضی ہی نہیں آج کی شعری لہروں کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کی منتخب مثالیں روشنی کے ایسے میناروں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کی مدد سے فن کے نئے راستے تلاش کیے گئے لیکن کلاسکیت ذہنی موانست اور ہم آہنگی سے زیادہ آج کے قاری کے ذہن میں عقیدت اور تکریم کا تصور بیدار کرتی ہے۔تجدید کا عمل اسی صورت میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب شاعر کی انفرادی استعداد کلاسیکی شاعری کی قامت سے مرعوب ہو کر کلیتاً مغلوب نہ ہو جائے۔جو شاعری بیرونی پردوں کو ہٹا کر اپنی ذات سے براہ راست رشتہ استوار کرنے پر قادر نہیں ہو سکتی اسے ہمیشہ زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

جب کبھی کسی مخصوص رجحان کی طرف میلان طبع حواس کے تمام زاویوں پر غالب آ جاتا ہے تو نسبتاً ضمنی حیثیت رکھنے والے رویے اس کے سیلاب میں کھو جاتے ہیں۔ ہر عہد میں اچھے غزل گویوں کے یہاں روایت کا ایک زندہ اور فعال تصور ملتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ بعض کی صلاحتیں ایک عظیم المرتبت روایت کی تمازت سے پگھل کر اس کا جزو بن جاتی ہیں اور بعض شعراء کے یہاں انفرادی مزاج اور کردار کے تحفظ کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے اور ان کا شعور اس قدر جاذب ہوتا ہے کہ روایت کے زندہ عناصر خود ان کی شخصیت میں گم ہو کر ایک نئی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔

نئی غزل پر گفتگو سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میرے نزدیک اچھی شاعری اور نئی شاعری ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ میں نئی شاعری کو حقائق کے ایک نئے ادراک اور ان کے اظہار کے لیے فن اور ہیئت کے ایک نئے راستے کی تلاش سے تعبیر کرتی ہوں۔کلاسیکی غزل اور نئی شاعری

کے نمائندوں کے درمیان جو حد فاصل قائم ہوتی ہے اسے میں ذاتی طور پر غم انگیز حالات میں بھی ضبط اور تہذیب نفس کی پیدا کردہ آسودگی اور تمام ذہنی و جذباتی سہاروں کے فقدان کے باعث ابھرنے والے اضطراب کے دو مختلف سمتیں رکھنے والے رویوں کی مدد سے پہچانتی ہوں۔ امتیاز کی دوسری بنیاد کلاسیکی غزل میں جمالیاتی یا تہذیبی اور نئی غزل میں زبان کا تخلیقی رابطہ ہے۔ کلاسیکی غزل کی اساس چند ذاتی اور معاشرتی قدریں تھیں۔ نئی غزل قدروں کے زوال کی نوحہ گر اور صداقت خیال کی پیرو ہے جس کے آئینے میں اسے خوابوں کے آراستہ نگار خانوں کے بجائے کھردری حقیقتوں کے پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ کلاسیکی غزل کا ہر پہلو ایک عظیم الشان کل کے جزو لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ نئی غزل کسی لازمے کا جبر قبول نہیں کرتی۔ وہ عظمت کے بجائے حقیقت کا استعارہ بننا چاہتی ہے اور اپنے ذاتی تناظر کو کسی بھی تہذیبی، مذہبی، نظریاتی، فکری اور اخلاقی تناظر پر قربان کرنے سے دامن بچاتی ہے۔ نئی غزل کے اچھے نمونے اور برے نمونے ہر عہد کی اور کسی بھی فکری یا فنی مسلک کی پابند شاعری میں عام ہیں کلاسکی غزل کی طرح نہ تو مروجہ اور مقبول تجربوں اور کوائف کے احاطے پر اکتفا کرتے ہیں نہ ترقی پسند غزل کی طرح کسی بیرونی اور وسیع تر تہذیبی مقصد کے تابع ہیں، بلکہ مانوس، حقیقی اور بیک وقت بیدار اور خوابیدہ زندگی کے کارزار میں احساس کی سطح پر اپنے ذاتی اشتراک اور اس کے نتائج کی روداد سنانے کے بجائے ان نتائج کا تاثر پیش کرتے ہیں۔ چوں کہ حقیقتوں کو دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کا زاویہ بدلا ہے اس لیے اظہار کی راہیں بھی تبدیل ہوئی ہیں۔ نئی غزل میں الفاظ جامد حقیقتوں کے مظہر نہیں بنتے بلکہ جذبے کی جدت سے ان حقائق کو سیال کر کے احساس کے سانچے میں ڈھالتے ہیں جن کے ذریعہ ہنگامی اور لمحاتی تجربے بھی وقت اور مقام کے وسیع تر کینوس پر پھیل جاتے ہیں۔ نئی غزل فکر اور فن کو زیادہ آزادی عطا کرتی ہے گرچہ غلط رو شعراء نے اس آزادی کو برتنے کے لیے چند فارمولوں کی بنیاد پر آپ اپنے لیے پابندیاں بھی پیدا کر لی ہیں۔ نئی غزل کے بہتر تخلیقی جوہر رکھنے والے شعراء کے یہاں فارم کی گرفت کو ہلکا کرنے کے لیے علامتی اظہار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پابندیاں جب تخلیقی عمل کی شوریدگی برپا ہوتی ہیں تو لسانی توڑ پھوڑ اور مروجہ زبان و بیان کے تمسخر کے خاکے ابھرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس شوریدگی کے نتائج ایسی مضحک صورتیں بھی پیدا کر دیتے ہیں کہ غزل اور ہزل کے مابین تفریق ممکن نہیں رہ جاتی۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں

عہد رفتہ کے پراسرار گھنے جنگل میں   پھونک کر سحر بنا دیتی ہیں پتھر یادیں

وحید اختر

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا　　یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا
محمد علوی

کوئی ہے جو مجھے دو چار پل اپنا لے　　زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے
شہریار

جو چپ چاپ رہتی تھی دیوار پر　　وہ تصویر باتیں بنانے لگی
عادل منصوری

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب　　میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا
حسن نعیم

عجیب شخص ہے ناراض ہوکے ہنستا ہے　　میں چاہتا ہوں خفا ہو تو خفا ہی لگے
بشیر بدر

زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی　　ان سے بچھڑے تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں
زبیر رضوی

مجھے خوشبو لپیٹے جسم کچھ اچھے نہیں لگتے　　مگر اس کو مرا خالی بدن کاٹتا ہوگا
فضل تابش

وہ چاہتا تھا کہ وعدہ نباہ کا کرلوں　　میں چپ رہا کہ مجھے خود مآل کا ڈر تھا
ناصرالدین خاں

کتاب کھولوں تو حروفوں میں کھلبلی مچ جائے　　قلم اٹھاؤں تو کاغذ کو پھیلتا دیکھوں
محمد علوی

شاید کوئی چھپا ہوا سایہ نکل پڑے　　اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگائیے
عادل منصوری

میں دن ہوں میری جبیں پر دکھوں کا سورج ہے　　دیے تو رات کی پلکوں میں جھلملاتے ہیں
بشیر بدر

میں بھی صحرا ہوں مجھے سنگ سمجھنے والو　　اپنی آواز سے کرتے چلو سیراب مجھے
شہاب جعفری

ایسی مغرور تمناؤں کا پیچھا نہ کرو　　اپنی پہچان کے سب رنگ مٹادو نہ کہیں
زبیررضوی

بلندیوں پہ تھا محوِ سفر ہوا کی طرح　　لباسِ خاک جو پہنا تو خاکسار ہوا
کمارپاشی

کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم　　اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ ہوگئے
شمس الرحمٰن فاروقی

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال　　جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے
ندافاضلی

زمین لوگوں سے ڈر گئی ہے　　سمندروں میں اتر گئی ہے
محمدعلوی

دیکھا تو سب نے ڈوبنے والے کو دور دور　　پانی کی انگلیوں نے کنارے چھولیا
عادل منصوری

وہ دیودار کی ٹہنی پہ رک گیا سا چاند　　ہوا چلے تو ابھی کروٹیں بدلنے لگے
بمل کرشن اشک

کچھ تیرا درد چاٹ گیا ہے میرا بدن　　کچھ زندگی نے پی لیا اندر تلک مجھے
عتیق تابش

سڑک پر چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر　　کسی چھت پر مزے سے بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں
محمدعلوی

بہت سنبھال کے رکھا تھا نیک بیوی نے　　ہوا چلی تو برادہ بکھر گیا گھر میں
بشیربدر

مندرجہ بالا اشعار میں جدید غزل گو شعراء کا سماجی وسیاسی مسائل کا مطالعہ کتنا وسیع ہے معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان میں جدید اردو غزل کے لیے جن لوگوں نے زمین تیار کی ان میں زیادہ تر شعرا شامل ہیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ چند ترقی پسند لوگ تحریک

کے نظریے سے وابستگی پر شدید اصرار کر رہے ہیں۔ تو اس سے فن کار کی آزادی ختم ہو رہی ہے۔ فن کار صرف اس تحریک سے وابستہ نظریات اور خیالات کو ہی گھما پھرا کر صفحۂ قرطاس پر اتار رہے ہیں تو ان لوگوں نے اس نظریاتی جبر کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ ان ترقی پسندوں نے مانا کہ کسی بھی تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزادانہ سوچ سکے۔ اس بغاوت کے بعد ایسی غزلوں کی تخلیق ہونے لگی جن میں سیاسی نظریات کی جگہ عام انسانی جذبات کی عکاسی کی گئی تھی۔ یہ غزلیں پچھلے دور کی غزلوں سے کئی طرح مختلف تھیں اور ردعمل کے طور پر وجود میں آئیں تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے آئین سے جن شعرا نے بغاوت کی۔ ان باغی شعرا میں خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، باقر مہدی اور محمود ایاز کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں خورشید احمد جانی اور حسن نعیم، ان شعراء سے الگ رہتے ہوئے ایسی نظمیں کہہ رہے تھے۔ جس میں تازہ ہوا کا احساس ہوتا ہے۔ جدید غزل کے لیے ماحول تیار کرنے میں ان تمام شعرا کا ہاتھ رہا ہے۔ ساتھ ہی پڑوسی ملک پاکستان میں بھی اردو غزل نئے رنگ و آہنگ سے آشنا ہو رہی تھی۔ خاص کر ناصر کاظمی دونوں ملکوں میں یکساں طور پر شہرت حاصل کر رہے تھے۔ ناصر کاظمی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنج بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

ناصر کاظمی کی مقبولیت کے سبب اس عہد کے شعرا پر ناصر کاظمی کے کلام کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جدیدیت کے رجحان میں تیزی آئی۔ اس کے زیر اثر بہت سے شعرا فنی شاعری کے طرف مائل ہوئے۔ ان میں دو گروپ تھے۔ ایک گروپ وہ جو تقریباً چودہ پندرہ سال قبل سے کلاسیکی غزل کی شاعری کر رہے تھے اور دوسرے وہ جو ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ان شعرا کی شاعرانہ عظمت پوری طرح سے منظر عام پر نہ آ سکی تھی۔ پھر بھی اس دور کے شعرا میں ان کی گنتی ہونے لگی تھی۔ ان شعرا میں فضا ابن فیضی، شاذ تمکنت، بشر نواز، مظہر امام، محمود سعیدی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔
ان شعرا کو غزل کے جدید روپ نے بہت متاثر کیا۔ انھوں نے اپنے فن کو غزل کے نئے روپ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ اس دوران چند نوجوان غزل گو شعرا بھی ابھر کر سامنے

آئے ان میں شہر یار، شہاب جعفری، مظفر حنفی، محمد علوی، ندا فاضلی، بانی، بشیر بدر، زبیر رضوی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

ان شعرا میں باقر مہدی، وحید اختر، مظہر امام اور شہاب جعفری کا تعلق ترقی پسند تحریک سے بھی تھا۔ اس لیے ان کی غزلیں جدیدیت کے باوجود ترقی پسند تحریک کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکیں۔ ترقی پسند غزلیں اپنے انفرادی نقطۂ نظر، اسلوب بیان، خطابت اور انقلابی جوش کے لیے مشہور تھیں۔ ان شعرا کی غزلوں میں بھی یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ مثلاً وحید اختر کے مندرجہ ذیل اشعار میں ترقی پسند اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

گردش دہر ہے اپنی ہی نظر کی گردش
ہے وجود اپنا زماں ورنہ زماں کچھ بھی نہیں
اگر نہ توڑو گے زنجیر قید و حیات وہی
بنے گی پاؤں کی زنجیر زندگانی بھی

مظہر امام کے سیاسی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کل سحر ہوگی تو دشمن کا پتہ پوچھیں گے
کم سے کم آج تو ہم تیر کو آتا دیکھیں
دنیا بھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

مظہر امام کا دوسرا شعر پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے عہد کی زندگی سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے دیکھا ہے۔

اردو میں جدید غزل سے وابستہ شعرا کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ یہاں میں مقالے کی طوالت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چند اہم جدید شعرا کا ہی ذکر کروں گی۔ جنہوں نے اپنی کوششوں سے جدید غزل کو فروغ دیا اور اسی سبب جدید دور میں شہرت اور مقبولیت کی بلندی تک پہنچے۔ جدید غزل کے امام ناصر کاظمی کے ساتھ ہی جدید غزل کے پیرانہ بیان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے والے شعرا میں شکیب جلالی، وحید اختر، مظہر امام، محمد علوی، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظفر حنفی، شہر یار، ندا فاضلی، حسن نعیم،

شاذ تمکنت، عرفان صدیقی، پروین شاکر، احمد فراز خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

☆ناصر کاظمی

شاعر کا تصور ایک غیر شاعر کے مقابلے میں زیادہ شدید ولطیف اور نازک ہوتا ہے۔ شاعر کبھی پرانی قدروں کو توڑنے پر زور دیتا ہے۔ تو کبھی نئی قدروں کی بنیاد ڈالتا ہے۔ ایسے ہی حساس شاعر جدید غزل کے امام ناصر کاظمی ہیں۔ جن کی غزل کی امتیازی خصوصیت عشق ومحبت کے تعلق سے انسانی جذبات کا بیان ہے۔ ناصر کاظمی کا عشق ارضی و مادی ہے۔ وہ عشق کو آفاقی نہیں بناتے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عشقیہ جذبات کا اظہار بہت سادگی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ خوبی نے ہی ناصر کاظمی کی راہ ہموار کی۔ ناصر کاظمی نے اجتماعیت وعوامیت کے چکر میں پڑ کر اپنی غزل کو عصری، سیاسی، سماجی حیثیت کی حامل بنانے کی کوشش نہیں کی۔

ناصر کاظمی نے جس سچائی کے ساتھ انسانی جذبات وخیالات کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ان کی شاعری کی یہ خصوصیات ہی ان کی شہرت کی بنیاد بنی۔ ان کے اشعار جذبات و کیفیات سے اتنے پر ہوتے ہیں کہ سیدھے دل میں جگہ بناتے ہیں۔

ایک سمے تیرا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانوں پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل

میرے دل سے نہ جا خدا کے لیے
ایسی بستی نہ پھر بسے گی کبھی

گلی گلی تیری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دور نکل

''نقطہ یہ ہے کہ عشقیہ شاعری ہونے کے باوجود ان کی شاعری متروک نہیں ہے۔ کیوں کہ انہوں نے طرح طرح سے اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ وہ صرف اپنی طرف سے بول رہے ہیں۔'' (نئی اردو غزل، سرور الہدیٰ، ص ۲۵۰)

ناصر کاظمی نے اپنے ہم عصر شعرا میں عشقیہ معاملات کے بیان میں اپنی منفرد آواز پیدا کی۔

نہ سمجھو تم اے شورِ بہاراں
خزاں پتوں میں چھپ کے رو رہی ہے

ناصر کاظمی نے جدید غزل کے نئے مزاج اور سیاسی وسماجی صورت حال کو استعاروں اور علامتوں کے پردے میں چھپایا ہے جو نئی غزل کا روشن پہلو ہے۔

اتنی مدت بعد ملے ہو
کن سوچوں میں گم رہتے ہو

ناصر کاظمی عہد ساز شاعر ہیں۔ انہوں نے جو شاعری کی وہ دور جدید کے شعرا کے لیے مشعل راہ بن گئی۔

☆خلیل الرحمٰن اعظمی

خلیل الرحمٰن اعظمی کی ذہنی تربیت ترقی پسندانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی بہت دنوں تک اس تحریک سے وابستہ نہیں رہ سکے۔ ترقی پسندی کو خلیل الرحمٰن اعظمی بہت اہم مانتے تھے۔ لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ ترقی پسندی پر بالادستی قائم ہو جائے اور نعروں و ہنگاموں سے ترقی پسندی کی پہچان ہو۔

ہندوستان آزاد ہوا اور ہمارے ملک نے آزادی کی بہت بڑی قیمت چکائی۔ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ پاکستان وجود میں آیا۔ اس سلسلے میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ہجرت کا جو عمل شروع ہوا اور جو قیامت برپا ہوئی اس میں تمام قدریں اور سچائیاں بے معانی ہو کر رہ گئیں۔ انسان لہولہان ہو گئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس سب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور درد کو دل میں محسوس کیا۔ اسی زمانے میں ان کی فکر میں تبدیلی آئی جس کے اثرات ان کی شاعری پر نمایاں ہیں۔

کیا کہیں ہم کہ ازل سے ہی ملی تھی ہم کو
ایسی تنہائی کہ تم سے بھی مداوا نہ ہوا

کی رام کہانی کس کس ڈھنگ سے کہہ ڈالی
اپنی جب کہنے بیٹھے تو اک اک لفظ پگھلتا تھا

وہ رت جگے رہے نہ وہ نینوں کے قافلے
وہ شام میکدہ وہ شب مشک بو ہوگئی

خلیل الرحمٰن اعظمی کے شعری مجموعے ''کاغذی پیرہن'' سے، ''آسماں اے آسماں'' تک ان کی شاعری میں طرح طرح کے رنگ ملتے ہیں۔ابتدا سے ان کی شاعری میں ارتقا کا عمل نظر آتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی غزلوں میں گہرائی اور طرفگی پیدا ہوتی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

''خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل میں خود کلامی خلاقانہ تفکر اور کائنات کی وسعت تنظیم کا احساس یہ سب اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ وہ غزل جوان کے پہلے سادہ بیانی کی ماری ہوئی تھی دور دور تک سرایت کی ہوئی ایک پیچیدگی سے ہمکنار نظر آنے لگی۔''

(نئی اردو غزل، سرور الہدیٰ ص ۲۶۰)

ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی جدید غزل کے ایسے تابندہ ستارے ہیں جن کی ضیا دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور جس روشنی میں بعد کے شعرا نے اپنی راہ متعین کی۔ ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے جدید غزل کی سمت و رفتار اور اسلوب کے تعین میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ وقت کے شور و ہنگاموں سے نکل کر یہ دونوں شعرا وجودیت کی طرف نہیں آتے تو جدید غزل کو موجودہ حیثیت حاصل کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا۔خلیل الرحمٰن اعظمی کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر ان کی شاعری کی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔

عمر بھر مصروف رہے مرنے کی تیاری میں لوگ
ایک دن کے جشن کا ہوتا ہے کتنا اہتمام

ہمارے پاس سے گذری تھی ایک پرچھائی
پکارا ہم نے تو صدیوں کا فاصلہ نکلا

تیری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

گذشتہ رات بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پر کہاں تک تمہیں صدا دیتے

☆شکیب جلالی

جدید غزل کے حوالے سے شکیب جلالی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن اردو غزل کے لیے صد افسوس اور محرومی کی بات ہے کہ شکیب جلالی جیسے ذہین وفطین شاعر نے صرف ۳۲ سال کی عمر میں خودکشی کر لی اور زندگی سے جنگ فتح کرنے کے بجائے اس سے ہار مان لی۔ زندگی شکیب جلالی کو تھوڑی مہلت اور دیتی تو جدید غزل کے سرمائے میں خوشگوار اضافہ ہوتا۔ شکیب جلالی غیر معمولی ذہن رکھنے والے شاعر تھے۔ زندگی کا ان کا تجربہ مایوس کن تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے اپنے اندر کی تلخی کو شاعری کی شکل میں باہر نکالتے رہے۔

فصیل جسم میں تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

مجھ کو گرنا ہے تو میں اپنے ہی سائے پہ گروں
جس طرح سایۂ دیوار پر دیوار گرے

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ سب بکھیر دیا
پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

جدید عہد میں پھیلی ہوئی مشینی زندگی، مادی ترقیات، کسمپرسی، شگفتگی کو بھی شکیب جلالی نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنے عہد کی تصویر کشی جس انداز میں اپنی شاعری میں کی ہے وہ صرف شکیب ہی کا حصہ ہو سکتی تھی۔ مندرجہ ذیل شعر میں اپنے اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ملبوس خوشنما ہیں مگر کھوکھلے ہیں جسم
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دوکان پر

شکیب جلالی ایک خوددار اور انا پسند شاعر تھے۔ وہ شکست برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ذات کی شکست کو شکیب نے صورت سے بھی تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں۔

اس مرحلے کو صورت بھی کہتے ہیں دوستو
اک پل میں ٹوٹ جائیں جہاں عمر بھر کے ساتھ

اپنے آس پاس کے ماحول سے بھی شکیب جلالی بے خبر نہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے زمانے کی عام زندگی کا بھی اظہار کرتے ہیں۔

رہتے ہیں کچھ ملول سے چہرے پڑوس میں
اتنا نہ تیز کیجیے ڈھولک کی تھاپ کو

ایک اپنا دیا جلانے کو
تم نے لاکھوں دیے بجھائے ہیں

شکیب جلالی جدید غزل کا ایسا نام ہے جس نے اپنی فکر اور زبان کے ذریعہ اردو غزل میں ایک نئی روایت قائم کرنے کی کوشش کی۔ شکیب نے معاشرے سے تعلق رکھنے والے ہر موضوع کو اپنی غزلوں میں جگہ دی۔ فرد کی تنہائی ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کے مایوس کن پہلو کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ شکیب نے اپنی غزلوں میں معانی و مفاہیم کے دریا بہائے ہیں۔

کیا شاخِ با ثمر ہے جو تکتا ہے فرش کو
نظریں اٹھا شکیب ذرا سامنے بھی دیکھ

☆شاذ تمکنت

شاعر کے فکر و خیال کی بلندی کا تعلق اس کے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کی وسعت سے ہے۔ شاذ تمکنت ایسے ہی جدید غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے اپنے فکر و خیال، تجربے، مشاہدے سے اپنے منفرد اسلوب نگارش سے جدید غزل کو پہچان دلائی۔ شاذ تمکنت کی غزلیں نئی شاعری کے کھردرے اور بے تکلف لہجے کے برعکس تکلف، تصنع، شگفتگی اور نغمگی سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے تجربات کا دائرہ محدود ہے لیکن اظہار کا لہجہ اور فنی چابکدستی ان کی غزلوں میں حسن اور دلکشی سے ہم کنار کرتی ہے۔ وہ ایسے چھوٹے چھوٹے تجربات کو نظم کر کے جاوداں بنا دیتے ہیں جنہیں عام طور پر شاعر نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔

کب چین پڑے اے دل کب درد کو کل آئے
پھر شام ہوئی گھر سے گھبرا کے نکل آئے

کون جانے مری تنہائی پسندی کیا ہے
بس ترے ذکر کا اندیشہ ترے نام کا ڈر

میری ان آنکھوں نے شاید تجھے دیکھا ہی نہیں
ہائے وہ حسرت و دیدار کہاں سے لاؤں

شاذ تمکنت کی غزلوں میں پیکر تراشی کے نایاب نمونوں اور حسن کی دلنشیں تصویروں کے ساتھ وہ تمام نشانیاں موجود ہیں جو کسی بھی شاعر کو عظمت بخشنے کے لیے کافی ہیں۔

تری صورت سے خدا سے بھی شناسائی تھی
کیسے کیسے ترے ملنے کی دعا کرتے تھے

زندگی ہم سے تیرے ناز اٹھائے نہ گئے
سانس لینے کی فقط رسم ادا کرتے تھے

☆مظفر حنفی

مظفر حنفی ہندو پاک کے ایسے منفرد غزل گو شاعر ہیں جنہیں اپنے لہجے کی بنا پر دور سے ہی پہچانا جاتا ہے۔مظفر حنفی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ، معروف ادیب، محقق، مترجم، افسانہ نگار اور شاعر بھی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہی ہیں۔حق گوئی، بے باکی، اجتماعی احساس سے وابستگی کے باوجود اپنے کو سب سے الگ رکھنے کی خواہش، انانیت، خودداری، نمود و نمائش کرنے والوں، منافقوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی عادت مظفر حنفی کے مزاج کی خصوصیت ہے۔ان کے اندر سچ کو سچ کہنے کا حوصلہ ہے۔مظفر حنفی کی شاعری کا طنزیہ پہلو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بیک وقت تہذیب و معاشرت، مذہب و سیاست، ادب و شاعری اور خود اپنی ذات کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ان کے طنز میں سنجیدگی، لطافت اور ایک آزادانہ فضا کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جدیدیت کا صرف ایک ہی رخ نہیں ملتا وہ روایت سے بغاوت نہیں کرتے روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھنے کی وجہ سے مظفر حنفی عام جدید شعرا کی طرح بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتے۔ انہوں نے روایت کے صالح اور جاندار عناصر کو اپنی شاعری میں جذب کیا۔ساتھ ہی فرسودہ روایتوں کو توڑ کر نئی روایتوں کی تخلیق کی۔جس کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

شاہراہوں پر تو مجمع ہے مظفر صاحب
شعر کہنے کے کئی اور بھی رستے ہوں گے

مظفرحنفی کی غزلوں میں جدید غزل کے تقریباً تمام رنگ یکجا ہوگئے ہیں۔ ابتدائی دور کی تجرباتی شاعری سے لے کر علامت پسندی، پیکر تراشی، بے تکلف غزل، ابہام سے ابلاغ تک کا سفر انہوں نے بڑی جواں مردی سے طے کیا۔ مظفرحنفی نے اپنی غزلوں میں ہندی کے سیدھے سادھے اور عام بول چال سے قریب بہت سارے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً مظفرحنفی کہتے ہیں۔

سہج سہج اپلوں سے آنچ نکلتی ہے
ترل ترل بہتی ہے نالی رات ہوئی

آتے جاتے ہر دم ٹوکا کرتے تھے کھڑکی دروازے
جھلا کر آزاد ہوا نے توڑ دیے کھڑکی دروازے

☆شہریار

جدید غزل گوشعرا میں شہریار خاص مقام رکھتے ہیں۔ شہریار نے ابتدا سے ہی غزل کی کلاسیکی روایت سے رشتہ استوار رکھا۔ جس وجہ سے وہ اپنے فن سے کہیں بھٹکے نہیں۔ وہ غزل میں نئے تجربے تو کرتے رہے۔ لیکن روایت سے وابستگی نے انہیں بھٹکنے نہیں دیا۔ ایسے دور میں جب غزل نیا روپ و آہنگ اختیار کر رہی تھی اور نئے تجربوں سے دوچار ہو رہی تھی۔ شہریار نے اعتدال سے کام لیا اور جدید ذہن کے مطابق نئے اسلوب کی تشکیل ہو رہی تھی۔ خوابوں اور یادوں کی شہریار کے یہاں بڑی اہمیت ہے۔ مگر اس کا تعلق رومانیت سے نہیں ہے۔ شہریار خواب کے ذریعہ عہد حاضر کے تلخ حقائق اور تہذیب کے مسائل کا اظہار کرتے ہیں۔

دنیا نے ہر محاذ پر مجھ کو شکست دی
یہ کم نہیں کہ خواب کا پرچم نگوں نہ تھا

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہوسکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

نئے عہد کی لامحفوظیت کے احساس نے انسان کو بے چینی، بے زاری اور زندگی کی لایعنیت سے دوچار کیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد سے ہمارا ایمان اٹھ گیا ہے۔ شہریار کا یہ استفہامیہ لہجہ شعر میں بڑی تہہ داری پیدا کر دیتا ہے۔

اے خدا میں تیرے ہونے سے بہت محفوظ تھا
تجھ سے مجھ کو منحرف تو ہی بتا کس نے کیا

شہریارنئ غزل کے متوازن اور سنجیدہ رجحان کے نمائندہ شاعر ہیں ۔

عکس اک ٹھہرا ہوا ہے کب سے سطحِ آب پر
تیز طوفانی ہوائیں کب ادھر کو آئیں گی

☆محمد علوی

محمد علوی نے جدید غزل میں زبان و بیان کی سطح پر تجربے کیے ہیں۔ بے تکلفی، غیر سنجیدگی، ہنسی مذاق، غصہ، تعجب، آس پاس کی چھوٹی چھوٹی اشیا اور معمولی سے معمولی تجربے کا بول چال کی زبان میں اظہار علوی کی غزل کی شناخت ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی۔

''محمد علوی کی غزل انقطاع کی سنجیدہ کوشش ہے۔ کیوں کہ انہوں نے ہر وہ حربہ آزمایا ہے جو پچھلے برسوں سے ممنوع تھا۔ اور ہر اس حربے کو ترک کیا ہے جو پچھلے سو برسوں سے مقبول تھا۔''

(جدید غزل کا فنی، سیاسی وسماجی مطالعہ، ڈاکٹر ممتاز الحق، ص ۱۸۱)

محمد علوی نے زندگی کا مشاہدہ بہت نزدیک سے کیا اور زندگی میں ہونے والے ہر نئے بدلاؤ کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ محمد علوی ہر طرح کی روایت واطوار سے انحراف کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں جانی پہچانی چیزوں میں بھی نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ معصومیت اور حیرت محمد علوی کی شاعری کی خاص خوبی ہے۔ روزمرہ کے الفاظ کے استعمال کے ساتھ ان کی غزلوں میں زندگی کی تمام رنگوں کی آمیزش ہے۔ محمد علوی کہتے ہیں ۔

کھڑے ہیں بے برگ سر جھکائے
ہوا درختوں کو چیر گئی ہے

دیکھ دریا میں پڑا ہے آسماں
چھوڑ کر اب یہ زمیں جاؤں کہاں

میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا تھا
گلی کا شور گھر میں آگیا تھا

☆ندافاضلی

ندا فاضلی دور جدید کے بہت مشہور ومقبول شاعر ہیں۔ ندا کی شاعری حقیقت کے بہت قریب ہے۔ ندا کو اپنے چاروں طرف زندگی کے مصنوعی پن، ریا کاری، دھوکہ، فریب، منافقت نظر آتی ہے جو اس عہد کی شہری زندگی کی پیداوار ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ کیا ہے۔ ندا گاؤں کی سادہ زندگی سے متاثر ہیں۔ وہ بار بار گاؤں کی سادگی، بچوں کی پاکیزگی اور خوابوں کی معصومیت کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔

زمانے کی بے راہ روی کو وہ مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کر رہے ہیں ؎

گھر سے نکلے تو وہ سوچا بھی کدھر جاؤ گے
ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

اونچی عمارتوں کی یہ بستی عجیب ہے
ہر شکل اپنے جسم سے باہر دکھائی دے

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

آج کے انسان کی بے قدری، سیاسی داؤ پیچ نے کس طرح عام انسان کے پستیوں کی طرف دھکیلا۔ رشتے کیسے بے معنی ہو گئے۔ ان سب باتوں کا ندا کے حساس دل پر گہرا اثر ہوا۔ جس کا ردعمل ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔ زمانے کی یہ تلخ سچائی ندا نے اپنی شاعری میں اتار لی ہے اور یہی جدید غزل کی پہچان ہے۔

☆حسن نعیم

حسن نعیم جدید غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انہوں نے جب اپنی شاعری کی ابتداء کی تب ہی انفرادی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس لیے جب غزل کا رجحان جدیدیت کی طرف بڑھا تو حسن نعیم نے بہت خوش اسلوبی سے اسے قبول کیا۔ کیوں کہ شاعری کا یہ رنگ تو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ حسن نعیم نے روایت کے توانا عناصر کی مدد سے غزل کے نئے اسلوب کی تشکیل کی۔ جدید غزل کے نمائندہ شاعر ہونے کے لحاظ سے انہیں اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے ؎

گیا تھا دشت سے اٹھ کر سمندروں کی طرف
وہاں بھی تشنہ نصیبی وہاں بھی مرگ سراب

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

حسن نعیم نے اپنی غزل گوئی کے ذریعہ حسن وعشق کے معاملات میں نئی ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔عشقیہ معاملات تو ہر شاعر کے یہاں مل جاتے ہیں۔حسن وعشق جیسے پرانے موضوع کی نئی پیش کش حسن نعیم نے بخوبی انجام دی۔حسن نعیم کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وہی شباہت وہی ادا ہے مگر وہ لگتا ہے غیر جیسا
نعیم یادوں کی انجمن میں نہ جانے کس کو پکار لائے

☆مخمور سعیدی

نئی غزل کے خدوخال کو ابھارنے میں کئی بڑے شعرا کے ساتھ مخمور سعیدی کا بھی اہم رول ہے۔اپنے انفرادی رنگ سے وہ اس دور کے اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔تمام دنیاوی مسائل کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی غزلوں میں حقیقت نگاری سے کام لیا۔ان کے اشعار میں اگر ایک طرف بعض ترقی پسند خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے تو ساتھ ہی ان کے اظہار میں جدید ذہن بھی کام کرتا نظر آتا ہے۔

پرانے خواب پلکوں سے جھٹک دو سوچتے کیا ہو
مقدر خشک پتوں کا ہے شاخوں سے جدا رہنا

تیرا اقرار بھی ہم تیرا انکار بھی ہم
مبتلا کوئی ہوا ہے ایسے عذابوں میں کہاں

مخمور سعیدی نے اپنی شاعری میں زندگی کی تلخ سچائیوں کو پیش کیا ہے۔لیکن مخمور سعیدی ان سچائیوں سے نظر نہیں چراتے بلکہ حوصلہ مندی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔مخمور سعیدی کی شاعری میں ابتدا سے ہی امید اور حوصلہ خاص موضوع رہا ہے۔مخمور سعیدی کی انفرادیت یہ ہے کہ جب وہ اپنے درد دل کا ذکر کرتے ہیں تو وہ درد دل نہ رہ کر درد زمانہ بن جاتا ہے۔جدید شاعری میں بیشتر ایسی مثالیں ہیں کہ جن میں ذات کا غم کائنات کا غم بن جاتا ہے۔

گلی گلی یہ سماں دھند کے اترنے کا
یہی ہے وقت مرے ٹوٹنے بکھرنے کا

غبار وقت نے دھندلا دیے ہیں آئینے
کہیں بھی اب کوئی چہرہ نہیں نکھرنے کا

☆شہاب جعفری

شہاب جعفری جدید غزل میں اپنے مجموعہ کلام ''سورج کا شہر'' کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ شہاب جعفری کی پسندیدہ علامت سورج ہے۔ سورج سے انہیں خاص انسیت ہے۔ شہاب جعفری کے کلام میں ترقی پسند عناصر بھی موجود ہیں۔ لیکن لہجے کی گھلاوٹ اور رمزیت نے ایک توازن قائم کر دیا ہے۔ سورج کی روشنی اور توانائی کو انہوں نے زندگی کی رعنائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی رعنائیوں کے ساتھ ساتھ اداسی کی فضاء بھی ملتی ہے اور یہ اداسی انہیں زندگی کا عرفان عطا کرتی ہے۔

شام رکھتی ہے بہت درد سے بیتاب مجھے
لے کے چھپ جا کہیں اے آرزوئے خواب مجھے

میں مسافر ہوں کہاں کا مجھے معلوم نہیں
ہاں بس اتنا کہ مرے گھر کی زمیں چھوٹ گئی

☆عرفان صدیقی

عرفان صدیقی ایسے ہی شاعر ہیں جنہوں نے جدیدیت کے ساتھ عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ جدیدیت کا دورعروج عرفان صدیقی کی غزل کا زمانہ بھی ہے۔ انہوں نے فکر و زبان دونوں سطحوں پر تجربے کیے۔ وہ الفاظ جو غزل کے نامانوس تھے انہیں عرفان صدیقی نے خوبصورتی کے ساتھ غزل میں برتا ہے۔ تمام عشقیہ جذبات میں عرفان صدیقی کے یہاں ایک موضوع ہجر و وصال کا بھی ہے۔ انہوں نے اس جذبے کو جو حسن بخشا ہے وہ ان کی تخلیقی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔

ترے وصال سے کچھ کم نہیں امید وصال
کہ ہم ہلاک ہوئے ہیں خوشی میں پہلے سے

آخر شب ہوئی آغاز کہانی اس کی
ہم نے پایا بھی تو اک عمر گنوا کر اس کو

عرفان صدیقی کو اسلامی واقعات سے خاصی دلچسپی ہے۔ جدید غزل میں وہ واقعہ کربلا اور دیگر واقعات کو بطور شعری استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ عرفان صدیقی کی غزل کا اپنا لہجہ ہے جس کی بنا پر وہ جدید غزل گو کی کثیر تعداد میں بھی الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ عرفان صدیقی کی اس الگ پہچان بنانے میں سب سے بڑا دخل ان کی غزل کی لفظیات اور تراکیب کا ہے۔

یہ سر کہاں وہ کلاہ چہار ترک کہاں
ابھی اجازت بیت نہیں ملا ہے مجھے

شہر بلقیس میں ہونے کی خبر تو آئے
شامل خاک نشینان سیمن ہوجاؤں

☆بشر نواز

بشر نواز جدید اردو غزل کے ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ انہیں معاشرہ اپنی سماجی وسیاسی ذمہ داریوں کا احساس اسی طرح تھا جس طرح وہ میدان شعر و ادب میں روز اول ہی سے اپنا نقش مرتب کر چکے تھے۔ وہ اشتراک سیاسی نظریات کے زیر اثر عوامی مفادات کی جدو جہد میں بھی صف اول کے شریک تھے۔ بشر نواز کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو بیک وقت روایت سے بھی جوڑا اور مستقبل کے امکانات سے بھی روبرو کروایا۔ وہ اپنے فنّی انہاک، ارضیت یا مقامیت منفرد اسلوب، تجربے کی سچائی کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص دھیمے لہجے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ دل گدازی، سادگی اور سچائی بشر نواز کا مسلک ہے ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

شریک معرکہ حق سبھی نہیں ہوتے
میرے بھی ساتھ تھیں احباب کی صفیں کتنی

ایک دور تھا کہانی بھی لگتی تھی سچ ہمیں
سچائیاں بھی لگتی ہیں اب تو کہانیاں

یہاں تو سنگ باری روز کا معمول ہے شاید
جو پتھر ہم پہ برسے سب لہو میں تر بتر برسے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں تب سے میں بدن کو اپنے
جب سے چوراہے پر ایک لاش پڑی دیکھی ہے

احساس کی لو چھین لے نظروں کو بجھا دے
اس دور میں جینے کا مجھے تو کچھ صلہ دے

☆پروین شاکر

جدید غزل کی شاعرات میں بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والی شاعرہ پروین شاکر نے پہلی بار نسوانی جذبات واحساسات انفرادیت کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیے۔ پروین شاکر نے اپنی غزلوں میں سیدھی سادھی زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کی غزلوں میں نسوانی عشقیہ جذبات کا ایک دریا موجزن ہے۔ جس میں نہ جانے کتنے دل ڈوبتے ابھرتے ہیں۔انہوں نے لڑکیوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی لفظی سادگی کے ساتھ کی ہے۔اس سے پہلے اردو غزل میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ پروین شاکر نے ایسا انداز بیان اختیار کیا جو سیدھا دل سے نکلتا ہے اور دل میں اتر جاتا ہے۔ پروین شاکر کے بارے میں نظیر صدیقی لکھتے ہیں۔

''.......لڑکی یا عورت کے محسوسات ومعاملات جس حد تک جتنی خوبصورتی کے ساتھ اور جتنے دلکش انداز میں پروین شاکر کی بدولت غزل میں آگئے ہیں اتنے کسی اور شاعرہ کی بدولت کبھی نہیں آئے۔''
(اردو شاعری کا ارتقاء، غلام آسی رشیدی صفحہ ۱۲۹۹)

پروین شاکر کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پورا دکھ اور آدھا چاند
ہجر کی شب اور ایسا چاند

اتنے گھنے بادل پیچھے
کتنا تنہا ہوگا چاند

میں سچ کہوں گی پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دلہن سجاؤں گی

مندرجہ بالاشعرا کے علاوہ اور جن شعرا نے جدید غزل کوفروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں وحیداختر، سلیمان اریب، زیب غوری، سلطان اختر، شاہد ماہلی، بانی، اسد بدایوانی، ظفر اقبال، ساقی فاروقی، افتخار عارف وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو ہر دور میں زمانے کے ساتھ چلتی رہی اور زمانے کے مزاج اور ماحول کے اثرات کوقبول کرتی رہی ہے۔ زمانے میں کیسے کیسے انقلاب آئے۔ پرانی قدریں ختم ہوئیں۔نئی قدروں کی بنیاد رکھی گئی۔ زمانے کا عروج ہو یا زوال غزل ہر لمحہ زندگی کے ساتھ رہی۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی زندگی سے اپنا تعلق ختم نہ کیا؛۔غزل ہمیشہ ہی زندگی کی ترجمان بنی رہی۔ زندگی کی قدیم وجدید تمام روایتوں کوغزل نے اپنے دامن میں جگہ دی۔عہد جدید میں غزل گو اپنے کو کسی نظریہ سے وابستہ کیے بغیر آزادانہ فضا میں غزل کہنے کے متمنی ہیں۔غزل گوشعرا کی کثیر تعداد اس بات کی دلیل ہے کہ غزل کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے اور اس کا مستقبل تابناک ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ دوسری علاقائی زبانوں میں غزل کا رجحان بڑھ رہا ہے۔آج کی غزل میں بڑا تنوع ہے۔عشق، سیاست، مذہب، سماجی اور معاشرتی زندگی سب کچھ اس میں شامل ہوگیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں غزل نے اپنے وجود کا احساس کرایا ہے۔

جدید غزل کے سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اب جدید غزل کا حلقہ کافی وسیع ہوتا جارہا ہے۔ یہ درست ہے کہ جدید غزل گوشعرا نے غزل کی قدیم روایت سے انحراف کیا اور اپنے اسلوب میں زندگی کی حرکت وتوانائی جذب کر کے غزل کو نئے روپ وآہنگ سے آشنا کرایا۔

ہندوستان کے مشہور شاعر بشیر بدؔر کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پہلی بار انگریزی الفاظ کو اپنی غزل میں جگہ دی۔ یہ دعویٰ اس لیے باطل ہے کہ نصف صدی پیشتر حسرتؔ موہانی اپنی غزل میں انگریزی الفاظ استعمال کر چکے ہیں۔

کس درجہ فریب سے ہے مملو
تجویز رفارم مانٹیگو

دن ڈھلا پنچھی اڑے ہنس بول کر
یار ہوٹل سے اٹھے ہنس بول کر
ناصرؔشہزاد

شیشے کے کارنس پہ دھرا ہے یہ کس کا چتر
نکلس گلے میں زلف مہکتی ہے گال پر
ناصرؔشہزاد

خلشِ غم سے مری جاں پہ بنی ہے جیسے
ریشمی شال کو کانٹوں پہ کوئی پھیلا دے
شکیب جلالی

چین تھا خالدؔ تو گھر کی چار دیواری میں تھا
ریستورانوں میں عبث کیا ڈھونڈتا رہتا ہوں میں
انور محمد خالد

ہیں فون پر کس کے ساتھ باتیں
اور ذہن کہاں بھٹک رہا ہے
پروین شاکر

اس نے ٹیلیفون کیا ہے اور کسی ساتھ
اس کا میرا سمجھوتہ ہے کون بڑھائے بات کو
(ساقی فاروقی)

☆اداجعفریؔ

اداؔ جعفری کا پہلا مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کے نام سے ۵۰ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''شہر درد'' ۶۸ء میں تیسرا ''غزالاں تم تو واقف ہو'' ۱۹۷۴ء میں اور آخری مجموعہ کلام ''ساز سخن

بہانہ ہے'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ اپنے تخلیقی عمل کے سلسلے میں آدا نے لکھا ہے'' مجھے اپنی روایت جتنی پیاری ہے۔ روایتوں سے بغاوت بھی اتنی پیاری ہے۔'' آدا جعفری ذہنی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہی ہیں۔ اس وقت اس تحریک کو برصغیر میں قبولِ عام کا شرف حاصل ہوگیا تھا۔ ادب وشاعری نئے نئے تجربات سے گزر رہی تھیں۔ اور روایت سے بغاوت کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس تحریک نے غزل کی ہیئت کو ہاتھ لگائے بغیر موضوع اور مواد کے مروّجہ نظام کو بے دخل کر دیا تھا۔ آدا جعفری کی غزلیں روایت سے بغاوت کے رجحانات کا آئینہ ہیں۔

آدا جعفری نے غزل کے روایتی رنگ اور اس کی غنائیت کے اندر سے ابھرنے والی لے اور جمالیاتی لطافت کو سنوارنے میں انہماک سے کام لیا ہے کیوں کہ یہی ان کا مزاج ہے۔ ان لفظوں کے انتخاب میں شعوری سلیقہ نظر آتا ہے۔ امیجیز بنانے کی ٹیکنیک اور حسیت ان کی غزلوں میں ایک خوابناک فضا خلق کرتی ہے۔ آدا کی شاعری میں جہاں کلاسیکی رچاؤ اور مصحفی کا رنگ نظر آتا ہے وہاں فیض کے اثرات بھی واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اندھیری راہ میں مسافر کبھی نہ بھٹکا تھا	کسی منڈیر پہ جب تک چراغ جلتا تھا
تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا	یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں
بڑے تاباں بڑے روشن ستارے ٹوٹ جاتے ہیں	سحر کی راہ تکنا تا سحر آساں نہیں ہوتا
کسی درد آشنا لمحے کے نقشِ پا سجالینا	اکیلے گھر کو کہنا اپنا گھر آسان نہیں ہوتا
ادا میں نکہت گل بھی نہ تھی، صبا بھی نہ تھی	کہ مہماں سی رہوں اور اپنے گھر میں رہوں

☆زہرہ نگاہ

زہرہ نگاہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے لکھا ہے کہ'' زہرہ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا جس میں جذبے اور احساس کی فراوانی تھی لیکن آہستہ آہستہ شعور کی کرنیں پھوٹیں اور زہرہ نظموں کی طرف مائل ہوئیں۔ ان کی شاعری میں آج کی بے چین دنیا کی بے چین روح ہے۔''

یہ اداسی یہ پھیلتے سائے	ہم تجھے یاد کرکے پچھتائے
اے شیشہ گرو کچھ تو کرو آئینہ خانہ	رنگوں سے خفا، رخ سے جدا یوں نہ ہوا تھا

دفتر منصب، دونوں ذہن کو کھالیتے ہیں	گھر والوں کی قسمت میں تن رہ جاتا ہے
میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی	وہ جو تھک کر دیر سے آیا۔ اسے کیسا لگا
تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا	ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

☆کشورناہید

کشورناہید نے ایک گھریلوعورت کے معاملات کوموضوع شاعری بنایا۔کشور کی شاعری میں ایک پختہ عمر عورت نظر آتی ہے جو گھریلو اور سماجی مسائل سے گھری ہوئی ہےلیکن جسمانی اورنفسیاتی تقاضوں سے بےخبرنہیں ہے۔

بدن کا شہر ہے سونا کہو چلا آئے   جوخواب بن کے مجھے رات بھر جگائےکبھی

کشورناہید کے بارے میں بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اگران کا جذباتی ابال کچھ کم ہوتو وہ بہتر شاعری کرسکیں گی۔ کشور ناہید کے پانچ شعری مجموعے''کلیاں'' ''دھوپ اور دروازے'' ''ملامتوں کے درمیاں'' ''بے نام مسافت''اور ''لب گویا'' شائع ہو چکے ہیں۔شہزاداحمد نے ان کے مجموعے پرتبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

> ''کشور کے شعر پڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں چولھے کے پاس بیٹھا ہوں اورمیرے اردگرد کی فضا میں خوشبو رچی بسی ہے۔''

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ	مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں
کچھ یوں بھی زرد زرد سی ناہید آج تھی	کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا
دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت	سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت
کنویں بھی ختم ہوئے پنگھٹوں کا دور گیا	یہی سبب ہے کوئی تہہ میں جھانکتا نہ ملا
تمہارے شہر کے لڑکوں کو کیا ہوا ناہید	بہت اداس ملے کوئی دل دکھا نہ ملا
چھپا کے رکھ دیا، پھر آگہی کے شیشے کو	اس آئینہ میں تو چہرے بگڑ جاتے ہیں
بند ہو در تو یہ دیوار گرا ڈالے گا	دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہے

جدیداردوغزل میں شعراء نے کس طرح سماجی وسیاسی مسائل کوشاعری کی زبان میں پیش کیا ہےاسکی چندمثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصؔر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ
ناصر کاظمی

کرم اے صر صر آلام دوراں
دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے
ناصر کاظمی

میں کیوں پھرتا ہوں، تنہا مارا مارا
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے
ناصر کاظمی

ہم سے پہلے زمینِ شہر وفا
خاک تھی کیمیا ہمیں سے ہوئی
ناصر کاظمی

سنا تو ہم نے سڑک کے اس پار پھر کوئی حادثہ ہوا ہے
کہا تو سب نے کہ ایک رہ گیر مر گیا، کون شخص تھا وہ
نیاز بدیوانی

وہ کون تھا ، وہ کہاں تھا، کیا ہوا تھا اسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

ہریار
شعاعِ حسن ترے حسن کو چھپاتی تھی
وہ روشنی تھی کہ صورت نظر نہ آتی تھی
ناصؔر کاظمی

رات آہستہ گام اُتری ہے
درد کے ماہتاب زینوں سے
آداجعفری

وہ دوستی تو خیر اب نصیب دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا
ناصرکاظمی

ہمیں سے تھا لبِ خاموش کا قرینہ بھی
ہمیں سے ٹوٹ گیا ضبط کا نگینہ بھی
ظفراقبال

پہلے یہ شوق ستاتا تھا کہ ان سے ملیے
اب یہ احساس رُلاتا ہے کہ بیکار ملے
ظفراقبال

خود ہی مل بیٹھے ہو یہ کیسی شناسائی ہوئی
دشت میں پہنچے، نہ گھر چھوڑا، نہ رسوائی ہوئی
شہزاداحمد

اپنی فضا سے اپنی زمانوں سے کٹ گیا
پتھر خدا بنا تو چٹانوں سے کٹ گیا
امیدفاضلی

کھلا یہ دل پہ کہ تعمیر بام و در ہے فریب
بگولے قالب دیوار و در میں ہوتے ہیں
عزیزحامدمدنی

کچھ کرم ہم گوشہ گیروں پر بھی فرمایا کرو
شہر میں آتے ہی رہتے ہو ادھر آیا کرو

عزیز حامد مدنی

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لیے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کرسکتے

رئیس فروغ

کل میں نے محبؔ اس کو عجب طور سے دیکھا
آنکھوں نے کم دل نے بہت غور سے دیکھا

محبؔ عارفی

اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لیے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

سلیم احمد

ہم کریں بات دلیلوں سے تو رَد ہوتی ہے
ان کے ہونٹوں کی خموشی بھی سند ہوتی ہے

مظفر وارثی

آگ جنگل میں لگی ہے سات دریاؤں کے پار
اور کوئی شہر میں پھرتا ہے گھبرایا ہوا

محسن احسان

اٹھالیتا ہے اپنی ایڑیاں جب ساتھ چلتا ہے
وہ بونا کس قدر میرے قد و قامت سے جلتا ہے

اقبال ساجد

کبھی اپنے وسائل سے نہ بڑھ کر خواہشیں پالو

وہ پودا ٹوٹ جاتا ہے جو لامحدود ہوتا ہے

اقبال ساجد

کھلی فضا میں پلے دفتروں میں سوکھ گئے

یہ لوگ پھول تھے جو فائلوں میں سوکھ گئے

تنویر سپرا

گفتگو کسی کی ہو، تیرا دھیان رہتا ہے

ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

فرید جاوید

ہے بس اب عادتوں کی خانہ پری

روح شامل نہیں شکایت میں

جون ایلیا

لے دے کے ایک لذت غم کی سبیل ہے

روئیں گے لوگ تو بھی اگر بے وفا نہ ہو

احمد فراز

دشمنوں کی آنکھ سے تجھ کو چھپائیں کس طرح

ہم خود روزن بنائے ہیں تری دیوار میں

شہزاد احمد

خیالِ یار ترے سلسلے نشوں کی رُتیں

جمالِ یار تری جھلکیاں گلاب کے پھول

مجید احمد

دروازہ کھلا ہے کہ کہیں لوٹ نہ جائے
اور اس کے لیے جو کبھی آیا نہ گیا ہو
اطہرنفیس

کیا حسن تھا کہ آنکھ لگی سایہ ہوگیا
وہ سادگی کی مار، حیا کم بہت ہی کم
محبوب خزاں

منیر اس ملک پر آسیب کا سایا ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ
منیر نیازی

اب تک ہے وہی عالم دل کا وہی رنگ شفق وہی تیز ہوا
وہی سارا منظر جادو کا مرے نین سے نین ملائے ہوئے
احمد مشتاق

میں کہ خوش ہوتا تھا دریا کی روانی دیکھ کر
کانپ اٹھا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر
احمد مشتاق

یہ مطالعہ منتخب بلکہ ایسے شعراء پر مشتمل تھا جو غزل کے حوالے سے اپنی شناخت متعین کر چکے ہیں مجھے احساس ہے کہ عصر حاضر کے بیشتر شعراء اس مطالعے کا حصہ نہیں بن سکے بطور ایک طالب علم میرا معروضہ یہی ہوا کہ نئی یا عصر حاضر کی نسل ابھی اپنی شناخت کے قیام کے مرحلے سے گزر رہی ہے لہٰذا ان کا مطالعہ اس موضوع پر آئندہ تحقیقات کا حصہ ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆

باب پنجم

جدید اردو غزل کے موضوعات

اردوغزل جہاں اپنی لطافتوں اورنزاکتوں کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوئی وہیں اسکی محدویت اورمحبوبیت سے متعلق اس پر تنگ دامانی اورگردن زدنی کے الزامات بھی لگائے گئے حالانکہ اردوغزل نے اپنی پہلی منزل پرہی اپنے آپ کومحض حسن وعشق کے دائرے سے نکال کرصوفیانہ وحکیمانہ خیالات سے مالا مال کیا۔ میؔر۔سوداؔ۔دردؔ ووغیرہ کی شاعری اس طرح کے خیالات سے بھری پڑی ہے۔غالبؔ نے آگے بڑھا کر فلسفہ حیات اوراسکے مختلف افکار سے اسکا دامن لبریز کیا اورغزل میں زندگی کے وہ رنگ پیش کیئے کہ غزل کے روایتی قارئین وشائقین دنگ رہ گئے۔اتنا سب کچھ کہنے کے باوجود غالبؔ کو یہ محسوس ہوتا رہا۔

بقدر شوق نہیں ،ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت ،مرے بیاں کے لئے

اور پھر جب ملک اور سماج پر ایک ایسا وقت آیا جب غلامی سے بیزاری اور جنگ آزادی اپنے عروج پر پہنچی اور پورے سماج میں قومیت اور سیاست کومرکزیت حاصل ہوگئی تو باطنی احساسات کی بنیاد پر پرورش پانے والی غزل خارجی دباؤ،سیاسی جبراورسماجی نشیب وفراز کی تاب نہ لا کر پس منظر میں چلی گئی۔اقبالؔ۔چکبستؔ۔اکبرؔ۔جوشؔ۔وغیرہ نے اگرچہ غزلیں بھی کہیں لیکن ان کی گرجتی چمکتی نظروں کے آگے خودانکی غزلیں ہی ؛نہیں بلکہ پوری اردوغزل لڑکھڑا گئی اورایسالگا کہ غزل کا عہد ختم ہو گیااورغزل واقعی اپنی تنگ دامنی کا شکار ہوکرروپوش ہوگئی لیکن جب ترقی پسندشاعروں کا دورآیااور اس عہد کے بعض شعراء بالخصوص فیضؔ اور مجروحؔ نے خارجی اور سیاسی موضوعات کوغزل کے نرم و نازک پیمانے میں اتارا بلکہ جذب و پیوست کیااورغزل کے تعظیم وتکریم کا پوراپوارخیال رکھتے ہوئے پہلی بار براہ راست سیاست سے اسکا رشتہ جوڑ دیا تو غزل کی وسعت قلبی فراخ دلی اور وسیع دامانی کو دیکھ کرسبھی دنگ رہ گئے۔جب مجروحؔ نے کہا۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

تو غزل میں یہ سیاسی کج کلاہی واقعی پورے بانکپن کے ساتھ سما گئی اور عام فرسودہ روایتی الزامات پر پانی بھی پھیر گئی۔ ہر چند کے یہ ایک مشکل مرحلہ تھا اورغزل کے لئے بڑا نازک دور لیکن

فیضؔ ۔مجروحؔ ۔جذبیؔ ۔مجازؔ ۔سردار جعفریؔ وغیرہ کی گراں قدر غزلیہ شاعری سے یہ مشکل مرحلہ بہ آسانی طئے ہوااور غزل کا ایک نیا دور شروع ہوا جہاں سے اردو غزل کے مختلف رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔

انگریز رخصت ہوئے ملک آزاد ہوا تو ہندوستانی عوام نے پیر پھیلا دیئے۔ایک بے مقصد اور غیر منظّم زندگی سامنے آئی معاشرہ لڑکھڑایا تو غزل بھی بہک گئی۔علامتی غزل۔آزادغزل اور کل ملا کرجدید غزل اور اب تو ابہام سے بھرا یہ دور بھی رخصت ہوا لیکن جو دور آیا وہ اپنے سابقہ دور سے زیادہ پیچیدہ اور سفّاک نکلا۔یہ تو ہونا ہی تھا۔بے مقصد اور بے لگام حرص وہوس کی زندگی کا جو انجام ہونا تھا وہ ہوا۔ترقی وتبدیلی کے نام پر ہم اس دنیا میں پہنچ گئے جہاں بے باکانہ جرائم ،بے حجابانہ سیاست کے غلام ہیں، بے رحم فرقہ واریت مذہبی تقدس کی بیڑیوں میں قید، دفتروں میں بدعنوانی اور رشوت ستانی۔علم وانصاف کے اداروں پر بے اعتمادی ، جھوٹ ، دھوکہ مکر وفریب ور پورے سماج میں لا قانونیت اوران سب پر حاوی تشدد۔تشدد اور تشدد۔اس بارودی ماحول میں انسانیت روپوش۔انسانی قدریں پارہ پارہ ۔شرافت اخلاق وفاداری قصہ پارینہ۔اصول آدرش داستانوی خیالات اور بھی بہت کچھ جس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ہم آپ صرف واقف ہی نہیں بلکہ براہ راست جھیل رہے ہیں، بھوگ رہے ہیں۔ان سب کے درمیان جن چیزوں نے سب سے زیادہ اہمیت کھوئی ہے وہ انسان کی انسانیت۔اوراس کا سب سے بڑا ہتھیار قلم اور لفظ کی عظمت وحرمت ماضی میں بھی اتھل پتھل ہوئی انسانوں کی صف کی صف صاف کر دی گئی قتل وغارت گری کے بازار گرم ہوئے ۔لیکن اس بدلی میں بھی سورج چمکا۔انقلابی واحتجاجی شاعری ہوئی۔الفاظ حرمت اور شاعری کی عظمت نے اپنا اثر دکھایا آزادی تقسیم ہند۔فرقہ واریت کے عین درمیان اردو ادب تخلیق ہوااور اسکا جادو بھی چلا جس پر آج بھی لوگ سر دھنتے ہیں اور یہ عجیب بات بھی ہے کہ اچھا ادب عام طور پر مشکلات میں ہی پیدا ہوتا ہے ایسی مشکلات کہ جس کو حل کرنا اور جس سے ٹکرا جانے کا ایک بڑا مشن نظروں کے سامنے ہوفکر کی سالمیت اور قلم کی خلاقیت اور مقصد کی انفرادیت غمزدہ ماحول میں جوش وجذبہ بھر دیتی ہے۔جس سے بڑے ادب کی تخلیق ہوا کرتی ہے۔لیکن جہاں ایسا نہ ہو، زندگی کا کوئی مقصد نہ ہوفکر ساکت اور جامد ہو ،سماج میں انتشار ہواور پورا ملک ایک مکروہ سیاست کا ننگا کھیل کھیل رہا ہو۔آدرشوں پر زرگری کا قبضہ قلم رقم کی گرفت پر ہو،تخلیق اپنی نشر واشاعت ،اظہار وابلاغ کے لئے سرمایہ داروں کا منہ تک رہی ہو لفظوں کا کاروبار ہو رہا ہو۔دھرم کے نام پر انسانوں کا قتل کیا جا رہا ہو، زبان وتہذیب کے حوالے سے نفرتوں کی دیواریں کھڑی کی جا رہی ہوں تو مشن۔وژن۔ذہن قلم وغیرہ کا گمراہ ہو جانا یا منتشر ہو جانا

کوئی غیر فطری یا حیرت انگریز نہیں لیکن شاعری تو پھر بھی ہو رہی ہے۔ادب پھر بھی تخلیق کیا جا رہا ہے عادتاًیا شاید ضرورتاً بھی۔کچھ کہا نہیں جا سکتا۔کچھ جیالے تو ہیں جو اس آندھی میں چراغ جلائے ہوئے ہیں۔آیئے ان چراغوں کی کپکپاہٹ اور تھرتھراہٹ کا سرسری جائزہ لیں۔شاید کوئی امید کی لو ہمارے ہاتھ آ جائے لیکن پہلے مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کی غزل کا ایک شعر پیش کرتی ہوں؂

جب سے انسان کی عظمت پر زوال آیا ہے
ہے ہر اک بت کو یہ دعویٰ کہ خدا ہو جیسے

اور ایک جدید شاعر نے اپنے انداز میں یوں کہا؂

گھر سے چلو تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے
کیا جانے کون پیٹھ میں خنجر اتار دے اسلم الہ آبادی

ایسی نازک پیچیدہ اور سنگین صورت حال میں اور ایسی شکستہ اور بکھری ہوئی صورتوں میں سب سے پہلے انسان کو اپنے وجود کا احساس اور اپنے تحفظ کا جذبہ بیدار ہوا۔اور یہی وجہ ہیکہ اردو کی نئی غزل میں اکثر و بیشتر اپنی ذات کی فکر۔اپنے وجود اور اسکے بقا و فنا کے سلسلے کہیں فطری کہیں منطقی اور کہیں فلسفیانہ انداز میں بکھرے ہوئے ہیں۔کہیں کہیں یہ خیال اپنی ذات کے اندرون میں ڈوب جانے پر مجبور کر دیتا ہے اور کہیں کہیں احباب کے دھوکے۔انسانیت کے فریب اپنوں کی بیگانگی۔غرض کہ انسانی رشتوں کی شکستہ حالی اور اسکے ارد گرد شاعر کو پہنچا دیتی ہے۔
چند اشعار دیکھئے؂

وہ میرا ہو کے بھی شامل ہے قاتلوں میں میرے
اس انکشاف نے تقسیم کر دیا ہے مجھے عشرت ظفؔر

نہ دوستوں کی طرح ہے نہ دشمنوں کی طرح
یہ کون لوگ صف دوستاں میں آنے لگے اکبر حمیدؔی

یہ کن عجیب زمانوں میں جی رہا ہوں میں
کہاں گئی مری آنکھوں کی روشنی ساری اسعد بدایونؔی

یہ تجربہ بھی عجب ہیکہ اپنے آپ سے میں
کوئی سوال کروں اور اداس ہوجاؤں — رئیس منظرؔ

میں آدمی ہوں مجھے آدمی نے گھاؤ دیئے
کسی چٹان میں کیسے شگاف ہوتا ہے — شاہد کلیم

وہ قصہ خواب ہوں حاصل نہیں کوئی میرا
ایسا مقتول کہ قاتل نہیں کوئی میرا — عین تابشؔ

جینے کو جی رہا ہوں مگر سوچتا ہوں میں
کیوں زندگی کے نام سے ڈرنے لگا ہوں میں — احمد محفوظؔ

ان تمام صورتوں اور بدحالیوں سے سماج کی جو اوپر اوپر کی فضاء بن رہی ہے اس میں سماجی ماحول ۔اصول وضوابط ۔نظم وضبط سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا ہے ۔خیر پر شر ۔حق پر باطل کا قبضہ ہوتا چلا جارہا ہے ۔دھوکہ فریب ۔آج کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکا ہے ۔سچائی ،سادگی ،ایمانداری ،حقیقت پسندی سب دم توڑ رہی ہیں ۔اس پر اختصادی بدحالی ۔اخلاقی پامالی ۔مستقبل کی فکرمندی ۔قتل وغارت گری ۔علحیدگی پسندی اور دیگر سماجی اتھل پتھل مثلاً صنعتی ریل پیل ،نئی طبقاتی کشمکش یا طبقوں کی نئی تقسیم اس پر پورے سماج کا مکرشلائزیشن ۔ان سب نے مل کر نئے سماج کی جو تصویر ابھاری ہے وہ بڑی ہی عجیب وغریب ہے ۔جس میں بس یہ تو صاف ہیکہ صحت منداور صالح قدروں کا زوال ہو چکا ہے ۔انسانیت مررہی ہے ۔انسانی قدروں کی پامالی اس دور کا مقدر بن چکی ہے باقی سب دھندلا دھندلا ہے اس واضح اور غیر واضح سماج کی ملی جلی تصویروں کا عکس آپکو اردو کی نئی غزل میں صاف جھلکتا دکھائی دیگا ۔چند اشعار اسی قسم کے بھی دیکھئے ۔

ہمارے عہد کا ہر شخص بے تدبیر ہے شاید
نظر میں دھند ہے پیروں میں بھی زنجیر ہے شاید — شاہد کلیم

جو تیرے شہر میں مجھ سے ملی ہے بے پردہ
وہ دوستی ہے مگر کاروبار کرتی ہے — نظام الدین نظامؔ

اب تو اس شہر میں جینے کا مزہ ہی نہ رہا
اب تو قاتل بھی کرائے کے ہیں سازش ہی نہیں — نظام الدین نظامؔ

کون نکلے گھر سے باہر کون دیکھے کیا ہوا
میرا ہم سایہ ہے خود میری طرح سہما ہوا — رئیس منظر

گھیرے ہوئے ہیں ہم کو مسائل زمیں کے
ہم سے تو آسماں کی دعا لی نہ جائیگی — عطاء الرحمٰن طارق

زمیں کے اور تقاضے فلک کچھ اور کہے
قلم بھی چپ ہیکہ اب موڑ لے کہانی کیا — عذرا پروین

لہو کی آگ میں جلتی ہیں حسرتیں کیا کیا
ہمارے ساتھ لگی ہیں ضرورتیں کیا کیا — شبیر آصف

ہر وفا اطوار اب کے بے وفا ہونے کو ہے
شہر میں یہ کیسا ہنگامہ بپا ہونے کو ہے — عین تابش

شاکی بدزن آزردہ ہیں مجھ سے میرے بھائی یار
جانے کس جا بھول آیا ہوں رکھ کر میں گویائی یار — شمیم عباس

ذہانتوں کو کہاں وقت خوں بہانے کا
ہمارے شہر میں کردار قتل ہوتے ہیں — اظہر عنایتی

راتوں کے گہرے سناٹے اب شاموں سے چھا جاتے ہیں
ہو کا عالم ہے بستی میں باتیں کرتا کوئی نہیں — اسعد بدایونی

بے سر و ساماں نکلنا گھر سے اچھا ہی رہا
راہ میں غارت گیروں کا سامنا ہونا ہی تھا — احمد محفوظ

بے بساطی بے کسی بے ساز و سامانی بھی ہے
پھر بھی جیتے ہیں کہ ہر مشکل کو آسانی بھی ہے — نسیم صدیقی

☆بے چینی اور بدحالی کا عالم

حال کی بدحالی بے چینی افراتفری تاریک مستقبل کا شدید احساس ۔۔تمام اقدار کی شکستگی اور موجودہ دور کا بے ہنگم شور کل ملا کر حال کی بے چینی کا استعارہ بن کر وہ ایسے میں ماضی کی یاد اور اسکی بازیافت اہم جز بن کر ابھری اور اردو کی نئ شاعری ریشے میں سرایت کرگئی ۔ماضی کی یہ یاد کہیں خیالات کا سرچشمہ بنتی ہے تو اکثر غزلوں کی ذمہ دار بھی ٹھہرائی جا سکتی ہے کہیں یہ واقعہ کربلا کی طرف لے جاتی ہے تو کہیں حضرت سلیمان ۔آدم زاد۔سراب اور اندھے کنویں کے طرف لے جاتی ہے ۔واقعہ کربلا سے متعلق سید محمد عقیل اپنی کتاب غزل کے نئے جہات میں لکھتے ہیں ۔۔

''ایک ذہنی انتشار و بے یقینی اور دربدری کے احساس کے ساتھ معلوم نہیں کہاں سے واقعہ کربلا کی اشاریت اور مظلومیت بھی تیزی سے داخل ہو رہی ہے،میرے لئے یہ بتانا مشکل ہیکہ نئ غزل میں یہ کیفیت کہاں سے دبے پاؤں داخل ہوئی ۔بظاہر تو کوئی بیرونی دباؤ نہیں معلوم ہوتا ۔نہ اس کیفیت میں تفاخر ہے نہ اعلان نہ ترقی یافتہ دور کی للکار ۔حالات میں پستے ہوئے ان لوگوں میں جو کربلا کی اشاریت فرات نو کے سناپر سر اور جوئے خوں کی باتیں ملتی ہیں ان میں ایک طرح کی خودکلامی ہے بس اپنے دل سے باتیں کرنے یا صلاح کرنے کی صورت ہے ۔مظلومیت ابھرتی ہے اور پھر کسی مخالف کے ظلم کا اعلان ،نہ انصاف نہ ملنے کی شکایت ۔بس جو کچھ محشرستاں شاعر کے ذہن میں موجود ہے اسکا اظہار کر دیا ہے اپنے اشعار میں'' (ص۱۵۴)

اردو کی نئ غزل میں واقع کربلا کی اشاریت یا بطور استعارہ اس کا استعمال ان دنوں کثرت سے ہو رہا ہے ۔ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک لمبی بحث ہوسکتی ہے جسکی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ۔مختصراً اسکو یوں سمجھتے چلیں کہ واقعہ کربلا کی اشاریت میں اگر ایک طرف آج کی لاچاری اور مظلومیت سے رشتہ جوڑنے کی کوشش ہے تو دوسری طرف انسانی واخلاقی قدروں کے حوالے سے غالب آنے کی ایک موہوم سی صورت یا پھر سیدھی سی یہ بات ہوسکتی ہیکہ وہ آج کے رنج وفکر امام حسین سے وابستہ کر کے قدر راحت وتسلی کی تلاش ۔یا پھر کچھ نیا پن بس اس سے زیادہ بات بنتی نظر نہیں آتی ۔لیکن یہ ضرور ہیکہ نئ غزل میں کہیں کہیں یہ ایک اچھا اور نیا پہلو ابھر کر آیا ہے جس نے کیفیت اور معنویت کی ایک نئ دنیا تلاش کی ہے ۔۔

تمام وسعت سہرائے تشنگی میری
تمام سلسلہ دجلہ و فرات مرا ——— عشرت ظفر

یہ جو بکنے کیلئے رکھے ہیں بازاروں میں
انہیں کاسوں میں کسی دن مرا سر بھی ہوگا ——— اختر لکھنوی

مجھ کو لاکھوں کی نہیں چاہت بہتر۷۲ چاہیئے
جو خدا کی راہ میں کٹ جائے وہ سر چاہیئے ——— عتیق الہ آبادی

☆ماضی کا دریچہ

اردو کی نئی غزل میں ماضی کا تعلق ایک یاد کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور بڑے کسک بھرے انداز میں۔ اچھے اور گذرے ہوئے لمحات کی یاد۔ صحت مند قدروں کی یاد۔ رشتوں اور وفاؤں کی یاد۔ غزل میں یہ سب کچھ کہیں کہیں پر کشش انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔

رکھتے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے ——— اظہر عنایتی

گذر گئے ہیں جو موسم کبھی نہ آئیں گے
تمام دریا کسی روز ڈوب جائیں گے ——— آشفتہ چنگیزی

ماضی کی یہ کسک شاعری کا ایک حصہ تو ہے لیکن بڑا حصہ نہیں اور سچ تو یہ ہیکہ نئی غزل کوئی بھی خیال، کوئی بھی احساس شاعری کا بڑا حصہ بن کر نہیں ابھرتا اگر چہ ان نئی غزلوں حالیہ سماج کی ایک سے ایک دل خراش تصویریں ہیں اگر ایک طرف خوف اور دھویں کا حبس تو دوسری طرف روایتی طور پر صحیح حسن و جمال کی شبنمی ٹھنڈک ہے۔ حسن و عشق کے روایتی اذکار مختلف پیرایۂ اظہار کے ساتھ اس لئے نئے دور کی تمام اشیاء کے ساتھ ساتھ عشق بھی نیا اور اسکے انداز بھی نئے کے جمالیات کا تصور بہر حال اقتصادیات اور معاشیات سے براہ راست وابستہ رہتا ہے اور ساتھ ساتھ تاریخ اور جغرافیہ سے بھی ایسی ہنگامیت میں قلب اور واردات قلب کا ذکر طرح طرح سے کیا گیا ہے لیکن تمام ذکر بس رکے رکے اور ڈرے سے ہیں۔ چند اشعار اس رنگ کے بھی دیکھیئے۔

دھوپ اتنی تھی کہ جلتے ہیں گلابوں کے بدن
قہر اتنا ہیکہ ہونٹوں پہ لگے ہیں کانٹے — نیاز حسینؔ

ہوا کے ہاتھ بھی پیغام وہ اگر بھیجے
خیال بن کے بھی اس کے نگر نہ جاؤں گا — انور محمودؔ

ہجر کے صحراء میں تیری یاد کا کتنا غبار
ایک مسافر بے سر و سامن و تنہا میرا دل — شہباز نقویؔ

اکثر تیری یادیں ہی اپنا سرمایا ہوتی ہیں
اکثر تیری یادوں سے ہم کترانے سے لگتے ہیں — شعیب نظامؔ

اب کسی پاؤں کی آہٹ بھی نہیں آتی ہے
چھپ گئے میرے غزالان سبک گام کہاں — اصغر مہدی ہوشؔ

حسن و عشق۔درد و کرب کے درمیان سے نکلتی ہوئی یہ راہ نئی شاعری کا کونسا جمالیاتی تصور و تغزل پیش کرے گی ابھی سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔پروفیسر عقیل صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

''شاید نئی نسل کے پاس ''تغزل'' کچھ ہے ہی نہیں وہ صرف معشوقوں کی حوالوں سے اپنی بات اور اپنی زندگی لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔''

بہرحال متذکرہ بالا سمتوں میں رواں دواں اردو کی نئی غزل جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ کسی مخصوص سمت کا تعین نہیں کرتی۔غزل مین ویسے بھی پروجیکشن کے امکانات کم ہوتے ہیں بس ایک اشاریہ ہی تیار کیا جاسکتا ہے کسی مخصوص سفر اور راہ کی طرف مشکل سے ہی اشارہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے اندیشوں اور امکانات پر حتمی باتیں کی جاسکتی ہیں۔

ایک سوال ضرور اٹھانا چاہتی ہوں وہ یہ کہ کیا وجہ ہیکہ جدید دور میں کرب و الم،درد و ستم ۔تنہائی و ویرانی۔لاچاری و بے بسی۔حبس و گھٹن کے باوجود۔نئی غزل بے چینی و بے کیفی کی لہر تو ہے لیکن احتجاج کی گونج نہیں۔احتجاج تو درکنار مزاحمت بھی نہیں اور حد یہ کہ غزل کے اسلوب میں وہ روایتی شکوہ و شکایت بھی نہیں ہے جس سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔معشوق کے جور و ستم کی

شکایت ۔شیخ و ناصح کی شکایت ۔آسمان کی چشم فریب تقدیر کی شکایت ۔نئی غزل سے روایتی شکایت کا چلن کیا روٹھا۔مزاحمت کا لہجہ روٹھ گیا۔جبکہ ایسے حالات میں نئی غزل کا مزاحمتی لہجہ اسکا ایک اہم لہجہ ہونا چاہیئے ۔

☆ہجر و وصال

جدید غزل میں ہجر و وصال کا ذکر ایک پیش پا افتادہ موضوع ہے ۔کلاسکی غزل سے لیکر جدید غزل تک ہجر جانکسل اور اذیت ناک لمحوں سے عبارت سمجھا جاتا تھا اور لمحہ وصال باعث سرخوشی اور مطبوع خاطر کیفیت کا غماز سمجھا جاتا ہے ۔فراخ نصیب عاشق کی قسمت میں ''ہجر'' کی صعوبتیں لکھی ہوتی ہیں اسطرح اردو شاعری میں ہجر اور وصال دو مختلف بلکہ متحارب کیفیات کے آئینہ دار سمجھے جاتے تھے تاہم مابعد جدید غزل میں ہجر اور وصال کی حیرت انگیز یکجائی نظر آتی ہے اور اب انہیں الگ الگ خانوں میں منقسم نہیں کیا جاتا بلکہ نیا شاعر ایک کے وسیلے سے دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ہجر اور وصال کا یہ اتصال ذات کا شناس نامہ بن کر ابھرتا ہے اور ہجر اور وصال کی تقسیم بے معنی اور بے سود نظر آتی ہے ۔

راستو کیا ہوئے لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب یہ کہتے تھے کہ جیتے رہیئے
اظہر عنایتی

چراغ روشنی لیتے تھے جن کی صورت سے
وہ لوگ خاک ہوئے درد کی نہایت سے
توصیف تبسم

موسم گل سے کم نہ تھا موسمِ انتظار بھی
شاخ پہ برگِ آخری رقص کناں بہت ہوا
عرفان صدیقی

ہجر و وصال چراغ ہیں دونوں تنہائی کے طاقوں میں
اکثر دونوں گل رہتے ہیں اور جلا کرتا ہوں میں
فرحت احساس

دو الگ لفظ نہیں ہجر و وصال
ایک میں ایک کی گویائی ہے
فرحت احساس

وصل کے موسم ہوں یا ہوں ہجر کی راتیں
اب ہمیں لگنے لگے ہیں سارے منظر ایک سے
مہتاب حیدر نقویؔ

شمس الرحمن فاروقی نے سوغات میں شائع اپنے مضمون ''غزل کا نیا منظر نامہ'' میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ نئی نسل اب کسے ایجاد کرے ۔ کیونکہ میر اور غالبؔ تو ایجاد کئے جا چکے ہیں ۔ فاروقی صاحب نے آخر میں اس سوال کا جواب بھی خود ہی دیا ہے اور لکھا کہ ''قدیم اردو یعنی دکنی اور میر کے ذرا پہلے کے دلی والوں اور غالب کے ذرا بعد کی لکھنؤ کی غزل سے کچھ حاصل کرنے کی صلاحیت ہم میں ہے کہ نہیں، حاصل کرنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ چند لفظ حاصل کر لیے جائیں جیسا کہ بعض لو گوں نے میرؔ کے ساتھ کیا۔ میرا مطلب یہ ہیکہ ان لوگوں کے طور طریقے دیکھ کر غزل کی لچک میں اضافہ کرنے کا فن سیکھا جائے ۔ نئی نسل شاید یہ کام کرے شمس الرحمن فاروقی کی بظاہر رائے مابعد جدید غزل کے مطالعے کے بعد بالکل درست اور صائب معلوم ہوتی ہے۔ مابعد جدید غزل محض میرؔ کے ہاں سے متروک لفظ اور غالبؔ سے استعارہ سازی اور پیکر تراشی کے ہنر سیکھ رہی ہے، بلکہ متروک اسالیب بیان شدہ لہجوں کی بازیافت بھی کر رہی ہے کہیں کہیں نسائی اظہار کا رنگ بھی چمک اٹھتا ہے اور کہیں طریقہ الفاظ بالکل لکھنؤ کے شعراء کی یاد دلاتا ہے ۔ لکھنوی شاعر کو محض نسائی اظہار یا انفعالی لہجہ سے عبارت سمجھنا ایک نوع کی سادہ لوحی ہے اصل چیز زبان کا برتاؤ اور الفاظ کا انتخاب ہے۔ مابعد جدید غزل کے درج ذیل اشعار سے نہ صرف لکھنؤ کے بعض قدیم شعرا کے رنگ سخن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نئی نسل گم شدہ اسالیب اور وصفوں کے حوالے سے بھی اپنی پہچان متعین کرانے کی جہد میں مسلسل مصروف ہے۔

ایسا تو نہیں کہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی
جو بات میرے دل میں تھی وہ بات نہیں ہوئی
کب تک یہ سوچ سوچ کہ ہلکان ہوجیئے
اب تک تری طرف سے شروعات نہیں ہوئی
عرفان صدیقیؔ

آنکھیں ہیں چکا چوند یہ جھلمل تو لکھوں گا
میں تیرا سراپا نہ سہی تل تو لکھوں گا

کیا شرط لگادی کہ ترا ذکر نہ آئے
لیکن کہیں دشمن ،کہیں قاتل لکھوں گا — آشفتہ چنگیزی

میرے اللہ میری وحشتوں میں بھی کمی ہو
کہ ویرانوں کو اب بستی بنایا جا رہا ہے — مہتاب حیدرنقوی

وہ جان کے مجھ سے ہی انجان ہو کتنا
میں شہر تمنا میں ہلکا ہوا کتنا — احمد محفوظ

مرانالہ فلک کی عظمت سے جاملا ہے شاہدا ے شہپر
سحرنم ہے فضا چپ ہے کہ دھانی گھاس کے عارض پہ آنسو — احمد محفوظ

☆غزل میں جمالیاتی اظہار

جدید غزل کو جمالیاتی احساس سے عاری قرار دینے سے ادبی بددیانتی کا احساس ہوتا ہے کہ جدید غزل کے برخلاف موجودہ غزل تو جمالیاتی تجربوں کے فنکارانہ اظہار سے منور اور متشکل ہوتی ہے، یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ جنسی جبلت زیریں لہر کی صورت ابھرتی ہے۔جدید غزل میں جمالیاتی تجربہ گہرے ارضی احساس کے باوجود ایک نوع کی ارتفاعی کیفیت کا احساس کراتا ہے اور جنسی اظہار تو بارہ پتھر دور ہی رہتا ہے۔

لو دے اٹھا ہے دست دعا پر شفق کا رنگ
تیری ہتھیلیوں پہ حنا ہوگئی ہے شام — عرفان صدیقی

ہر رنگ ماند تھا اس کے آگے
میں لے کے جہاں دھنک گیا تھا — اکبر عرشی زادہ

صرف دو آنکھیں ہیں اس کے جسم پر
اس غزل ، اس پیکرِ سادہ کے نام — مہتاب حیدرنقوی

سڑک پر چلتے ہوئے آنکھیں بند رکھتا ہوں
ترے جمال کا ایسا مزہ پڑا ہے مجھے — آشفتہ چنگیزی

جدید غزل کے جذبات کو برانگیخت کرنے والی صنف قرار دینا زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے اکثر شعراء نے مخلوط حسی پیکر استعمال کر کے حواس خمسہ کی مختلف جہتوں کو بیک وقت گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ کہیں بصری پیکر سماعی پیکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور کہیں تجرید تجسیم کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

آنکھوں نے دیکھتے ہی اسے غُل مچادیا
طے یہی ہوا تھا کہ رونا نہیں ہے آج — فرحت احساس

وہ بھیڑ ہے کہ بدن لمس کو ترستے ہیں
وہ شور ہے کہ سماعت کو کانپتا دیکھیں — آشفتہ چنگیزی

روشنی اس کے خیالوں میں کچھ ایسی ہے کہ بس
دھیان آئے تو ہر ایک راہ منور دیکھوں — مہتاب حیدرنقوی

مابعد جدید غزل میں عام انسانی محسوسات یا تجربے میں ایک غیر متوقع عنصر داخل کر کے اسے زیادہ قابل قبول اور وقیع بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور شعر محض ردعمل کا سفر کی سطح کو مس نہیں کرتا بلکہ مزید معنوی امکانات کی راہ ہموار کرتا ہے۔

اے خدا میری رگوں میں دوڑ جا
شاخ دل سے اک ہری پتی نکال — فرحت احساس

ستم یہ تھا کہ میں اس کا بدل بھی
اس سے ملتا جلتا ڈھونڈتا تھا — شارق کیفی

گذر گئے ہیں جو موسم کبھی نہ آئیں گے
تمام دریا کسی روز ڈوب جائیں گے — آشفتہ چنگیزی

نئی غزل کے مذکورہ شعرا نے عام انسانی رویوں کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا ہے اور عام ردعمل سے گریز کرتے ہوئے مفہوم کی ایک نئی جہت دریافت کی ہے گردش ماہ وسال حافظہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور اکثر اولاً نام ذہن سے محو ہوتا ہے تاہم شکل ذہن میں محفوظ رہتی ہے اس عام انسانی تجربے کا

شعری اظہار ملاحظہ کریں۔

وہ دن بھی کیا ستم مجھ پہ ڈھا کے جائے گا
جب اسکی شکل نہیں نام دھیان میں آئے گا — شارق کیفی

تیرا چہرہ بالکل یاد نہیں آتا
بیچ میں جانے کیسے کیسے سائے ہیں — مہتاب حیدر نقوی

☆شخصی واردات کا اظہار

جدید غزل کے ان امتیازی پہلوؤں سے قطع نظر اس کی فرد جرم پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے اس اعتراض کا تو تفصیلی جواب دیا جا چکا ہے کہ جدید غزل پہچان سے عاری اور یکسانیت سے گرانبار ہے۔سید محمد عقیل کے نئی غزل پر مضامین تضاد بیانی اور منتشر خیالی کے باعث بے ترتیب ہو گئے ہیں۔فاضل ناقد نے سایہ،تنہائی ،اندھیرا،روح کا کھوکھلا پن ،سورج ،پیڑ ،پانی ،ریت،کیچڑ اور پتھر کو جدید غزل کی محبوب علامتیں قرار دیا ہے۔اس فہرست میں روح کا کھوکھلا پن اور تنہائی کو شامل کرنا لائق توجہ ہے۔پیڑ ،پانی،ریت ،پتھر علامتیں ہیں یا محض sing اس بحث سے قطع نظر عرض یہ کرتا ہے کہ تنہائی اور روح کا کھوکھلا پن کے لئے کوئی بھی علامت وضع کی جا سکتی ہے نہ کہ یہ فی نفسی علامات ہیں اگر یہ علامت ہیں تو کسی چیز کی روح کا کھوکھلا پن اور تنہائی کا احساس وغیرہ عام انسانی محسوسات ہیں جن کی ترسیل کے لیے علامتیں وضع کی جا سکتیں ہیں۔نئی غزل میں معنوی تفہیم تیزی سے واپس آ رہی ہے۔معنوی تفہیم کی ترکیب محل نظر ہے تفہیم تو قاری کا عمل ہے نہ کہ فی نفسہ متن کا اسی طرح طرز خواندگی کو نہ تو کسی مخصوص دور کی غزل کا رجحان دیا جا سکتا ہے اور نہ صرف اس حوالے سے شاعری کی تعین قدر کی جا سکتی ہے۔نئے غزل گویوں میں طرز خواندگی کا زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔

جدید شعراء نے جدید انسان کے ذہنی اور روحانی دکھوں کی نشان دہی کی لیکن تلاش درماں کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔مابعد جدید غزل گو نے جب زمین سفاک سے رشتہ استوار کر لیا ہے تو اسے جینے کا ہنر بھی آنا چاہیئے ۔چنانچہ کسب ہنر کے لیے وہ اپنے ثقافتی ورثے کی طرف متوجہ ہوتا ہے جہاں کردار اور اقدار کا وہ نظام موجود ہے جس کے ذریعے وہ سفاک صورت حال کا مقابلہ کر سکے۔چنانچہ

ثقافتی حوالے اس غزل میں فیشن کے طور پر نہیں آتے جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے یہاں اظہاری سطح پر ایک بات قابل غور ہے ۔ کچھ اقداری سروکار ایسے ہیں جو ان شعراء کو بعض نمائندہ لوگ اور مذہبی کرداروں سے اپنے آپ کو مشابہ کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں ۔اس میں یہ دکھانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ بھی ان کرداروں کی طرح ابتلا کی زد میں ہیں ۔ایہ ابتلا ایک المناک وقار کا اشاریہ بھی ہوتی ہے ۔ یہ کرداری تطبیق ترقی پسند شعراء کے ہاں مسیح وصلیب کے حوالے سے موجود ہے ۔مگر مابعد جدید غزل میں مسیح وصلیب کے پیکر نہیں ابھرتے ۔شاید اس کی وجہ یہ ہیکہ اس کے تہذیبی حوالے کہیں اور ہیں ۔،اس کے برخلاف جدید غزل گویوں کے ہاں اظہار یا تجربے یا دونوں کی سطح پر علاحدگی کا احساس موجود رہتا ہے ۔اوپر جو کچھ کہا گیا اس کی وضاحت کے لیے مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔

طویل ہونے لگی ہیں اسی لیے راتیں
کہ لوگ سنتے سناتے نہیں کہانی بھی
شہریار

صبح تلک جینا تھا سو ہم نے بات کو کیا کیا طول دیا
اگلی رات کو پھر سوچیں گے اگلا موڑ کہانی کا
عرفان صدیقی

حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں
شہریار

سنو! چراغ بجھادو تمام خیمے کے
مرے عزیز شب امتحاں کی زد میں ہیں
اسعد بدایونی

اس پیرایۂ اظہار سے نہ صرف شخصی داخلی وابستگی کو تقویت ملتی ہے بلکہ ہمیں جدید و مابعد جدید شعر میں فرق کرنے کا ایک آسان طریقہ بھی آتا ہے ۔اسی طرح سب کو معلوم ہے کہ ترقی پسند شاعری میں ہاتھ ایک اہم موٹیف کی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہاں اس کے تمام انسلاکات دست محنت کش کے حوالے سے آئے ہیں ۔ مابعد جدید غزل میں ہاتھ کا موٹیف بار بار ظاہر ہوتا ہے ۔لیکن یہاں اس کا حوالہ بھی مختلف ہے اور اس کا تفاعل بھی ۔ چنانچہ ترقی پسند شاعر ایسے شعر نہیں کہہ سکتا ۔

ہم نے اپنا دست سوال قلم کر ڈالا ہے
ہم سے شاہ گداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
اسعد بدایونی

یہی کٹے ہوئے بازو علم کیے جائیں
یہیں پھٹا ہوا سینہ سپر بنایا جائے — اسعد بدایونی

تیغ ستم کے گرد ہمارے خالی ہاتھ حمائل تھے
اب کے برس بھی ایک کرشمہ اپنے دست کمال میں تھا — عرفان صدیقی

ایسے موقعوں پر ترقی پسند شاعر دست بریدہ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔اس کے یہاں صرف دست ستم ہی کٹ سکتا ہے۔

اسی طرح شجر بھی سامنے کا لفظ ہے۔اس کا استعمال قدیم غزل میں بھی ہوا ہے اور جدید غزل میں بھی۔لیکن جو وسیع معنویت اسے مابعد جدید غزل میں حاصل ہوئی ہے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔اس کی پہلی صفت تو یہ ہے کہ یہ نقل مکانی کو قبول نہیں کرتا۔دوسرے کی قوت نمو اپنی زمین سے حاصل کرتا ہے۔اسکے لئے خاج کا محتاج نہیں ہوتا۔تیسری بات یہ کہ بہاروں خزاں سے خود کو ہم آہنگ کرتا رہتا ہے۔ان تینوں خصوصیات اور اپنی دیگر تعلیقات کے ساتھ یہ لفظ اتنی مختلف جہتوں سے استعمال ہوا ہے کہ اب گویا مابعد جدید غزل کا خاص لفظ بن گیا ہے۔

اجاڑ دشت میں کچھ زندگی تو پیدا ہو
یہ ایک چیخ یہاں بھی شجر کروں گا میں — عرفان صدیقی

یہ کس نے دستِ بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخل دعا نکل آئے — عرفان صدیقی

ہم کو پسند آ گیا ساحل کا مشورہ
کشتی کی لکڑیاں تھے شجر ہو کے رہ گئے — اسعد بدایونی

آئے ہیں برگ و بار درختوں کے جسم پر
تم بھی اٹھاؤ ہاتھ کے موسم دعا کا ہے — اسعد بدایونی

دعا کرو کہ سلامت رہے شجر کا بدن
بہار برگ و ثمر آتی جاتی رہتی ہے — عرفان صدیقی

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان شعراء کے ہاں نہ صرف شخصی داخلی وابستگی پر اصرار ملتا ہے بلکہ لوگ اور نمائندہ مذہبی کرداروں سے خود کی شناخت کرنے کا واضح رجحان بھی ملتا ہے۔ مابعد جدید غزل کے یہی امتیازی عناصر اسے ترقی پسند غزل اور جدید غزل سے ممتاز و ممیّز کرتے ہیں۔ مزید برآں بعض مستعمل مواد مثلاً ہاتھ اور شجر مابعد جدید غزل میں نئی اور معنی خیز معنویت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے عرفان صدیقی ،آشفتہ چنگیزی ،مہتاب حیدر نقوی،فرحت احساس،اور اسعد بدایونی کی غزل با آسانی شناخت کی جا سکتی ہے۔

☆ فرقہ وارانہ فسادات

دور جدید کی غزل کے موضوعات میں فرقہ وارانہ فسادات سماجی ظلم اور نا انصافی ،کربلا ،ہجرت ،ذاتی غم ،کرب ذات اور انکشاف ذات،تنہائی ،مسرت اور شادمانی کے جذبات ،داستان حسن و عشق ''موت'' اور تخلیق سفر کے موضوعات شامل ہیں۔ اور پھر کچھ تکراری اور مخصوص شعری پیکروں اور استعاروں کی مدد سے جو اس دور کی غزل میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اس دور کی غزل کے بعض اہم پہلوؤں اور مخصوص کیفیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان شعری پیکروں اور استعاروں میں آئینہ ،خواب اور شکست ،شہر ،جنگل،سہرا،سمندر ،خزاں،دریا اور زمین وغیرہ شامل ہیں۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ موضوعات اور شعری پیکروں کے سلسلے میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان کے کچھ اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس سیاق وسباق میں ان کے صرف ایک یا دو پہلوؤں ہی پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

جدید غزل کا غالباً سب سے زیادہ نمایاں اور تکراری موضوع فرقہ وارانہ فسادات ،دہشت گردی کے واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل اور کیفیات ہیں جسے اس دور کے غزل گو شعرا نے بڑی معروضیت ،حسّاسیت ،دردمندی اور کہیں کہیں بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے اور اس کے پیرایۂ اظہار اور شعری اسلوب میں کافی تنوع بھی ہے۔ کیونکہ ہر شاعر نے اسے اپنے ہی انداز سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ لیکن اس کے اکثر نمونوں میں خلوص اور دردمندی کے گداز کے ساتھ ذاتی المیے کی تڑپ کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور کہیں ان تاثرات کی شدّت اور انفرادیت نے انھیں ایک علامتی بعد بھی دیا۔ چند اشعار پیش کرتی ہوں۔

ساری بستی ہماری جلادی گئی
بے گناہی کی کیسی سزا دی گئی
راشد صدیقی

مرا مکان گھر تھا لپکتے شعلوں میں
پگھلتی آگ کے نیچے لہو کا دریا تھا
سیف سہسرامی

زمیں کی کوکھ سے خوف و ہراس کا موسم
بریدہ لاشوں کی فصلیں اگانے والا ہے
سلطان اختر

جس طرف دیکھو کوئی بستی جلی ہے
دیش میں اب کے ہوا کیسی چلی ہے
گرجا دیاس

آج یہ کس نے لکھ دی ہے
صبح کے رخ پر شام کی بات
ملبہ ، ملبہ کندہ ہے
چیخوں کی کہرام کی بات
ظہیر غازی پوری

یا پھر ان دردناک واقعات کا یہ کسی قدر وسیع منظر نامہ جس میں جذبات کی شدت اور لہجے کی انفرادیت نے ایک علامتی عنصر بھی پیدا کیا۔

دھویں میں در و بام کھونے کا منظر مرے سامنے ہے
مرے شہر کے خاک ہونے کا منظر مرے سامنے ہے
کہیں رات کی سسکیوں کی صدائیں میں سنتا رہا ہوں
کہیں صبح خون رونے کا منظر مرے سامنے ہے
یہ ڈر ہے یہاں کھیتیوں میں بس بھوک ہی اگ سکے گی
زمینوں میں لاشوں کے بونے کا منظر مرے سامنے ہے
مخمور سعیدی

اب ملاحظہ کیجئے کرفیو کے چند مناظر، ہیبت ناک سناٹا، وحشت اور اس صورت میں تمام انسانوں کی بے بسی اور بے نوائی۔

گھر ، گلی ، بازار سب خاموش ہیں
ایک سناٹا جو ہر سو بولتا ہے　　عابد کربائی

گونج رہی ہیں گلیاں سناٹے کی چیخوں سے
اب کے برس اندھے موسم نے ہر دامن نمناک کیا　　خورشید افروز

اور پھر اس صورت حال سے پیدا ہونے والے خوف و دہشت اور بے یقینی کا ایک سیدھا سادہ اور بے ساختہ اظہار

ابھی نکلو نہ گھر سے تنگ آ کے
ابھی اچھے نہیں تیور ہوا کے　　فراق جلالپوری

☆ انتشار کا عالم

جدید اردو غزل میں اوّل مشینی تہذیب کی ترقی کے نتیجے میں معاشرتی انتشار کی المناکی کا اظہار۔ یہ اظہار نئے شعراء کے یہاں کثرت اور تواتر کے ساتھ ملتا ہے، وہ شخصی طور پر معاشرے کو انتشار اور تباہی کی زد میں دیکھ کر متردد ہوتے ہیں ان کا تردد ان کے عصری سچائی پر دلالت کرتا ہے ،مگر ان کا ردِعمل بالعموم فوری نوعیت کا رہتا ہے، یہ بات نہیں کہ معاصر فی صورت حال کے بارے میں ان کا رویہ سنجیدہ نہیں ہے، وہ پوری سنجیدگی سے بدلتے حالات کا جائزہ لیتے ہیں، اور انسانی اقدار پر ان کے دوررس اثرات پر غور فکر بھی کرتے ہیں ،مگر یہ ذہنی رویہ ان کی شخصیت کے پیچیدگیوں سے گہرے طور پر مربوط نہیں ہونے پاتا، فضا ابن فیضی اس کی مثال ہیں۔

تمام معاصر شعراء، خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے، اس کی زد میں آتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں کے گنے چنے اشعار ہی اس کی تردید کرتے ہیں، نہیں تو غزلوں کی غزلیں کلام منظوم کا پلندا ابن کے رہ جاتی ہیں۔ جدیدیت کی دھن میں عصری غزل سے تخلیقی فضا کے اخراج کی یہ صورت حال تشویش ناک ہے۔ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک امر یہ ہے کہ مروجہ خیالات کو چابکدستی سے نظمانے کا عمل فیشن بن کر رہ گیا ہے، آئے دن اس میں یا شعری مجموعوں میں ایسی بیسیوں غزلیں نظر آتی ہیں، جو تنہائی، محرومی، یا برگشتگی کے مروجہ استعارات کے منظوم بیان کے سوا کچھ نہیں، افسوس یہ ہے کہ جدید تر نسل کے بعض باصلاحیت افراد بھی اس کے دام اثر میں آ گئے ہیں۔

دوم شعور عصر کی تخلیقی صورت گری کا رویہ، گو یہ رویہ معاصر شعراء کے غزلوں کے بہت کم اشعار میں ملتا ہے، تاہم اس کی اہمیت مسلم ہے۔ موجودہ عہد میں جب کہ نظم کی صنف خاصی مقبولیت حاصل کررہی ہے، یہ رویہ صنف غزل کی بقا اور معنویت کا جواز بھی فراہم کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعراء فکری طور پر شعور کی تاریک آگ کی لپیٹ میں ہیں، اوران کے دل و دماغ پر جمی ہوئی بات جذبائیت اور تکلف کی دبیز تہیں پگھل رہی ہیں، اس آگ کی تیز روشنی میں مذہب، اقدار، جنس ذات اور فن کی اصلیت نمایاں ہورہی ہے۔ بانی کی غزلیں اس مکاشفانہ رویے کی مثال ہیں۔

دکھا کے لمحۂ خالی کا عکس لا تفسیر   یہ مجھ میں کون ہے، مجھ سے فرار کرتے ہوئے

جدید غزل گو شعراء میں فاروقی، محمد علوی اور شہر یار کے اشعار میں بھی عصری آگہی کی تخلیقی تشکیل کا یہ حاوی رویہ ملتا ہے۔ دوسرے شعراء کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

تم سے بچھڑا ہوں تو سینے میں اتر آیا ہے   ایسا سناٹا کسی پیڑ کا پتہ نہ ہلے

زبیر رضوی

کوئی نہیں تھا اپنی ہی آواز کے سوا   چاروں طرف سن کے صدائیں جرس گیا

بشر نواز

ریت میں سر تو گاڑ دیئے   لیکن اس سے کیا ہوگا

مظفر حنفی

کھلی جو آنکھ تو کیا دیکھتا ہوں منظر میں   چہار سمت سمندر ہے اور ششدر میں

زیب غوری

آنکھوں میں چمک، چہرے پر کچھ آب تو آئے   تعبیر جداگانہ سہی، خواب تو آئے

عتیق اللہ

اب اور کیا تجھے اے شہر نارسا دوں گا   بس ایک آنکھیں بچیں ہیں انھیں بجھا دوں گا

آشفتہ چنگیزی

جدید غزل گو شعراء میں شعور کی دہشت نا کی کی تخلیقی بازیافت کا عمل اور تواتر کے ساتھ فاروقی کے یہاں ملتا ہے۔ان کے یہاں یہ ایک مستقل ذہنی میلان بن جاتا ہے، وہ خواب آرزو اور عشق کے رومانی تصورات سے دستبردار ہوکر زندگی کے بنیادی حقائق مثلاً رفتارِ عمر، شکست اور تباہی سے ذہنی وابستگی کا احساس دلاتے ہیں اور حقیقت کے تضاد اور لایعنیت کو اپنا مقدر تسلیم کرتے ہیں، وہ اپنے آپ کو اسیر حلقہ قول محال سمجھتے ہیں اور بازدید شب مے کو حدِ امکاں سے خارج قرار دیتے ہیں۔

ہر طرف سر بہ فلک سرخ بگولوں کے ستوں
بازدید شب مے ، اب حد امکاں میں نہیں

اس لحاظ سے وہ کمار پاشی، ندا فاضلی، زیب غوری، پرکاش فکری، مخمور سعدی، اور منصور سبز واری سے نسبتاً زیادہ گہری آگہی کے ساتھ حقیقت سے ٹکرانے کی قوت رکھتے ہیں۔ وہ تحفظ ذات سے بیگانہ ہوکر ذہنی ناوابستگی کے ساتھ تضادات کا سامنا کرتے ہیں، یہ تضادات ان کے لیے نیرنگ تماشا بن جاتے ہیں لیکن محمد علوی کی طرح انہیں یہ تماشا دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی وہ اس کی ناگزیریت کو دیکھ کر تفکر آمیز یاسیت اور توکلانہ مخرونیت کو محسوس کرتے ہیں۔

آنکھوں میں روشنی کی جگہ تھا خدا کا نام
پاؤں تڑا کے مر رہے ، جاتے کہاں جناب

فاروقی ، باقر مہدی یا عمیق حنفی کی طرح تخلیق شعر کے لیے خارجی محرکات کے منتظر نہیں رہتے ، وہ شہر یار کی طرح اپنی ذات کی طرف رجوع کرتے ہیں، تخیئلی وسعتوں میں وقوع پذیر نادر ، متحرک اور حیرت انگیز سیمیائی واقعات کی شناخت کرتے ہیں۔اوران کی صورت گری کے لیے ترجیحی طور پر استعاراتی عمل کو روا رکھتے ہیں۔اس عمل سے خاطر خواہ استفادہ کر کے وہ تجربے کے متضاد عناصر کی تطبیق کا کام کرتے ہیں۔

سایہ ابلق شجر گھات میں چشم نیم وا
پاؤں جہاں تھے جم گئے ، ہوش فرار کس کو تھا

محمد علوی گھر کے اندر اور باہر کی دنیا کو ایک نووارد سیاح کی متجسس نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور حیر ت زدہ رہ جاتے ہیں، ان کا ذہن عادت، رسم اور روایت کی زنجیروں کی شکست کر کے آزادی، تفحص

اوراپج کے ساتھ اشیاء مظاہراوراشخاص سے رابطہ قائم کرتا ہے اس لیے ان کو پرانی چیزوں میں بھی نئے پن اور ندرت کا کوئی نہ کوئی پہلونظر آتا ہے،اس دنیا کی نادرہ کاری ہی اس کی تخئیلیت پر دلالت کرتی ہے۔

کھڑے ہیں بے برگ سر جھکائے　　ہوا درختوں کو چر گئی ہے

دیکھ دریا میں پڑا ہے آسماں　　چھوڑ کر اب یہ زمیں جاؤں کہاں

میں اپنے آپ سے ڈرنے لگا تھا　　گلی کا شور گھر میں آگیا تھا

ان مکانوں میں کوئی بھوت بھی ہے　　رات کے وقت پکارا جائے

جس میں جی رہا ہوں وہ کمرہ عجیب ہے　　کھڑکی کھلی نہ ہو تو نظارے دکھائی دیں

نہ جانے کون گزرا ہے یہاں سے　　ابھی تک لوگ رستے پر کھڑے ہیں

دھوپ نے گذارش کی ہے　　ایک بوند بارش کی

جدید شاعر ندا فاضلی کا مسئلہ یہ ہیکہ وہ دیہی زندگی کی فراغت،معصومیت،ایمانداری کو شہری زندگی کی کاروباریت،شاطری اور بے ایمانی سے متصادم ہوتے ہوئے دیکھ کر اذیت آشنا ہوتے ہیں۔

چراغ جلتے ہیں بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشان نہیں ملتا

ندا فاضلی موجودہ انسان کی بے گھری،جبلتوں اور رشتوں کی پامالی اور قدروں کے انتشار کو دیکھ کر اپنے گہرے ردعمل کی پیکر تراشی کرتے ہیں۔

گھر سے نکلے تو ہو،سوچا بھی کدھر جاؤ گے　　ہر طرف تیز ہوائیں ہیں، بکھر جاؤ گے
یہ کیا عذاب ہے سب اپنے آپ میں گم ہیں　　زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا

باقر مہدی بھی کم وبیش ایسے ہی مسئلے سے دوچار ہیں۔ان کی غزلوں میں ایک غصہ ور ضدی انقلاب پسند شخصیت ابھرتی ہے،وہ خارجی میکانکی حالات اور سیاسیات کے تغلب کے نتیجے میں شکست خوردگی کے شکار ہے،ندا فاضلی موجودہ میکانکی معاشرے سے انسانیت کے اخراج کے شعور کے نتیجے میں بیزاری اور الجھن کے احساسات سے دوچار ہیں۔

دھوپ کملائی ، جھمیلے کھو گیے شام ہوتے ہی اکیلے ہوگئے
اب کسی سے بھی شکایت نہ رہی جانے کس کس سے گلا تھا پہلے

جب کہ باقر مہدی کے یہاں آرزو کے موہوم سے لے کر مخروطی، تشنج اور پچھتاوے تک کے احساسات جھلکتے ہیں۔

سورج کے تعقب میں ایک عمر گنوائی کرنوں کے تجسس میں یہ رات گزر جائے
دھوپ میں سب کچھ راکھ ہوا سائے سائے سب پامال
چنگاریاں سی اڑتی ہیں اشکوں سے صبح تک شاید کے انقلاب ابھی تک دلوں میں ہے

ندؔافاضلی معاصر زندگی کے تضادات کا کھلے ذہن سے مشاہدہ کرتے ہیں اور شخصی سطح پر محسوس کیے گیے احساسات کی تجسیم کرتے ہین، برعکس اس کے باقر مہدی متعینہ نظریات کی شکست کے المیے سے سروکار رکھتے ہیں، وہ دراصل عقلی سطح پر سماجی و سیاسی مسائل و حالت کا احتساب کرتے ہیں ماور مایوس ہوجاتے ہیں، ان کا سرمایہ ان کے سیاسی و سماجی خیالات ہیں، وہ اپنے خیالات سے حیرت انگیز طریقے سے شعری محرکات کا کام لیتے ہیں اور بعض وقت تخلیقی تجربات میں منتقل کرنے میں روا رکھتے ہیں، تاہم کئی مقامات پر یہ محرکات کارگر ثابت نہیں ہوتے، یہ منظوم پیرائے میں ڈھلنے کے باوجود محض خیالات ہی رہتے ہیں، ندؔافاضلی کے یہاں بھی یہ نقص ملتا ہے، لیکن اس کی نوعیت مختلف ہے، یہ ان کے اشعار میں شخصی جذبات کی دراندازی سے واقع ہوتا ہے، مزید برآں، ان کے یہاں وضاحتی اجزا، اور منطقی نتیجہ خیزی سے بھی شعری ہیئیت متاثر ہوتی ہے۔

نئی غزل میں شعور عصر یعنی جدیدیت کی بازآفرینی کے بارے میں متذکرہ بالا رویوں کے علاوہ ایک اور مادی رویہ کی نشاندہی کی جاسکتی ہے یہ زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک متصاد رویہ ہے، جو بیشتر معاصر غزل گو شعراء کے یہاں موجود ہے، ایسے شعراء خوابوں میں اور یادوں کو حرض جاں بنانے اور ان سے تحفظ ذات کرنے کے باوجود معاصر تہذیبی اور سماجی حقائق سے متصادم ہوتے ہیں، اور ذہنی پراگندگی کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ متضاد رویہ ہے، ایسے شعراء کچھ تو مخصوص ماحول اور تہذیبی حالات کے پرودہ ہونے کی بنا پر روایتی اقدار کے شخصی ایجاب وانجذاب کے نتیجے میں اور کچھ تو عصری آگہی کی دہشت نا کی سے خائف ہونے کی بنا پر اپنے وجود اور متعقدات کے

تحفظ اور استحکام کو خاص اہمیت دیتے ہیں، وہ حقیقت کی تمازت کی تاب نہ لا کر خوابوں اور یادوں کی خیالی جنت کی طرف بار بار مراجعت کرتے ہیں، یہ متضاد رویہ معاصر شعور سے مغائرت کا نہیں بلکہ موانست کا احساس دلاتا ہے، اس لیے کہ یہ خوب صورت یادوں کی جانب جھکاؤ کے باوجود عصری حقائق سے گریز نہیں کرتا، یہ رویہ معاصر غزل کی ایک پہچان بن گیا ہے۔ مثلاً

تمام رات اندھیروں کی گرد اڑتی رہی تمام رات مرے ذہن کے چراغ جلے
خورشید احمد جامی

بہار باغ تمنا ہے آرزومندی وگرنہ چشمہ ویراں ہے دیدہ تر بھی
حسن نعیم

ہر طرف سو چراغ جلتے ہوئے حادثے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے
ندا فاضلی

چہار سمت سے گھیرا ہے تیز آندھی نے اور اک چراغ کی لو پھر بھی جلتی جاتی ہے
شہریار

ہے کب سے اسی شہر کی جانب سفر اپنا جس شہر کی جانب کوئی رستہ نہیں جاتا
مخمور سعیدی

مرے سب خواب تاروں کی طرح ٹوٹے مگر اس کا گلوں کی اوس میں بھیگا ہو پیکر نہیں بدلا
مظہر امام

ایک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا
بشیر بدر

اسے اپنے وعدوں کا احساس تھا جھکی آنکھ اس کی مکرتے ہوئے
پرکاش فکری

فاصلے ایسے کہ اک عمر میں طے ہو نا سکیں قربتیں ایسی کہ خود مجھ میں جنم ہے اس کا
باقر مہدی

اے باد سموم ابھی سے مت چھیڑ نکھرا ہوا صبح کا بدن ہے
فاروقی

ٹکڑے ٹکڑے ہو کے ترسے گا خود اپنے آپ کو ایک شب کی بات ہے پھر ماہ کامل کچھ نہیں
باقر مہدی

بیاباں بیاباں خیر ہوگئی بگولہ میرے راز داروں میں تھا
(منظؔر حنفی)

ہمیں منزل بہ منزل جاگنا ہے پلک جھپکی تو راستہ نہ ہوگا
(مظہؔر امام)

☆ **کرفیوزدہ ماحول**

ابھی ہم نے دیکھا کہ سماجی وسیاسی موضوعات جدید شعراء غزل میں کس خوبی سے استعمال کرتے ہیں دیکھئے۔ کرفیوزدہ شہر کا یہ دردناک منظر جس میں عام انسانوں کی بے بسی اور بے نوائی کا عکس ہے جو براہ راست بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔

سڑک نے تان رکھی تھی سنانیں
ہوا بارود سے لپٹی ہوئی تھی
جو کرفیو لگ گیا سو لگ گیا
مری بیمار ماں بھوکی پڑی تھی
گلی سنسان تھی بچے کہاں تھے
درو دیوار پر ایک بے حسی تھی
زمین آسمان خاموش تھے سب
مگر دل میں مرے اک کھلبلی تھی
ساجد حمید

سرد لبوں پر چیخیں نیلی نیلی ہوکر بیٹھ گئی ہیں
برفیلی نظروں سے مجھے گھورے ہی جاتا ہے مجھے سناٹا
اپنی اپنی لاش اٹھائے لوگ گھروں کو لوٹ گئے
خون میں ڈوبی کچلی سڑکیں چاٹے جاتا ہے سناٹا
بلقیس ظفر الحسن

ویران ہے شہر سارا
باقی کھنڈر رہے ہیں
سہمے ہوئے ہیں کتے
لاشوں سے ڈر رہے ہیں محمد علوی

اور شاید اس المناک صورت حال کا سب سے زیادہ دردناک پہلو انسانی رشتوں کا زوال اورخلوص اوراعتماد کا شک اور خوف میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار

ستم ہے جانے پہچانوں کی بستی
نظر آتی ہے بے گانوں کی بستی
ستم ہے آندھیاں لہرا رہی ہیں
اجڑ جائے گی انسانوں کی بستی راز آزاثاوی

اوراس سے بھی زیادہ دردناک پہلو یہ ہے کہ ظلم وستم اور قتل و غارتگری کی یہ فراوانی رفتہ رفتہ دردمندی اور نرم وگداز احساسات کے سوتے بھی خشک کر دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چرا کر گئی آہ و فغاں جو آندھی آئی تھی
کسی کی موت پر اب شہر میں ماتم نہیں ہوتا جمال اویسی

اور جو مناظر روح کے نہاں خانوں میں ایک کہرام برپا کر دیتے تھے اب روز مرہ کے واقعات بن چکے ہیں۔

پہلے یوں لگتا تھا جیسے جل رہی ہے میری روح
اب تو عادت بن گئی جلتے ہوئے گھر دیکھنا مہتاب پرتاب گڑھی

یہاں تک کے ان واقعات نے انسانوں سے ان کی انسانیت اور بچوں سے ان کی معصومیت بھی چھین لی ہے۔ مثلاً

شعلہ زنی کا قصّہ لکھ
گھر کو لہو کا دریا لکھ
وقت سے پہلے بالغ ہے
آج کا بچہ بچہ لکھ سیف سہسرامی

ہے اجڑتے شہر کا فیصلہ سیہ حاشیے میں لکھا ہوا
جو ہوا سے نکلا غبار تھا جو بچا گھروں میں ملال تھا — مصور سبزواری

سناٹے ہی بہتر تھے
ایسی افرا تفری سے
آگ لگی ہے جنگل میں
کانپ رہا ہوں سردی سے — آشفتہ چنگیزی

ہے اجڑتے شہر کا فیصلہ سیہ حاشیے میں لکھا ہوا
جو ہوا سے نکلا غبار تھا جو بچا گھروں میں ملال تھا — مصور سبزواری

سناٹے ہی بہتر تھے
ایسی افرا تفری سے
آگ لگی ہے جنگل میں
کانپ رہا ہوں سردی سے — آشفتہ چنگیزی

اس قسم کی اور بھی سیکڑوں مثالیں عصری غزل کے حالیہ نمونوں میں مل سکتی ہیں۔ یہاں صرف وہی اشعار پیش کئے گئے ہیں جو اوروں سے زیادہ کامیاب اور اثر انگیز ہیں۔ اور اس دردناک صورت حال پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ بہر طور اس قسم کے اشعار کی روشنی میں بلا تامّل یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات' دہشت انگیزی کے واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی مسائل اور مختلف ذہنی کیفیات ایک ایسا تجربہ ہے جس نے اس دور کے شاعروں کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے اور ان کا ردعمل بڑی شدت اور بے ساختگی سے شعری اظہار کے سانچوں میں ڈھل گیا ہے۔

☆ بے بسی و بے یقینی کا عالم

ان اشعار کے علاوہ جن میں مذکورہ بالا واقعات کا ایک واضح عکس ہے۔ عصری غزلیں حالیہ نمونوں میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں عصری زندگی میں پیوست ظلم وستم، ناانصافی ریاکاری ،جھوٹ، اور افراتفری کے خلاف ردعمل کا اظہار ہوا ہے اور جن میں پروٹیسٹ کی زیریں لہر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی عصری زندگی کی پریشانیوں، الجھنوں، بے بسی اور بے یقینی اور اس قسم کے ماحول میں عام آدمیوں کی بے بسی اور بے نوائی کا اظہار بھی غزل میں اکثر بڑی شدت سے ہوا ہے اور ان مسائل کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ چند مثالیں پیش کرتی ہوں۔

کب تک زندہ رہیں گے مجلس دوراں میں ہم
کب کھلیں گی کھڑکیاں، تازہ ہوا کب آئے گی ڈاکٹر کیف رضوی

رات کے بعد وہی رات کا گھیرا نکلا
ظلم شہر میں سورج بھی اندھیرا نکلا کمار پاشی

یا پھر یہ اشعار جن میں مجموعی صورت حال کو استعاراتی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور زندگی کی تباہ کن عناصر کی کارفرمائی کا احساس بہت شدید ہے۔

غبار ہے جو ادھر دیکھنے نہیں دیتا
کسی کو سمت سفر دیکھنے نہیں دیتا
یہ سانحہ کہ زمیں پاؤں کے تلے نہ رہی
جمال شمس و قمر دیکھنے نہیں دیتا سہیل احمد زیدی

یا پھر یہ اشعار جن کا لہجہ زیادہ جذباتی ہے لیکن زندگی اور انسانی اقدرا کے اتھل پتھل ہو جانے کا احساس بھی کارفرما ہے۔

بھرے ساون میں بادل کو ہوا کیا
کہ خود ہی پھر رہا ہے آج پیاسا
سحر سہمی ہوئی سی پھر رہی ہے
اندھیرا پھر رہا ہے دندناتا بدر نظیری

یا پھر یہ اشعار جن میں تباہی اور شکست و ریخت کے احساس کے ساتھ ساتھ لہجے کا تیکھا پن بھی متاثر کرتا ہے۔

کونین میں کہرام زمیں ٹوٹ رہی ہے
جنبش نہ کرے کوئی بھی زنہار خبردار
آندھی کو پہنچنے لگے پتوں کے بلاوے
اپنوں سے شاخ ثمردار خبردار مظفر حنفی

اور ایک شاعر اور شاعر کے یہ اشعار جن میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں انسان کے لیے رفتہ رفتہ سبھی راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔

پشت پر قاتل کا خنجر ، سامنے اندھا کنواں
بچ کے جاؤں کدھر اب راستہ کوئی نہیں
دور ساحل ، تند موجیں اور طوفانی ہوا
غرق ہوتی کشتیوں کا ناخدا کوئی نہیں — کرشن ادیب

دھوپ کا سیلاب مٹی کی نمی لے جائیگا
چہرہ چہرہ موسموں کی تازگی لے جائیگا
ہر طرف سہمی ہوئی پرچھائیوں کا شور ہے
کس طرف خود کو بچا کر آدمی لے جائیگا — نصیر پرواز

دہکتی دھرتی ، دہکتا سورج ، دہکتے شام و سحر کے منظر
نواع جاں میں سلگتا رہتا ہے کرب کتنی جراحتوں کا — یوسف بیگ جمال

روز اک صادق و منصف کو سزا ملتی ہے
روز ہوتا ہے یہی کھیل تماشا کب سے — نصیر پرواز

اور آخر میں یہ اشعار جن میں ذاتی غم کی تلخی کو ایک کائناتی احساس میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے اور جن کا لہجہ زیادہ فیصلہ کن ہے۔

جہنم ضرورت کیا ہے آخر
عذابوں کو تو یہ دنیا بہت ہے
ملا ہے نیکیوں کا پھل مجھے بھی
اسے چکھا بھی ہے کڑوا بہت ہے — محبوب راہی

☆ظلم وستم غارتگری

عصری زندگی میں ظلم وستم قتل وغارت گری کی یہ فراوانی، انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کی پامالی اور شر کی قوتوں کی بالادستی اور ایک حق پرست انسان کے لیے مسائل اور جراحتوں کا طویل سلسلہ کچھ

ایسے پہلو ہیں جو جدید شاعر کے ذہن کو بار بار کربلا کے عظیم اور المناک واقعے کی طرف لے جاتے ہیں اور سانحۂ کربلا اور شہادت امام حسینؓ جدید شاعری کا نہ صرف ایک تکراری موضوع ہے بلکہ ایک کثیر الابعاد علامت بھی ہے جس پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی بعض تحریروں میں بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔حالیہ غزل میں بھی اس کا اظہار کئی زاویوں سے ہوا ہے اور اس کے توسط سے ان شعرا ءنے ذاتی غم اور کائناتی مسائل کی کئی پرتیں کھولی ہیں۔کہیں تو سانحۂ کربلا صرف ایک تلمیح ہے جو اپنی جگہ معنی خیز ہے۔مثلاً

آ گیا جب بھی دریا کو پیاسوں کا خیال
احتراماً رک گیا ہے کربلا کے سامنے — رئیس انصاری

فرات آ گئی چلّو میں ایک پیاسے کے
مگر یہ دیکھو لب خشک تر کہا کہ نہیں
ابھی اٹھے بھی نہ تھے ہاتھ بدعا کے لیے
سر بریدہ سے آنے لگی صدا کہ نہیں — ملکہ نسیم

ہم دشت کربلا میں سدا تشنہ لب رہے
بہتا تھا گرچہ پاس سے دریا فرات کا — مخمور سعیدی

سروں کے دیپ ہیں نیزوں پر روشن
میں کیسے دیکھوں منظر کربلا — فراق جلالپوری

اور کہیں یہ معاشرہ میں پیوست ظلم وستم اور شر پسند قوتوں کی بالا دستی کا استعارہ ہے۔مثلاً

خط سلیب لکھوں ، حرف کربلا لکھوں
میں کتنے روپ میں اب خود کو جا بجا لکھوں
یہی تو چاہتے ہیں عہد نو کے یزید
لہو سے اپنے میں تاریخ کربلا لکھوں — ظہیر غازی پوری

یزیدی فوج کے نرغے میں آنے والا ہے
وہ حق نوائی کا انعام پانے والا ہے — منظر سلطان

اور کچھ شاعروں نے سانحۂ کربلا کو ایک دوسرے زاویے سے پیش کیا ہے۔ مثلاً اس شعر میں کربلا سے بے پایاں خلوص اوو والہانہ جذبوں کی سربلندی کا استعارہ ہے۔

یزیدی فوج یوں ہاری کہ دل والوں سے خالی تھی
حسینی قافلے کے ساتھ تھے پورے بہتر دل — شجاع خاور

جدید غزل میں کربلا کی ہجرت بھی حالیہ غزل کا ایک تکراری اور مخصوص موضوع ہے جو اکثر رنج والم، مایوسی، بے یقینی اور غیر محفوظیت کا استعارہ بن گیا ہے کہیں تو ہجرت کا تصور اپنے محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے اور کہیں یہ ایک وسیع تر معنویت کو اپنے اندر سموئے ہے۔ چند شعر پیش کرتی ہوں۔

اپنا ہی فیصلہ تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے
مڑمڑ کے پھر یہ کیوں درو دیوار دیکھنا — مظہر امام

ہجرتوں کا لطف لیتا ہوں نگر رکھتے ہوئے
بستیوں میں ٹھوکریں کھاتا ہو گھر رکھتے ہوئے — خورشید افسر بسوانی

ہم کو کھینچے لے جاتے ہیں سرابوں کے بھنور
جانے کس وقت میں چلے تھے ہم لوگ گھر سے — زاہدہ زیدی

گرتے ہوئے پتوں کی صدائیں مرے دل سے
کہتی ہیں تو نے کبھی ہجرت نہیں دیکھی — اسعد بدایونی

انجان نگر میں رہن کرنا
اور اس پر ملال ہجرتوں کا

ہر لمحہ صلیب آشنا ہے
ہر سال ہے ہجرتوں کا — شفیق سوپوری

اس طرح کے اور بھی بہت سے اشعار عصری غزل میں مل سکتے ہیں جن میں ایک محفوظ معاشرے اور مانوس اقدار سے کٹ کر اجنبی فضاؤں میں جینے کا تجربہ عہد حاضر کے انسان کو اجنبیت کے احساس اور غیر محفوظیت کے کرب سے دو چار کرتا ہے اور اجنبیت کا یہ احساس خارجی ماحول کا

زائیدہ بھی ہے اور داخلی کیفیات کی تجسیم بھی۔

☆رنج والم کی فراوانی

ان مسائل کے علاوہ جن میں رنج والم کی فراوانی اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی پامالی کا کربناک احساس موجزن ہے، حالیہ غزل میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن کا مرکز ذاتی غم ہے اور جن میں کہیں کہیں کرب ذات کے وسیلے سے وسیع تر معنوں کے ادراک کی کاوش بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ کہیں کہیں تو یہ غم جذباتیت سے مملو ہے۔ اور خودرحمی کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ مثلاً

جاگتی حسرتوں کا پیکر ہوں
دو پہر کا سلگتا منظر ہوں
ٹکڑے ٹکڑے وجود ہے میرا
بے کسی کی دریدہ چادر ہوں — پرکاش تیواری

اپنی آگ میں جلتا ہوں
میں بھی سورج جیسا ہوں
دریا میری مٹھی میں ہے
پھر بھی کب سے پیاسا ہوں — عاصم شہنواز شبلی

اجالوں کے تعاقب کا سفر آسان ہے لیکن
چراغوں کی طرح بجھ بجھ کے جلنا مشکل ہے — منظر سلطان

اے خدا تونے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے — بشیر بدر

یہ قید خانۂ جاں یہ مہیب سناٹا
یہ شب، یہ بجتی ہوئی بیڑیاں، ہوا اور میں
یہ راستوں کا کہیں جنگلوں میں کھو جانا
یہ اک بھٹکتا ہو کارواں، ہوا، اور میں — والی آسی

اور سناٹے ہوئے دشتِ ندا کے گہرے
کیا خبر آج کی شب کس کو صدا دی جائے مصور سبز داری

دور تک ایک کھنڈ رات کا سلسلہ
رک گیا ہے کہاں عمر کا کارواں ساجد زیدی

امید وہم کے صحرا میں یہ طویل سفر
تپش یہ سوز دروں کی یہ آبلہ پائی زاہد زیدی

اے خدا اور نہ دیکھے کوئی
میں کھلی آنکھ سے جو دیکھتا ہوں شہریار

رات کا کرب نہاں پھیلا ہوا منظر تھا
چاند بھی سہا ہوا ابر کی چادر میں احمد کمال

☆احساس تنہائی

جدید شاعری میں ذاتی غم ،احساس ذات ،تنہائی اور تلاس ذات تو گویالا حاصل ہیں۔گوکہ حالیہ غزل مین تنہائی کا تصور اس قدر تکراری موضوع نہیں جیسا کہ پہلے تھا۔ پھر بھی ابھی اس کیفیت کے اظہار کے لیے کچھ جاذبِ توجہ اشعار مل جائے۔مثلاً یہ اشعار جن میں تنہائی کے احساس کو ایک انوکھے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہجر کی منزل ہمیں اب کے پسند آئی نہیں
ہم اکیلے ہیں مگر ہمراہ تنہائی نہیں مہتاب پرتاب گڑھی

دل کی وادی ہے کہ سحرا کا سماں
آنکھ مسمار ، نظارے چپ ہیں
آج تنہا ہے بہت تنہائی
آج آنکھوں کے اشارے چپ ہیں لطف الرحمٰن

یہ میرا دل ہے کہ منظر اجاڑ بستی کا
کھلے ہوئے ہیں سبھی در مکیں نہیں آتا شہریار

یہ راہِ سختِ یہ دشتِ الم کی پنہائی
قدم قدم میں ہمیں ڈس رہی ہے تنہائی زاہدہ زیدی

قافلے والے نہ سمجھے مری آواز ذرا
دشتِ تنہائی میں نالندہ رہی ذات مری ساجدہ زیدی

تنہائی کے ساتھ ساتھ کربِ ذات، تلاش ذات اور انکشاف ذات بھی عصری غزل کے مخصوص اور محبوب موضوعات ہیں جن میں کئی شعراء کے نئے نئے ابعاد تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور حالیہ غزل میں اسکی کئی جاذب نظر مثالیں مل جاتی ہیں۔ پہلے وہ اشعار جن میں تلاش ذات ایک پیچیدہ سفر کے مترادف ہے۔

میری اپنی کھوج کا سنگین سفر
دوریاں ہی دوریاں ہیں دور تک رازق افسر

عجیب بھول بلھلیاں ہے جستجو خود کی
ہر ایک نقش قدم انحراف کرتا ہے مظفر حنفی

اور کچھ شاعروں نے اس کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر اس کیفیت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔

نہ دھوپ کا ٹکڑا نہ سائے کا آسیب
یہ دشت، دشت انا ہے یہاں نہیں ہے کوئی عنوان چشتی

ایک شور ہے اور کچھ بھی سنائی نہیں دیتا
کیا مجھ میں ہی آواز میری گونج رہی ہے عنوان چشتی

اور کہیں یہ ایک ایسی بیکراں خاموشی ہے جو ہزاروں پراسرا آوازوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مثلاً یہ اشعار

کھنڈر میں وقت کے تنہا خموش بیٹھی ہوں
گزرتے لمحوں کے قدموں کی چاپ سنتی ہوں

جو سوچیے تو قیامت کا شور ہے مجھ میں
جو دیکھیے تو بس ایک اجاڑ بستی ہوں شبنم وحید

اس حصار ذات سے باہر نکل
گنبد بے در میں ایک در تلاش کر ڈاکٹر سجاد سید

کرتے رہے نجات کی ہر ہر سبیل ہم
لیکن نہ توڑ پائے انا کی فصیل ہم پرتپال سنگھ بیتاب

☆ **تلاش ذات**

جیسا کہ اوپر دیئے گئے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے بیشتر شاعروں کے لئے تلاش ذات ایک ایسا پیچیدہ سفر ہے جو دوریوں کی گرد اور ابہام کے دھندلکوں میں لپٹا ہوا ہے، اور جس کی شاید کوئی آخری منزل نہیں، لیکن کچھ شاعروں نے اس کا مثبت اور خوش آئند پہلو بھی پیش کیا ہے جس میں تصوف کی ہلکی سے جھلک ہے۔ مثلاً

اک اک پردہ حریم ذات کا اٹھ جائے گا
آپ اپنے ہم سفر ہو جائیں گے ہم ایک دن زاہد کمال

کہیں ایک ولولہ انگیز خاموشی سی ذات و کائنات کے اسرار و رموز کھولنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ اور یہاں بھی تصوف کا رنگ جھلک آیا ہے۔

ہوا پھر کوئی راز سر بستہ وا
خموشی کی سنتا ہوں پیہم صدا
وہی ایک آواز کی بازگشت
وجود گویا ہے کوہ ندا ڈاکٹر جاوید وششٹ

خود اپنے ذہن پر اترا ہوں وحی کی صورت
جہت جہت سے نیا انکشاف ہوں کوئی فضا ابن فیضی

کچھ شاعروں کے لیے احساس ذات خود اپنے انداز سے جینے اور اپنے طور سے زندگی کا ادراک کرنے کے مرادف ہے جیسے کہ یہ شعر جس میں نسوانی پروٹسٹ کا جذبہ بھی جھلک آیا ہے۔

یقین مت کرو تم ذائقوں کا
مجھے چکھنے دو اپنی زندگی کو پنہاں

احساس ذات کا دوسرا رخ بے چہرگی کا کرب ہے جس کی جھلک حالیہ غزل میں دیکھی جاسکتی ہے گوکہ اب یہ موضوع اس قدر تکراری نہیں جیسا کہ پندرہ بیس سال پہلے تھا۔ یہاں دوشعر پیش کرتی ہوں۔

معتبر ہوتی نہیں بے چہرگی
کچھ تو میری ذات کی پہچان ہے — مہدی پرتاب

موم کے پتلے تھے ہم اور گرم ہاتھوں میں رہے
جس نے جو چاہا ہمیں ویسا بنا کر لے گیا — منظور ہاشمی

☆مسرت وشادمانی کی لہر

جیسا کہ اب تک اس جائزےسے ظاہر ہوا ہے عصری غزل کے حالیہ نمونوں میں الم، پریشانی، مایوسی، کرب ذات اور احساس زیاں کا اظہار فراوانی ہے اور ساتھ ہی اس میں سماج میں پیوست ظلم، ناانصافی، ریاکاری اور بےحسی کے خلاف احتجاج کی دبی دبی لہر بھی نظر اکثر جگہ آ جاتی ہے ۔یعنی نئی غزل کے اس منظرنامے مسرت، شادمانی، اور لطف ونشاط کے احساسات کا اظہار کم ہی ہوا ہے۔اس لیےاس کیفیت کا اظہار ہوا ہے قدرتی طور پر اس پر نظر ٹھہر جاتی ہے۔ یہاں چند اشعار پیش کرتی ہوں۔

ہمیں ان کا مکاں اچھا لگا ہے
وہاں سے آسماں اچھا لگا ہے
کبھی خود سے بھی ہم اکتا گئے ہیں
کبھی سارا جہاں اچھا لگا ہے — محمد علوی

میرے حق میں وہ بر تھا یا بھلا اچھا لگا
وقت کا لکھا ہوا ہر فیصلہ اچھا لگا — شمیم طارق

پتھروں کے درمیاں بہتی ندی اچھی لگی
جو حصارِ غم میں گزری زندگی اچھی لگی
درمیاں کانٹوں کے بھی مسرور تھے شاداب تھے
جانے کیوں پھولوں کی یہ شائستگی اچھی لگی معظم علی خان

خیالوں کو تپ کر نکھرے تو دو
اجالوں سے گھر میرا بھر جائے گا ظہیر غازی پوری

زمیں کب تھی وہاں پر جس جگہ سے قافلے نکلے
ذرا سا حوصلہ رکھا تو کتنے راستے نکلے اسحاق اثر

اور کہیں یہ مثبت جذبہ زیادہ داخلی اور تفکر میں ڈوبا ہوا ہے جس میں غم سے لذت کشید کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ مثلاً

آج کی رات کوئی وار نہ خالی جائے
سنگ و آہن ہی سے اک نہر نکالی جائے
خشک سالی کی گھٹائیں تو برسنے سے رہیں
جوئے کم آب ہی آنکھوں سے بہالی جائے مظہر امام

اور کہیں یقین و گمان اور امید وبیم کی دھوپ چھاؤں اور لہجے کی انفرادیت نے شعری اظہار کو ایک مصوص دلکشی عطا کی ہے مثلاً

زوال شام ہجراں کا اشارہ دیکھتا ہوں میں
چراغوں کے بدن کو پارہ پارہ دیکھتا ہوں میں
غبار شب کے پیچھے روشنی ہے لوگ کہتے ہیں
اگر یوں ہے تو یہ منظر دوبارہ دیکھتا ہوں میں عرفان صدیقی

اس قسم کے اور بھی اشعار حالیہ غزل میں مل جائیں گے جن میں لطف و مسرت یا امید کے جذبوں کا اظہار ہوا ہے لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسرت اور شادمانی کا جذبہ اور رجائی انداز

فکرنئ غزل میں آٹے میں نمک کے برابر ہے اور اکثر مسرت کے یہ دلنواز رنگ بھی اداسی یا غم انگیزی کے سرمئی فریم میں جڑے نظر آتے ہیں۔اور اگر رنج والم، بے نوائی اور شکستہ پائی کے علاوہ کوئی احساس بار بار سر اٹھاتا ہے تو وہ بے یقینی، گمان اور زندگی میں پیوست ابہام کا احساس ہے یہاں صرف چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گی۔

ٹہنی سے گرا وہ برق خزاں
امکان ہے تازہ سانحے کا — مصور سبزواری

لفظ ہونٹوں سے نکل کر رائیگاں ہوجائیں گے
سچے قصے بھی سماعت پر گراں ہوجائیں گے
بھاگتی جائیں گی ذہنوں سے یقیں کی سرحدیں
لوگ خود اپنے لئے وہم و گماں ہوجائیں گے — شناور کرت پوری

سفر میں جانے کتنے دشت و دریا راہ روکیں گے
ابھی سے کس لیے بے حوصلہ ہو تم ابھی کیا ہے
صدا اب معتبر کوئی ، نہ منظر دیر پا یعنی
یہ کان اب کچھ نہیں سنتے ،نظر بھی دیکھتی کیا ہے — مخمور سعیدی

الٹ گیا ہے ہر اک سلسلہ نشانے پر
چراغ گھات میں ہے اور ہوا نشانے پر — عرفان صدیقی

دوسری طرف کوئی شاعر انجانے راستوں میں بھٹک کر اور گمانوں کو چھان پھٹک کر کسی نتیجے پر پہونچنے کی کوشش کرتا ہے۔مثلاً

چلو یوں ہی سہی کچھ دن بھٹک کر دیکھ لیتے ہیں
گمانوں کو بھی تھوڑا سا پھٹک کر دیکھ لیتے ہیں — سہیل احمد زیدی

اور کہیں تضادات، ابہام اور پریشان کن صورت حال کا اظہار اس طرح ہوا ہے۔مثلاً

درخت ، ٹیلے ، پتھر بھاگ رہے ہیں
میں بیٹھا ہوں منظر بھاگ رہے ہیں

اپنے طور پہ کوئی بھی آزاد نہیں
سب اپنے محور پر بھاگ رہے ہیں محبوب راہی

غرض یہ تضادات اور زندگی میں پیوستہ ابہام کہیں جان لیوا اور کہیں ولولہ انگیز۔کبھی یہ شاعر کی تخلیقی اور ذہنی قوتوں کو مفلوج سا کر دیتے ہیں اور کبھی ان کے لیے مہمیز کا کام بھی کرتے ہیں۔

☆حسن وعشق کی کیفیت

اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نئی غزل کے اس پہلو کی طرف بھی توجہ مبذول کی جائے جو زمانئے قدیم سے غزل کا مخصوص اور محبوب موضوع رہا ہے یعنی کیفیات حسن اور عشق لیکن یہ بات کسی حد تک قابل حیرت ہیکہ حالیہ غزل میں یہ ایک تکراری موضوع معلوم نہیں ہوتا اور کسی قدر قابل افسوس بات بھی ہے کیونکہ عشق کا تجربہ عالمی شاعری میں بھی ایک نیا موضوع اور عظیم شاعری کا سرچشمہ رہا ہے۔پھر بھی حالیہ غزل میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جس میں حسن وعشق کی واردات بھی ہے اور جدید حسیت کا اظہار بھی اس قسم کے چند اشعار پیش کرتی ہوں۔

آپ سادہ لباس میں مجھے
حد سے زیادہ حسین لگتی ہیں پریہ درشی ٹھاکر

بہت مختصر ہے کہانی ہماری
بساط محبت نہ جیتے نہ ہارے رشی پٹیالوی

دمک اٹھے مری صبحوں میں وہ دمکتا ہوا چہرہ
مری راتوں میں ان آنکھوں کا غم سارا اتر آئے
درخشاں بازوؤں کے حلقہ حلقہ سرخ سے موجیں
ہمارے خون میں شعلوں کا فوارہ اتر آئے ذکاءالدین شا

لمس کے سیلاب کی رفتار بھی کچھ تیز ہے
جسم کی دیوار مر مر بھی ذرا بوسیدہ ہے رفیق راز

مدتوں تک وہ رہا ہے مجھ میں
اب تو بس ایک خلا ہے مجھ میں اشعرعلیگ

ایک پر اسرا خموشی سی ہے ہر جا مجھ میں
میں خلاء ہوں تو صدا بن کے بکھر جا مجھ میں
عنوان چشتی

مزا ملا مجھے اپنے ہی خوں میں تر ہو کر
ترے وجود کی رم جھم میں روح تشنہ تھی
مظہرامام

تیرے مڑ کے دیکھنے سے اس کو گویائی ملی
تیرے جانے سے جو لمحہ بے زباں ہونے کو تھا
آزادگلاٹی

تپتے صحرا میں یہ خوشبو ساتھ کہاں سے آئی
ذکر زمانے کا تھا تیری بات کہاں سے آئی
مغنی تبشم

دو بدن درد کی لہروں پہ ہی مل سکتے ہیں
اس رسالت کو کہاں باد صبا سمجھے گی
خورشیداکبر

مجموعی طور پر مرد شعراء کے مقابلے میں خواتین شاعروں نے عشق ومحبت کے جذبات سے متعلق زیادہ شعر کہے ہیں اور بعض ہندوستانی شاعرات مثلاً بانو وفا، مسعودہ حیات اور ممتاز مرزا وغیرہ نے کافی اچھی عشقیہ شاعری کی ہے لیکن یہ خواتین اپنی غزلیں رسالوں وغیرہ میں کم ہی شائع کرواتی ہیں۔

نہ تم ملے ، نہ خود سے سامنا ہوا
سنا یہ تھا دل آئینہ صفات ہے
اداجعفری

خوشبو میری روح ترستی رہی مگر
دل مانتا نہیں کہ وہ کاغذ کا پھول ہے
پنہاں

آخر میں یہ دو کسی قدر طویل اقتباسات جن میں عشق کا تجربہ یاد کے پردوں سے چھن کر شعر کے قالب میں ڈھلا ہے۔ پہلے یہ اشعار میں عشق کا تجربہ ذرا ہلکا پھلکا لیکن نو جوانی والہانہ پن کا غماز ہے۔

رم جھم رم جھم رت وہ دل پر جذبوں کی
کیسے کومل کومل موسم بیتے ہیں

پروائی پھر درد کا موسم لائی ہے
پھر یادوں نے دل کے زخم کریدے ہیں پنہاں

نواح جاں کے ادھورے سفر کو یاد کریں خیال و خواب کی اس رہ گزر کو یاد کریں
کسی بیاض تمنا کے کچھ ورق پلٹیں نگاہ لطف کو رمز نظر کو یاد کریں
بدن کے لمس میں بجتی سی جل ترنگ سنیں لہو کی بوند میں رقص شرر کو یاد کریں
خزاں کی شاخ بریدہ کو ہاتھ میں لیکر گلوں کی شعلہ بکف رہ گزر کو یاد کریں

یہ خشک سالی ، یہ بنجر زمیں ، یہ گرم ہوا
لہو کی موج رواں ، چشم تر کو یاد کریں زاہدہ زیدی

اس جائزے سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ حالیہ غزل میں موضوعات ،شعری اسلوب اور پیکر تراشی کا تنوع قابل لحاظ ہے لیکن اس مختصر مقالے میں ان میں سے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں اور اب نئی غزل کے دو اور اہم موضوعات یعنی ''موت اور تخلیق
سفر'' پر روشنی ڈالنے سے پہلے میں اپنی توجہ نئی غزل کے چند اہم اور کلیدی شعری پیکروں اور استعاروں پر مرکوز کرتی ہوں جو اکثر ایک علامتی معنویت کے حامل بھی ہیں اور جن کے توسط سے نئی غزل کے کچھ اور گریز پا پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

☆خوابوں کا بکھرنا

خواب شکست خواب اور آئینے کے شعری پیکر شامل ہیں جس میں بیشتر شعری پیکر مظاہر فطرت سے مستعار لیے گئے ہیں اور جن میں شہر ،جنگل ،خزاں ۔۔۔سمندر ،دریا ،زمین وغیرہ شامل ہیں۔سب سے پہلے ہم اپنی توجہ ''آئینہ'' کی طرف مبذول کراتے ہیں ۔جو عصری غزل کا ایک مخصوص اور کلیدی شعری پیکر اور ایک کثیر الابعاد علامت ہے جس میں زندگی کے داخلی ،خارجی اور فطری پہلو بیک وقت منعکس ہیں۔

بہت دنوں سے کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
کبھی تو چہرا ، کبھی آئینہ نہیں ملتا آزادگورداسپوری

کسی نے چرا لیں صورتیں اسکی کہ یوں ہوا
بے چہرگی کے غم سے فگار اور آئینہ فضاابن فیضی

اب کہ بے چہرگی کی یورش میں
آئینے سارے لخت لخت ہوئے حسن عزیز

آئینہ ایسا کبھی ٹوٹا نہیں
کوئی بھی میری طرح بکھرنا نہیں حسن عزیز

یہ زندگی مجھے آئینہ کیا دکھائے گی
میں ایک موج ہوں بنتی بگڑتی بشریٰ زیدی

حرف دگر کو اپنے میں کس لوح پر لکھوں
یہ کور دیدگاں کی قطار اور آئینہ فضاابن فیضی

مختصر یہ کہ آئینہ جدید غزل کا ایک کلیدی شعری پیکر اور ایک ایسی کثیر الابعاد علامت ہے جس کے توسط سے غزل گو شعراء نے زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ذات کے اسرار رموز کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔

آئینے کی طرح خواب اور شکست خواب بھی عصری غزل کا ایک تکراری موضوع اور معنی خیز استعارہ ہے۔اور اکثر اس کا استعمال علامتی معنویت کے ساتھ کیا گیا ہے ۔جس میں مسرت،امید،فرار ،اور زندگی کی گریز پائی اور بے ثباتی کے پہلو مضمر ہیں اورکہیں یہ ان حوصلوں،آورشوں اور آئیڈیلزم کے تصورات کو اپنے دامن میں لیے ہوہے جو زندگی کی معنویت اور روشن مستقبل کے امین ہیں۔کہیں خواب صرف فریب نظر اور سراب ہے اور خود زندگی کے ان پہلوؤں کا اشاریہ بھی مثلاً۔

یہ زندگی ہے یا کوئی خوابوں کا سلسلہ
حد نگاہ تک ہے سرابوں کا سلسلہ عرش صہبانی

نظر آئی مگر ہاتھ نہ آئی
زندگی ہم نے خواب سی پائی بشر نواز

یہ میری زندگی کے مسائل ، یہ الجھنیں
ایک خواب دیکھنے کی بھی فرصت نہیں رہی راشد نعیم

خواب جب ٹوٹ کے بکھرے تو حقیقت سمجھو
کوئی اپنا کبھی روٹھے تو محبت سمجھو عفت زرین

اندھا سفر ہے زیست کسے چھوڑ دے کہاں
الجھا ہوا سا خواب ہے تعبیر کیا کرے اکرام نقاش

کوئی تعبیر ملے یا نہ ملے
دل میں خوابوں کو بسا رہنے دو انیس رامپوری

عصری شاعروں میں غالباً شہریار نے سب سے زیادہ حساسیت کے ساتھ اور فنی چابکدستی سے خواب کی کیفیات کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے اور اس میں معنوں کے کئی نئے پہلو بھی تلاش کئے ہیں لیکن اب وہ شکست خواب کی اذیت سے دوچار ہیں یہ خواب اب ان کے دکھوں کا مداوہ نہیں۔

یہ جب ہے کہ اک خواب سے رشتہ ہے ہمارا
دن ڈھلتے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے ہمارا شہریار

صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا
مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا شہریار

اور شہریار کے ایک شعری مجموعے کا عنوان ''خواب کا در بند ہے'' بھی گویا خوابوں کی مسیحائی سے مایوس ہو جانے کا ایک اعتراف ہے لیکن کچھ اور ہم عصر شاعر ان کی اس تاویل سے مطمئن نہیں ۔مثلاً یہ شعر

کس عہد میں دیکھے نہیں آنکھوں نے نئے خواب
آنکھوں پہ ہوا بھی ہے کبھی ''خواب کا در بند'' محسن زیدی

اور اس شعر میں بھی خواب زندگی کی معنویت اور انسان کے حوصلوں اور مقاصد کا استعارہ ہے آئینہ اور خواب کی طرح ''شہر'' بھی نئی غزل کا ایک مخصوص اور پیچیدہ شعری پیکر ہے جسے ہر زاویے سے دیکھا اور محسوس کیا گیا ہے اور جس کے توسط سے جدید طرز زندگی کئی پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے عام طور سے تو شہر کو الجھنوں، پریشانیوں، تصادم، بے چہرگی اور غیر ذاتی زندگی اور مادی اقدار کی بالادستی، مشنی انداز فکر اور ریاکاری سے منسلک کیا گیا ہے۔لیکن کچھ شاعروں نے شہر کو تہذیب، ترقی

اور شائستگی کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ پہلے کچھ ایسے اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں شہر کا منفی پہلو اور مکروہ چہرا جھلکتا ہے مثلاً

کار ، تانگے ، آشنا ، نا آشنا چہروں کی بھیڑ
شہر کے بازار میں خوف تصادم جا بجا — قاضی حسن رضا

موج در موج وہی ریگ رواں ہے اب بھی
شہر چہروں کے سمندر کا دھواں ہے اب بھی — لطف رحمٰن

اژدھا شہر کا مجھ کو بھی نگل ہی لے گا
زندہ ریتوں کے سمندر میں کہاں جاؤں گا — سید شکیل

یہاں سب اپنے اپنے دائروں میں قید ملتے ہیں
یہ پابندی تو اس بستی میں گھر گھر ہو گئی شاید — نشتر خانقاہی

دوسری طرف یہ احساس بھی سر اٹھاتا ہے کہ شہری زندگی کے تقاضے بھی اس قدر جان لیوا ہیں کہ ان سے بہت کم لوگ ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں مثلاً یہ شعر۔

تلوار پہ چلنے کا سلیقہ نہیں آیا
سچ ہے کہ اس شہر میں رہنا نہیں آیا — فاروق شفق

دوسری طرف بعض شاعروں نے شہر کے مثبت پہلوؤں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور اسے مہذب زندگی کا لازمی پہلو قرار دیا ہے۔ ان کے لیے شہر فکر و عمل، تہذیب اور شائستگی کا گہوارہ ہے۔ مثلاً عنوان چشتی کے یہ شعر۔

جنگل کی فضائیں بھی دل آویز ہیں لیکن
جنگل کے لیے شہر کو چھوڑا نہیں جاتا — عنوان چشتی

☆وجود کا سناٹا

سمندر اور دریا بھی حالیہ غزل میں وسیع تر معنویت کے ساتھ مستعمل ہوئے ہیں اور کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ سمندر جو کہیں وسعت اور بیکرانی کا استعارہ ہے کہیں خطرات اور وجودی دہشت کا، کہیں معنی خیز تنہائی کا اور کہیں اثبات ذات کا، عصری غزل گو شعراء کا ایک محبوب شعری پیکر ہے۔ پہلے یہ اشعار جن میں سمندر وجودی دہشت سے منسلک ہے۔

ہوا ہے تیز سمندر بپھرنے والا ہے
بلائے جاں ہے جو لمحہ گزرنے والا ہے
شب سیہ کے مسافر کو الوداع کہو
سمندروں میں سفینہ اترنے والا ہے عنوان چشتی

اور یہ تجربہ وجود کی اتھاہ گہرائیوں کے سفر سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ شعر جہاں سمندر خطرات اور غیر یقینی کیفیت کا اشاریہ ہے۔

تیرا خیال تھا لپٹا ہوا دھندلکوں میں
سمندروں کا سفر تھا ہوا برہنہ تھی مظہر امام

کتنے دریاؤں سے گزر آئے
اب سمندر بھی آزمانے دے پرکاش فکری

ہے موج موج میں پیچاں مری انا کا ثبات
کہ بحر غم نے اچھالا ہے بار بار مجھے زاہدہ زیدی

شرط گر یہ ہے سمندر تیری
کشتیاں اپنی ڈبو دیتا ہوں شہریار

اپنی تنہائی سے ڈرتا ہے سمندر جیسے
سر پٹکتا ہے کناروں کو صدا دیتا ہے پرکاش فکری

اور اب آخر میں کچھ اور شعر پیش کرتی ہوں جن میں فطرت کے دوسرے مظاہر مثلاً دریا، صحرا، بادل، زمیں وغیرہ کو وسیع تر معنویت کیساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

سطح پر اک جمود طاری ہے
زیر دریا روانیاں کیا کیا وامق جونپوری

نئی بارش کا پانی چاہتا ہوں
میں دریا ہوں روانی چاہتا ہوں اکبر حمیدی

وقت کے ٹھہراؤ میں کیوں ڈھونڈتے ہو تم مجھے
اضطراب موج دریا میں رقصاں مری ذات — اندر سروپ دت ناداں

صحرا میں دور تک بھی کوئی نقش پا نہ تھا
میرے سوا سفر میں کوئی دوسرا نہ تھا — عفت ذریں

موسم کا یوں مذاق اڑاتی رہی ہوا
بادل کو انگلیوں پہ نچاتی رہی ہوا — ہوش نعمانی

خلا کی اندھی گپھاؤں میں مت اچھال مجھے
زمیں حصار کشش سے نہ تو نکال مجھے — زبیر رضوی

زمیں کا لمس مل جائے تو اتروں
ابھی تو پاؤں کے نیچے خلا ہے — پرتپال سنگھ بیتاب

☆موت کی حقیقت

''عشق'' کی طرح ''موت'' کا تصور بھی زمانے قدیم ہی سے تقریباً ہر ترقی یافتہ زبان کے ادب میں شاعری کا ایک محبوب موضوع اور عظیم شاعری کا سر چشمہ رہا ہے اور اردو غزل میں کلاسکی دور سے لیکر عہد حاضر تک اس کی ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں لیکن یہ بات بھی کسی قدر قابل افسوس ہے کہ حالیہ برسوں کی غزل میں اس قسم کے اشعار کم ہی نظر آئے جن کا مرکزی خیال موت کا تصور احساس یا اس کا یا غیر ذاتی قسم کا تجربہ ہو۔ پھر بھی اس موضوع پر کچھ معنی خیز یا اثر انگیز اشعار جو اس دور کی غزل میں میری نظر سے گزرے وہ پیش کرتی ہوں۔

گروں گا پیڑ سے اک دن کہ برگ خشک ہوں میں
ذرا سی بات تھی لیکن سمجھ میں آ نہ سکی — اہتشام اختر

اور کمار پاشی کے یہ دو اشعار جن میں موت کی آہٹیں سنائیں دے رہی ہیں اور جوان کی بے وقت موت کے بعد شائع ہوئے۔

کھلا ہے عمر کی شامِ حزیں میں راز یہ پاشی
کہ ہر دم موت کو بھی ساتھ رکھتی ہے حیات اپنے — کمار پاشی

رک جا پاشی اس رستے سے
کوئی دوبارہ نہیں گیا ہے — کمار پاشی

یہ کیا عجب ہے کہ وہ بحر نیتی میں گری
نفس کی موج میں مستی بھی تھی ، روانی تھی — زاہدزیدی

کچھ اور شانۂ ہستی ابھی سنوار مجھ
عروس مرگ سے ہونا ہے ہمکنار مجھے — زاہدزیدی

نہ جانے شاخ معلق سے کب گروں کٹ کر — پھر اس کے بعد تو میں ہونگا اور ہوا ہوگی
نہ تشنگی کا عذاب آسماں سے اترے گا — نہ ریگ دشت سرابوں سے آشنا ہوگی
نہ سنگ راہ کوئی مانع سفر ہوگا — نہ روکتی ہوئی مجھ کو کوئی صدا ہوگی
بھڑکتی دھوپ کے شعلے نہ چھو سکیں مجھے — نہ چھاؤں میرے لیے زیب جاں فزا ہوگی

زیب غوری

ڈبو کر خون میں لفظوں کو انگارے بناتا ہوں
پھر انگاروں کو پگھلا کر غزل پارے بناتا ہوں — مظفرحنفی

پاؤں لفظوں کی زمیں پر نہیں ٹکنے پاتے
تندی سیل معنی میں بہا جاتا ہوں — مخمورسعیدی

شعور و فکر سے آگے ہے چشمہ تخلیق
ہٹے گا سنگ تو بہنے لگے گا پانی بھی — زاہدہ زیدی

فکر سخن میں گم ہیں پہاڑوں کے سلسلے
یہ آبشار ان سے اترتا ہوا کلام — اسعدبدایونی

خدا ہمارا سا اسلوب بھی کسی کو نہ دے
خیال بہ گیا زور بیاں کے دھارے میں — شجاع خاور

اشعار میں جو بات خاص طور سے توجہ طلب ہے وہ یہ کہ گو یہ کئی اعتبار سے ایک دوسرے سے

مختلف ہیں لیکن ان سب میں تخلیق شعر کے لیے سیل، چشمہ، آبشار اور دھارے کے شعری پیکر استعال کیے گئے ہیں جن میں تندی، تیزی، روانی اور ایک بے ساختہ قوت کے تصورات پنہاں ہیں اور جو اپنی کیفیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی قریب ہیں۔

ہر چند حقیقتیں وہی ہیں
انداز نظر بدل گیا ہے
کچھ فن کے تقاضے اور ہیں اب
اسلوب ہنر بدل گیا ہے
کمال احمد صدیقی

غرض یہ کہ جدید غزل کے شعراء کے یہاں آج کی حقیقتیں بھی بڑی تیزی سے بدل رہی ہیں اور آج کے غزل گو شعراء ان برق رفتار تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے اور انہیں فن کی گرفت میں لانے کی بھی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ غزل ہی وہ واحد صنف سخن ہے جس میں زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو پھر وہ چاہے سماجی ہو سیاسی ہو معاشی ہو یا تہذیبی ہو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور ان کا بر ملا اظہار بھی غزل میں بہترین طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے مزید کئی مضوعات ہو سکتے ہیں جو جدید غزل گو شعراء کے پسندیدہ موضوع رہے ہیں لیکن مقالے کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس فہرست کو یہاں زیادہ طول دینا مناسب نہیں۔ بطور نمونہ کچھ موضوعات یہاں بیان کئے جا چکے ہیں۔

غزل ہماری شاعری کی سب سے زیادہ مشہور اور مقبول صنف سخن ہے۔قبول خاطر لطف سخن میں اردو و شاعری ی کی کوئی دوسری صنف اسکا مقابلہ نہیں کرسکتی۔شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا آغاز ولی کی غزلوں سے ہوااور آج تک بقول پروفیسر رشید احمد صدقی ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے ''۔اور فراق کے الفاظ میں مستقبل کا شاعر غزل کے ساز پر غزل خواں ہوگا۔آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ادب وشعر کی تاریخ میں غزل کا یہ تصرف وتسلط حیران کن ہے مگر بے سبب نہیں، پروفیسر آل حمد سرور نے لکھا ہے ''غزل گوئی اچھی ہو یا بری ہماری تہذیب کی ایک روایت ہے''۔ہماری تہذیب سے اسی تعلق اور توسل نے غزل کو ہماری شاعری ایک جزو اہم بلکہ جزو اعظم بنا دیا۔

اردو غزل میں گذشتہ دو ڈھائی سو سالوں میں ہماری زندگی کا قافلہ جن راہوں سے بھی گزرا ہے ہماری تہذیب جن منزلوں سے بھی روشناس ہوئی ہے اسکی سچی اور صحیح تصویر ملتی ہے۔اس عرصہ میں ہم نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے جو کچھ بھی سوچا ہے ج وتصورات بھی قائم کیے ہیں جن نظریات کی بھی تشکیل کی ہے ان سب کی آئینہ داری جیسی غزل نے کی ہے شاید ہی کسی اور صنف سخن نے کی ہو یہ صحیح ہیکہ اس میں جزئیات وتفصیلات کی گنجائش نہیں لیکن اجمال واختصار کے ساتھ اشاروں اور کنایوں میں جیسا کچھ اور جتنا کچھ اس میں آ گیا ہے اسکا کوئی دوسری صنف سخن تصور بھی نہیں کرسکتی۔

اصولاً تو غزل ریزہ خیالی اور انتشار فکر کی علامت ہے لیکن اگر غزل کے فارم کی گہرائی و گیرائی پر غور کریں تو ہمیں صنف غزل کی تاثیر میں ایک ہمہ رنگی ملتی ہے۔صنف غزل میں تاثیر کی اس ہمہ رنگی کا انحصار جس قدر اس کے مواد اور موضوع پر ہے اسی قدر اس کی ہیئت وصورت پر بھی ہے بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ غزل میں مواد اور ہیئت موضوع اور صورت کی ایک متناسب اور متوازن ہم آہنگی ہی کہ ہاتھوں تاثیر کی ہمہ گیری کا وجود ہوتا ہے۔

غزل کی عظمت اور اس کے حسن کا راز تو اسمیں ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال کر اور ایک ایسے رنگ میں رنگ کر پیش کرتی ہے اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صنف غزل کی مقبولیت کا راز اس کے موضوعات سے زیادہ اس کے جمالیاتی پہلوؤں میں ہے۔یہ جمالیاتی پہلو اسکے رنگ اور اس کے آہنگ دونوں میں پیوست ہیں۔اس کی نغمگی و موسیقی بھی اس کے حسن میں اضافہ کرتی ہے اور اس کی رمزیت وایمائیت میں اس کی موسیقیت خیال اور دل آویزی کو بڑھاتی ہے۔بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہے کہ ان تمام عناصر کی ایک

لطیف آمیزش کا نام غزل ہے اوراس میں اسکوقبول خاطر ولطف سخن بخشتا ہے۔غزل کی یہ مقبولیت و محبوبیت اوراس کے فارم کا لوچ اور لچک اس کی بہت سی کمزوریوں کے باعث بنا ہے۔غزل پر ایسے بھی دورآتے ہیں جبکہ اس کی روشنی طباع اس کے لیے بنا بن گئی ہے اوراس کی داخلی وسعت کا خیال ترک کر کے اوراسکے صحیح مفہوم ومعنی سے صرف نظر کر کے،اس کے حدود کوسنگلاخ زمینوں کے ذریعے محدود کر دیا ہے اس سے زیادہ یہ ہے کہ کچھ بندھے ٹکے خیالات اور کچھ خاص مضامین وموضوعات، ردیف وقافیہ،اور بحروزن کے عائدکردہ پابندیوں کی روشنی میں بند کیا جانے لگا اور بار بار بلکہ ہزار بار کہی ہوئی بات کو پھر کسی بدلے ہوئے انداز یالب ولہجہ میں کہہ دیا جانا ہی کافی سمجھا جانے لگا اوراس میں مضمون بندی معنی وآفرینی اور نازک خیالی پر اس قدر زور دیا گیا کہ شاعر کی بات ایک الجھا ہوا ریشم ہوگئی۔شعر میں تجربے کی صحت اور جذبہ کی صداقت سے زیادہ خیال کی غیر فطری بلندی اور طرز ادا کی پیچیدگی کا خیال رکھا گیا۔یا پھر غزل میں عشق اور معاملات کا بیان اس قدر برانگیختہ طریقے پر ہوا کہ اسے غزل گوئی سے زیادہ ''چوماچاٹی'' کہنا مناسب تھا۔پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے''خارجیت'' کے معنی زلف ورخسار کنگی چوٹی رہ گئے مختصر غزلیں جو بے ساختہ اور بھرپور ہوتی تھیں دوغزلوں سہ غزلوں کی قافیہ پیمائی میں بدل گئیں۔سنگلاخ زمینیں ذہن کو مقید کرنے والی ردیفیں سستا مذاق اور بد اخلاق مضامین یا محاورے کی چاشنی یہ غزلوں کے کائنات بن گئے۔

یہی وہ صورت حال تھی جس نے غزل کے خلاف نئے زمانے کے شعراء اور ادباء میں احساس ردعمل پیدا کیا۔غزل پر اعتراضات کا سلسلہ حالؔی کے وقت سے شروع ہوا،بیسویں صدی میں وحیدالدین سلیم،پروفیسر کلیم الدین احمد وغیرہ نے غزل کی بے ربطی انتشار غیر ہم آہنگی اور میکانیت وغیرہ پر بہت زور دیا۔عظمت اللہ خاں اس معاملے میں بہت کٹر تھے۔ان کے رائے ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف ماردینی چاہیئے مگر نئے دور کے ان تمام حملوں اور ہلوں کے مقابلے میں غزل بڑی سخت جان ثابت ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پھر اس نے اپنا اصلی مقام حاصل کرلیا۔اوراس کی وجہ وہی جس کی طرف شروع میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ غزل ہماری طبیعت اور مزاج میں رچ بس گئی ہے۔

ہمارے کان اردو شاعری میں جس لہجہ جس لئے یا جس نغمے سے زیادہ آشنا ہیں وہ غزل ہے۔آج یہ ہی نہیں کہ غزل نے اپنا کھویا ہوا اعزاز وامتیاز دوبارہ حاصل کرلیا ہے۔بلکہ زندگی کے تقاضوں کے مطابق اس کے دامن میں بھی وسعت آگئی ہے نیا عہد نظم کا عہد ہے لیکن آج بھی غزل کا ایک شعر اپنی معنویت کے لحاظ سے پوری نظم پر بھاری ہوتا ہے اور گنگنانے کی چیز تو صرف غزل ہے۔

جدید شعراء کے یہاں عصری درد و کرب کا اظہار نوک سناں، شام غریباں، مشکیزہ، دست کربلا، سیاہ شام، نیزہ پہ آفتاب کا سر، لشکر اور خیمے وغیرہ کی علامت کے ذریعے ہوا جس نے نئی غزل میں ایک سسکتی ہوئی کیفیت پیدا کر دی۔

انیسویں صدی کا آغاز ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم باب ہے جس نے ذہنوں کو نئی روشنی سے متعارف کرایا جس کے نتیجے میں شعراء کے شانہ بہ شانہ شاعرات کی تخلیقات بھی ادبی افق پر نظر آنے لگیں۔ گو کہ اس کا آغاز تقلیدی رنگ لیے ہوے تھا مگر آہستہ آہستہ شاعرات میں اس رویے کو ترک کر کے اپنی الگ الگ روش اختیار کی۔ ضروریات زندگی تحت ان کے فکر کے دھارے بھی اپنا رخ موڑ کر نسوانی وجود کی شناخت کی جانب بہنے لگے۔ عورت نے نہ صرف عورت بن کر جینے کا گر سیکھا بلکہ اپنے حق کے لیے جدو جہد بھی شروع کر دی۔ اس کوشش نے شاعرانہ سطح پر ایک نئی جہت کا اضافہ کیا لطف کی بات یہ ہے کہ یہ جہت صرف موضوعاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ علامتی سطح پر بھی سامنے آئی۔ جس کی بہترین مثالیں ہمیں کشور ناہید کی شاعری میں ملتی ہیں۔

جدید شاعرات کا لہجہ بغاوت کی بنیادوں پر استوار ہے۔ یہ عورت زندگی کے گرد و پیش کو مرد کی نظر سے نہیں بلکہ خود اپنے نظر سے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا اپنا ایک منفرد انداز نظر ہے۔ اس کے روشن و تاریک پہلوؤں کو جاننے سمجھنے کی جستجو ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ آگہی شکلوں کو مسخ کر دے گی۔ دنیا کو جاننے اور پرکھنے کی خواہش دراصل ایک باغی ذہن کی ترجمانی کرتی ہے۔ جو صدیوں سے سسکتے نسوانی وجود کو ایک پائیدار و جاندار پیکر اور حوصلہ عطا کرنا چاہتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں حالات سے گھبرا کر فرار حاصل کرنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

جدید عورت کو اپنے وجود کی اہمیت کا احساس ہے اب وہ زندگی کے مرحلے طئے کرنے کے لیے مرد کے سہارے کی ضرورت کو اس طرح محسوس نہیں کرتی۔ جس طرح اس سے پہلے زمانے کی عورتیں کرتی آئی ہیں۔ مرد کی طرح عورت کے یہاں بھی اس کی شناخت کا مسئلہ اور خواہش درپیش ہے۔ انا اور خودداری اس عورت کی سرشت میں شامل ہیں۔ اپنی شناخت اور خودداری کا احساس جدید نسائی غزلوں میں مختلف انداز میں ہوا ہے۔

میں نظر آؤں ہر ایک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

جذبۂ عشق کی فراخ دلی
تو جھکا تھا تو جھک گئی میں بھی — شاہدہ حسن

وہ مرے پاؤں چھونے کو جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دے دیتی امیر اتنی تھی — پروین شاکر

میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
اس کو چاہوں تو خود اپنی خبر چاہوں — کشور ناہید

جدید غزل میں صرف اداسی، سوگواری، مایوسی اور تنہائی کی مسلسل تکرار ہے جس میں زندگی کے تئیں کسی مثبت رویے کی امید شاذ و نادر ہی کی جاسکتی ہے مگر ادب کبھی ساکت نہیں رہتا اگر ایسا ہوتا تو جمود کی کیفیت اس کے خاتمے کا اعلان نامہ بن جاتی۔ ۸۰ء کے آس پاس کی غزل میں پھر سے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کا احساس ہونے لگا ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ۶۰ء سے ۸۰ء تک کا دور ایک عبوری دور تھا جہاں اقدار کی شکست و ریخت کا سلسلہ تیزی سے جاری تھا گویا یہ قدیم و جدید کے تصادم اور نئی اقدار کے پنپنے کا زمانہ تھا جہاں نئے سانچے جنم لے رہے تھے کیوں کہ ہر تہذیب کسی تعمیر کی آمد کا پیش خیمہ ہوتی ہے مگر عصری ذہن ان نئی تبدیلیوں کو آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ اس لئے قدیم معیاروں کی شکستگی نے حساس ذہنوں کو ایک عرصے متاثر رکھا مگر اب آہستہ آہستہ حالات اپنے معمول پر آرہے ہیں۔ نئی غزل میں مثبت رجحان دھیرے دھیرے اپنے لیے جگہ بنا رہا ہے۔

جدید غزل میں دبتا ہوا ہی سہی اثباتی پہلو بھی نظر آتا ہے مگر یہ رجحان مایوسی اور امید کا امتزاج بن کر ابھرتا ہے۔ زندگی جہاں ایک جانب اضطراب، بے چینی، بے یقینی، خود اذیتی اور تنہائی کا نام ہے وہیں آج کی غزل میں ان حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ہے۔ امید اور اعتماد کی وہ کرن بھی جو جدید غزل کو قنوطیت کا شکار ہونے سے بچاتی ہے۔ زندگی کے معمولی واقعات، سرسری باتوں اور احساسات کو ایک خوشگوار کیفیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ اشعار بحیثیت مجموعی سماج کی منفی کی کیفیتوں کے ساتھ ان مثبت احساسات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں جو تیز رفتار زندگی میں مسرت کے چند لمحات سے سرشار ہیں اور جنھیں نئے شعری مزاج کی علامت کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے مثلاً

کل رات گل فروش کو چلمن کی اوٹ سے
کوئی پکارتا تھا کہ تم یاد آ گئے

جدید غزل میں احساس تنہائی تو ہے مگر یہ تنہائی نوحہ خوانی نہیں بلکہ خوابوں کا سرچشمہ ہے۔ وہ خواب ہماری زندگیوں کا ایک لازمی جز ہیں۔ جدید شاعر نہ صرف خواب دیکھتا ہے بلکہ ان خوابوں کو دوسروں تک پہنچاتا بھی ہے۔

خوابوں کو دیکھنے اور دکھانے والی بات یوں بھی درست ہے کہ ہر حقیقت پہلے انسان کے تصور میں جنم لیتی ہے۔ کرہ ارض کی تاریخ اس بات کی گواہ ہیکہ انسان نے پہلے خواب دیکھے اور پھر ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کی جدوجہد کی۔ لہذا جو لوگ خوابوں کو بے عملی کا الزام دیتے ہیں وہ اپنے عہد کی حقیقتوں سے روگردانی کرتے ہیں۔ جدید غزل میں خوابناک سلسلہ اس طرح سے نہیں مگر مستقبل میں ہونے والی شاعری کی دھندلی پرچھائیاں آج کی غزل میں تلاش کی جا سکتی ہے جن میں مروجہ علامتوں کے ذریعے نئی شعری فضاء کی تشکیل کی گئی ہے جس میں زندگی کی تڑپ امید فردا کی کرنیں، ترقی کی خواہش، چند خوشگوار لمحوں کا لمس سبھی کچھ شامل ہے۔

بدن پہ طاری تھا خوف گہرے سمندروں کا
رگوں میں شوق شناوری بھی مچل رہا تھا — شبیر شاہد

آندھی کو اپنی شاخ میں روکے کھڑے رہے
یوں احتجاج کچھ نئے اشجار کر گئے — باقر مہدی

اس طرح کی بہت سی مثالیں نئی شاعری میں پیش کی جا سکتی ہیں اس جدید ترین انسان نے ایک بار پھر یقین اور اعتماد کا مضبوط سہارا تلاش کر لیا ہے اب اسکا سفر راندھے راستوں پر بھٹکنے کا نہیں گہرے پانیوں کی سطح پر تیرنے کا ہے۔ جس میں ساحل تک پہنچنے کی خواہش سمندروں کی گہرائی پر غالب آ جاتی ہے۔ وقت کی آندھی میں جڑیں پھر اسی زمین میں پیوست کر رہا ہے۔ جہاں سے اس کے قدم پچھلی آندھیوں میں اکھڑ گئے تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ نئے سماجی تناظر میں غزل کے بدلتے ہوئے مزاج اور اس کے ساتھ ہی بدلتے علائم کا دور ہے جو اپنی گونا گوں کیفیت کے ساتھ اردو ادب میں غزل کے وقار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ پچھلی تین دہائیوں میں ہونے والی تبدیلیاں سراسر منفی نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے

کچھ روشن پہلو بھی ہیں جو نقاد کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ زبان واسلوب میں نئے پن کی چاشنی ہے مگر کہیں کہیں الفاظ کے استعمال میں احتیاط نہیں برتی گئی شاید اس لئے کہ اب موضوع فن سے زیادہ اہم ہے پہلے شاعر اپنا کلام عوام تک پہنچانے سے قبل اس کی نوک پلک درست کیا کرتے تھے آج مصرف زندگی کے تقاضے فنکار کی راہ میں حائل ہیں اس لئے کبھی کبھی اشعار بے کیفی پیدا کرتے ہیں ۔شخصی علامتیں اکثر قاری کی سمجھ میں نہ آتیں تو اس کے لیے بے لطف ہو جاتی ہیں مگر ایسی مثالیں اب کم ہی ملتی ہیں۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اپنے اس مطالعے کے دوران تحقیق کار اس نتیجے پر پہو نچتا ہے کہ عصر حاضر کی غزل نے محبوب کا دامن سرے سے چھوڑا تو نہیں ہے نا ہی اس کا شاعر مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ کہتا ہے اور نا ہی اپنے محبوب کے آنچل کو پرچم بنانے کا مشورہ دیتا ہے۔ آج کی غزل میں زندگی کے سماجی و سیاسی اسباق کی آمیزش اس قدر موثر اور متاثر کن ہے کہ اردو غزل کے روبرو کسی اور شعری صنف کا پھلنا پھولنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

مختصراً جدید غزل ایک طویل رہ گزر طئے کرنے کے بعد اب پرفضا مقامات کی جانب رواں دواں ہے جس کے نشانات ہوا کے خوشگوار جھونکوں کی طرح مل جاتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ اردو غزل — یوسف حسین خان

۲۔ اردو غزل کے پچاس سال — عبدالاحد خلیل

۳۔ ہماری شاعری — مسعود حسن رضوی

۴۔ جدید غزل — رشید احمد صدیقی

۵۔ کاشف الحقائق — امام اثر

۶۔ مقدمہ شعروشاعری — الطاف حسین حالی

۷۔ غزل کی سرگزشت — اختر انصاری

۸۔ تاریخ اردوادب حصہ اول — جمیل جالبی

۹۔ اردو میں شعری رجحانات — ڈاکٹر منیرالزماں

۱۰۔ شعرالہند حصہ دوم — مولانا عبدالسلام ندوی

۱۱۔ اردو شاعری کا مزاج — ڈاکٹر وزیر آغا

۱۲۔ شعراردو غزل — فراغ گورکھپوری

۱۳۔ نکات مجنوں — فراغ گورکھپوری

۱۴۔ مسرت سے بصیرت تک — آل احمد سرور

۱۵۔ اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل — ڈاکٹر ممتاز الحق

۱۶۔ اردو غزل میں علامت نگاری — انیس اشفاق

۱۷۔ غزل کے جدید رجحانات — ڈاکٹر خالد علوی

۱۸۔ جدید غزل کی علامتیں — ڈاکٹر نجمہ رحمانی

۱۹۔ معاسر اردو غزل — پروفیسر قمر رئیس

۲۰۔ اردو غزل — ڈاکٹر کامل قریشی

۲۱۔ آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ — بشیر بدر

۲۲۔ روح ادب — مظفر حنفی

۲۳۔ غزل اور درس غزل — اختر انصاری

۲۴۔ غزل کا اہم موڑ — بشیر بدر

۲۵۔ غزل اور مطالعہ غزل — عبادت بریلوی

۲۶۔ اردو شاعری کا فنی ارتقا — ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۷۔ تاریخ اردو ادب — رام بابو سکینہ

۲۸۔ نقد شعر و ادب — پروفیسر محسن عثمانی

۲۹۔ نئے تنقیدی مسائل اور امکانات — کرامت علی کرامت

۳۰۔ تاریخ ادب اردو — پروفیسر نور الحسن نقوی

۳۱۔ اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی

۳۲۔ بیسوی صدی کی اردو شاعری — اوصاف احمد

۳۳۔ اردو غزل اور ہندوستنی ذہن و تہذیب — گوپی چند نارنگ

۳۴۔ جدید غزل — ڈاکٹر عفت ذرین

۳۵۔ اردو غزل کی تنقید — ڈاکٹر شاہدہ بیگم

۳۶۔ اردو ادب کی تاریخ — سلیم اختر

۳۷۔ ضرب کلیم	علامہ اقبال
۳۸۔ رتجگے	اقبال اشہر
۳۹۔ اردو شاعری کا انتخاب	خورشید عالم
۴۰۔ تلخیاں	ساحر لدھیانوی
۴۱۔ غزل کا عبوری دور	ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
۴۲۔ غزل کا نیا منظر نامہ	شمیم حنفی
۴۳۔ جدید شاعری کے نئے چراغ	شکیل احمد
۴۴۔ اردو غزل کیب اہم موڑ	شمس الرحمٰن فاروقی
۴۵۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل	پروفیسر عنوان چشتی
۴۶۔ جدید غزل کا ایک مطالعہ	نظیر صدیقی
۴۷۔ دور حاضر اور اردو غزل گوئی	عندلیب شادانی
۴۸۔ اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد
۴۹۔ اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ	گوپی چند نارنگ
۵۰۔ شاعر کی تنقید	ابوالکلام قاسمی
۵۱۔ برف	عزم شاکری
۵۲۔ چھاؤں سحرا کی	مہتاب قدر
۵۳۔ مٹی میں آسمان	شکیل اعظمی
۵۴۔ آب رواں	احسن یوسف زئی
۵۵۔ نوائے حرف خموش	ظفر کلیم

۵۶۔ وابستہ — سلیم محی الدین
۵۷۔ اردو غزل مختلف دور میں — پروفیسر عزیز اندوری
۵۸۔ کاروان غزل — فاروق ارگلی
۵۹۔ برسوں بعد — حسیب نور
۶۰۔ کاروان غزل — فاروق ارگلی
۶۱۔ کٹورے میں چاند — شکیل جمالی
۶۲۔ یعنی — جون ایلیا

رسائل

۱۔ نگار
۲۔ آج کل
۳۔ تعمیر ہریانہ
۴۔ شاعر جلد
۵۔ ایوان اردو
۶۔ شاعر
۷۔ نیا دور
۸۔ شب وخون نمبر
۹۔ اردو دنیا
۱۰۔ فکر و تحقیق

☆☆☆☆